چوگان ہستی

منشی پریم چند

چوگان ہستی

1

شہر امیروں کے رہنے اور خرید و فروخت کرنے کی جگہ ہے اور دامن شہر ان کے سیر و تفریح کا مقام۔ وسط شہر میں ان کے لڑکوں کے مدرسے اور ان کی مقدمہ بازیوں کے وہ اکھاڑے ہوتے ہیں، جہاں انصاف کے بہانے غریبوں کا گلا گھونٹا جاتا ہے۔ شہر کے آس پاس غریبوں کی بستیاں ہوتی ہیں۔ بنارس میں پانڈے پور اسی قسم کی آبادی ہے۔ وہاں نہ شہر کے لیمپوں کی شعاعیں پہنچتی ہیں نہ شہری چھڑکاؤ کی چھینٹیں اور نہ آب رسانی کے نلوں کی روانیاں لب سڑک چند چھوٹے چھوٹے بنیوں اور حلوائیوں کی دکانیں ہیں جن کے عقب میں کئی یکہ بان، گاڑی والے، گویے اور مزدور رہتے ہیں۔ دو چار گھر بگڑے ہوئے سفید پوشوں کے بھی ہیں جن کی خستہ حالی نے انہیں شہر سے خارج کر دیا ہے۔ یہیں ایک غریب اندھا چمار بھی رہتا ہے، جسے لوگ سور داس کہتے ہیں۔ ہندوستان میں اندھے آدمیوں کے لیے نہ نام کی ضرورت ہوتی ہے نہ کام کی۔ سورداس ان کا بنا بنایا نام ہے اور بھیک مانگنا ان کا بنا بنایا کام۔ ان کے اوصاف و عادات بھی مشہور زمانہ ہیں۔ گانے بجانے سے ایک خاص دلچسپی، دل میں ایک خاص محبت، روحانیت اور بھگتی سے ایک خاص رغبت ان کی فطرتی اطوار ہیں۔ نگاہ ظاہر بند اور نگاہ باطن کھلی ہوئی۔

سورداس ایک نہایت نحیف و ناتواں اور سادہ مزاج شخص تھا، جسے شاید قدرت نے بھیک مانگنے ہی کے لیے بنایا تھا۔ وہ ہر روز لاٹھی ٹیکتا ہوا پکی سڑک پر آبیٹھتا اور راہ گیروں کی جان کی خیر مناتا "داتا بھگوان تمہارا کلیان کریں" یہی اس کی صدا تھی اور اسی کو وہ بار بار دہراتا تھا۔ شاید وہ اسے مسافروں کے **تالیف قلوب** منتر سمجھتا تھا پیادہ مسافروں کو وہ اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے دعائیں دیتا تھا۔ لیکن جب کوئی یکہ گزرتا تو وہ اس کے پیچھے دوڑنے لگتا اور بگھیوں کے ساتھ تو گویا اس کے پیروں میں پر لگ جاتے تھے، لیکن موٹروں کو وہ اپنے نیک ارادوں کے پرے سمجھتا تھا۔ تجربہ نے اس کو بتلا دیا تھا کہ ہوا گاڑیاں کسی کی

باتیں نہیں سنتیں۔ صبح سے شام تک اس کا تمام وقت دعائے خیر ہی میں گزرتا تھا۔ یہاں تک کہ ماگھ پوس کے ابروباد اور بیساکھ جیٹھ کی سوزوتپش میں بھی ناغہ نہ ہوتا تھا۔

کاتک کا مہینہ تھا۔ ہوا میں خوش گوار خنکی آ گئی تھی۔ شام کا وقت تھا۔ سورداس اپنی جگہ پر بت کی طرح بیٹھا ہوا کسی یکہ یا بگھی کی صدائے خوش آیند پر کان لگائے ہوئے تھا۔ سڑک پر دورویہ درختوں کی قطاریں تھیں۔ ان کے نیچے گاڑی بانوں نے گاڑیاں ٹھہرا دیں اور بیل کھول دیئے۔ پچھائیں بیل ٹاٹ کے ٹکڑوں پر کھلی اور بھوسہ کھانے لگے۔ گاڑی بانوں نے بھی اپلے جلا دیے۔ کوئی چادر پر آٹا گوندھتا تھا۔ کوئی گول باٹیاں بنا کر اوپلوں پر سینکتا تھا۔ کسی کو برتنوں کی ضرورت نہ تھی۔ سالن کے لیے گھوئیوں کا بھرتہ کافی تھا اور اس بے سروسامانی پر بھی انہیں کوئی فکر نہ تھی۔ بیٹھے ہوئے باٹیاں سینکتے اور گاتے جاتے تھے۔ بیلوں کے گلے کی گھنٹیاں ساز کا کام دے رہی تھیں۔ گنیش گاڑی بان نے سورداس سے پوچھا ''کیوں بھگت! بیاہ کرو گے؟''

سورداس نے گردن ہلا کر کہا ''کہیں ہے ڈول؟''

گنیش: ''ہاں ہے کیوں نہیں؟ ایک گاؤں میں ایک سوریا ہے۔ تمہاری ہی جات برادری کی ہے۔ کہو تو بات چیت پکی کروں۔ تمہاری بارات میں مزہ سے دو دن باٹیاں لگیں۔''

سورداس: کوئی ایسی جگہ بتائی جہاں دھن ملے اور اس بھیک منگائی سے پیچھا چھوٹے۔ ابھی اپنے ہی پیٹ کی فکر ہے۔ تب ایک اندھی کی اور فکر ہو جائے گی۔ ایسی بیڑی پیر میں نہیں ڈالتا۔ بیڑی ہی ہے تو سونے کی تو ہو!

گنیش: لاکھ روپے کی مہریا نہ پا جاؤ گے۔ رات کو تمہارے پاؤں دبانے گی، سر میں تیل ڈالے گی، ایک بار پھر جوان ہو جاؤ گے۔ یہ ہڈیاں نہ دکھائی دیں گی۔

سورداس: تو روٹیوں کا سہارا بھی جاتا رہے گا۔ یہ ہڈیاں دیکھ کر ہی تو لوگوں کو دیا آتی ہے۔ موٹے آدمیوں کو بھیک کون دیتا ہے، الٹا اور طعنے ملتے ہیں۔

گنیش: اجی نہیں، وہ تمہاری سیوا بھی کرے گی اور تمہیں بھوجن بھی دے گی۔ بچن ساہ کے یہاں تلہن جھاڑے گی تو چار آنے روز پائے گی۔

سورداس: تب تو اور بھی درگت ہوگی۔ گھر والی کی کمائی کھا کر کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہ رہوں گا۔

دفعتاً ایک فٹن آتی ہوئی سنائی دی۔ سورداس لاٹھی ٹیک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ یہی اس کی کمائی کا وقت تھا۔ اسی وقت شہر کے رئیس اور مہاجن ہوا خوری کو آتے تھے۔ فٹن جوں ہی سامنے آئی، سورداس اس کے پیچھے "داتا بھگوان تمہارا کلیان کرے" کہتا ہوا دوڑا۔

فٹن میں جائے صدر پر مسٹر جان سیوک اور ان کی اہلیہ مسز جان سیوک بیٹھی ہوئی تھیں۔ مقابل میں ان کا جوان لڑکا پربھوسیوک اور اس کی چھوٹی بہن مس صوفیہ سیوک تھی۔ جان سیوک دوہرے بدن کے گورے چٹے آدمی تھے۔ بڑھاپے میں بھی چہرہ سرخ تھا۔ سر اور ڈاڑھی کے بال کھچڑی ہو گئے تھے۔ وضع انگریزی تھی جو ان پر خوب موزوں تھی۔ چہرہ پر غرور اور خودداری کا رنگ جھلکتا تھا۔ مسز سیوک کو وقت کے ہاتھوں نے زیادہ ستایا تھا۔ چہرہ پر جھریاں پڑ گئی تھیں اور اس سے ان کی تنگ دلی کا اظہار ہوتا تھا، جس کو سنہری عینک بھی نہ چھپا سکتی تھی۔ پربھوسیوک کی مسیں بھیگ رہی تھیں۔ چھریرا اور اکہرا بدن، زرد رو آنکھوں پر عینک اور چہرہ پر متانت اور غور و خوض کا گہرا رنگ نظر آتا تھا۔ آنکھوں سے ایک نور ترحم نمودار تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ حسن قدرت سے لطف اٹھا رہا ہے۔ مس صوفیہ بڑی بڑی آنکھوں والی، شرمیلی نازنین تھی۔ نازک اندام اس قدر گویا عناصر کے بجائے پھولوں سے وجود پذیر ہوئی تھی۔ چہرہ ایسا موزوں گویا شرم و انکسار کا مجسمہ تھا۔ وہ سراپا رح تھی۔ مادیت کا کہیں پتہ نہ تھا۔

سورداس فٹن کے پیچھے دوڑتا چلا آتا تھا۔ اتنی دور تک اور تیزی سے کوئی مشاق کھلاڑی بھی نہ دوڑ سکتا تھا۔ مسز سیوک نے ناک سکوڑ کر کہا "اس کم بخت کی چیخ نے تو کانوں کے پردے پھاڑ ڈالے۔ کیا یہ دوڑتا ہی چلا جائے گا؟"

مسٹر جان سیوک بولے ''اس ملک کے سر سے یہ بلا نہ جانے کب جائے گی؟ جس ملک میں بھیک مانگنا بے شرمی میں داخل نہ ہو۔ یہاں تک کہ اونچی سے اونچی ذاتیں بھی اسے کسب معاش کا ذریعہ بنائیں۔ جہاں مہاتماؤں کے گذر بسر کا بھی صرف یہی ایک سہارا ہو، اس ملک کی نجات کے لیے ابھی صدیوں کی مدت درکار ہے''

پربھو سیوک: یہاں یہ رواج زمانہ قدیم سے چلا آتا ہے۔ زمانہ سلف میں راجاؤں کے لڑکے بھی درس گاہوں میں پڑھتے وقت بھیک مانگ کر اپنی نیز اپنے استادوں کی پرورش کرتے تھے۔ علماء وفقرا کے لیے بھی یہ کوئی بے عزتی کی بات نہ تھی۔ مگر وہ لوگ مکروہات دنیا سے الگ ہو کر تلاش حق میں مصروف رہتے تھے۔ اس رواج کو اب بیجا طریقہ پر برتا جا رہا ہے۔ میں نے یہاں تک سنا ہے کہ کتنے ہی برہمن جو زمیندار ہیں، گھر سے خالی ہاتھ مقدمہ بازی کرنے چلتے ہیں۔ دن بھر کبھی لڑکی کے بیاہ کے حیلہ سے، کبھی کسی عزیز کی موت کے بہانے سے بھیک مانگتے ہیں۔ شام کو اناج بیچ کر پیسے کھرے کر لیتے ہیں۔ پیسے جلد روپے بن جاتے ہیں اور بالآخر وہ وکیلوں اور کچہری کے عمالوں کی جیبوں میں چلے جاتے ہیں۔

مسز سیوک: سائیس! اس اندھے سے کہہ دے۔ بھاگ جائے۔ پیسے نہیں ہیں۔

مس صوفیہ: نہیں ماما! پیسے ہوں تو دے دیجیے، بیچارہ نصف میل سے دوڑا چلا آ رہا ہے۔ مایوس ہو جائے گا۔ اس کی آتما کو کتنا دکھ ہو گا۔

مسز سیوک: تو یہاں اس سے کس نے دوڑنے کے لیے کہا تھا؟ اس کے پیروں میں درد ہوتا ہو گا!

صوفیہ: نہیں، اچھی ماما! کچھ دے دیجیے، بیچارہ کتنا ہانپ رہا ہے۔

پربھو سیوک نے جیب سے کیس نکالا، مگر تانبے یا نکل کا کوئی ٹکڑا نہ نکلا اور چاندی کا کوئی سکہ دینے میں ماں کی ناراضگی کا اندیشہ تھا۔ بہن سے بولے ''صوفی! افسوس ہے پیسے نہیں نکلے۔ سائیس! اندھے سے کہہ دو۔ آہستہ آہستہ آگے والے گودام تک چلا جائے،

وہاں شاید پیسے مل جائیں۔''

مگر سورداس کو اتنا صبر کہاں؟ جانتا تھا گودام پر کوئی میرے لیے کھڑا نہ رہے گا۔ کہیں گاڑی آگے بڑھ گئی تو اتنی محنت بیکار ہو جائے گی۔ اس نے گاڑی کا پیچھا نہ چھوڑا اور پورے ایک میل تک دوڑتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ گودام آ گیا اور فٹن رکی۔ سب لوگ اتر پڑے۔ سورداس بھی ایک طرف کھڑا ہو گیا جیسے درختوں کے بیچ میں ٹھٹھ ہانپتے ہانپتے بیدم ہو رہا تھا۔

مسٹر جان سیوک نے یہاں چمڑے کی آڑھت کھول رکھی تھی۔ طاہر علی نامی ایک شخص ان کا ایجنٹ تھا۔ وہ برآمدہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ صاحب کو دیکھتے ہی اس نے اٹھ کر سلام کیا۔

جان سیوک نے پوچھا کہیے خاں صاحب! چمڑے کی آمدنی کیسی ہے؟

طاہر علی: حضور! ابھی جیسی ہونی چاہیے ویسی تو نہیں ہے مگر امید ہے کہ آئندہ اچھی ہو۔

جان سیوک: کچھ دوڑ دھوپ کیجیے۔ ایک ہی جگہ بیٹھے رہنے سے کام نہ چلے گا۔ قرب و جوار کے دیہاتوں میں چکر لگایا کیجیے۔ میرا ارادہ ہے کہ میونسپلٹی کے چیئرمین صاحب سے مل کر یہاں ایک شراب اور تاڑی کی دکان کھلوا دوں۔ اس وقت آس پاس کے چمار یہاں روز آئیں گے اور آپ کو ان سے ربط ضبط پیدا کرنے کا موقع ملے گا۔ آج کل ان چالوں کے بغیر کسی کاروبار کو فروغ نہیں ہو سکتا۔ مجھی کو دیکھیے۔ ایسا شاید ہی کوئی دن جاتا ہوگا کہ میں شہر کے دو چار بڑے آدمیوں سے ملاقات نہ کرتا ہوں۔ دس ہزار کی بھی ایک پالیسی مل گئی تو ہفتوں کی دوا دوش کی محنت ٹھکانے لگ گئی۔

طاہر علی: حضور! مجھے خود فکر ہے۔ سوچتا ہوں کہ کاروبار میں مالک کو چار پیسے کا نفع نہ ہوگا تو وہ اس کام کو کرے گا کیوں؟ مگر حضور نے میری جو تنخواہ مقرر کی ہے، اس میں گزر نہیں ہوتا۔ گھر کے لیے تو بیس روپے کا اناج بھی کافی نہیں ہوتا اور سب ضروریات اس کے علاوہ۔ ابھی کہنے کی ہمت نہیں پڑتی مگر حضور سے نہ کہوں تو کس سے کہوں؟

جان سیوک: کچھ دن کام کیجیے۔ ترقی ہوگی نا۔ کہاں ہے آپ کا حساب کتاب؟

لائیے! دیکھوں۔

یہ کہتے ہوئے مسٹر جان سیوک گودام کے برآمدے میں ایک ٹوٹے ہوئے مونڈھے پر بیٹھ گئے۔ مسز سیوک ایک کرسی پر متمکن ہوئیں۔ طاہر علی نے بہی لا کر سامنے رکھ دی۔ صاحب اس کا معائنہ کرنے لگے۔ دو چار ورق الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد ذرا بگڑ کر بولے ''ابھی آپ کو حساب کتاب رکھنے کا سلیقہ نہیں ہے۔ اس پر آپ فرماتے ہیں کہ ترقی کر دیجیے۔ حساب بالکل آئینہ ہونا چاہیے۔ یہاں تو کچھ پتہ نہیں چلتا کہ آپ نے کتنا مال خریدا اور کتنا روانہ کیا۔ خریدار کو فی کھال ایک آنہ دستوری ملتی ہے۔ وہ کہیں درج نہیں ہے۔''

طاہر علی: کیا اسے بھی درج کروں؟

جان سیوک: کیوں نہیں؟ کیا وہ بھی میری ہی آمدنی نہیں ہے؟

طاہر علی: میں نے سمجھا تھا وہ مجھ خادم کا حق ہے۔

جان سیوک: ہرگز نہیں! میں آپ پر غبن کا مقدمہ دائر کر سکتا ہوں (تیور بدل کر) ملازموں کا حق ہے! خوب! آپ کا حق ہے تنخواہ اس کے سوا آپ کا کوئی حق نہیں ہے۔

طاہر علی: حضور! اب آئندہ ایسی غلطی نہ ہوگی۔

جان سیوک: اب تک اس مد میں آپ نے جو رقم وصول کی ہے، وہ آمدنی میں دکھائیے۔ حساب کتاب کے معاملہ میں میں ذرا بھی رعایت نہیں کرتا۔

طاہر علی: حضور! بہت قلیل رقم ہوگی۔

جان سیوک کچھ مضائقہ نہیں۔ ایک ہی پائی سہی۔ یہ سب آپ کو بھرنے پڑے گی۔ ابھی وہ رقم قلیل ہے۔ کچھ دنوں میں اس کی تعداد سینکڑوں تک پہنچ جائے گی۔ اس رقم سے میں یہاں ایک سنڈے اسکول کھول سکتا ہوں۔ سمجھ گئے۔ میم صاحب کی یہ بڑی زبردست خواہش ہے اچھا چلیے وہ زمین کہاں ہے جس کا آپ نے ذکر کیا تھا؟

گودام کے عقب میں ایک وسیع میدان تھا۔ یہاں قرب و جوار کے مواشی چرنے جایا

کرتے تھے۔ جان سیوک اس زمین کو خرید کر وہاں ایک سگریٹ بنانے کا کارخانہ کھولنا چاہتے تھے۔ انہوں نے پربھوسیوک کو بھی ہنر سیکھنے کے لیے امریکہ بھیجا تھا۔ جان سیوک کے ساتھ پربھوسیوک اور ان کی ماں بھی زمین کو دیکھنے چلے۔ باپ بیٹے نے مل کر اراضہ کی پیائش کی۔ کہاں کارخانہ ہوگا، کہاں گودام، کہاں دفتر، کہاں مینجر کا بنگلہ، کہاں مزدوروں کی بارکیں، کہاں کوئلہ رکھنے کی جگہ اور کہاں سے پانی سے آئے گا وغیرہ کے متعلق باپ بیٹے میں دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ بالآخر مسٹر سیوک نے طاہر علی سے پوچھا "یہ کس کی زمین ہے؟"

طاہر علی: حضور یہ تو ٹھیک نہیں معلوم۔ ابھی چل کر یہاں کسی دے دریافت کرلوں گا۔ شاید نائک رام پنڈا کی ہو۔

جان سیوک: آپ اس سے یہ زمین کتنے میں دلا سکتے ہیں؟

طاہر علی: مجھے تو اس میں بھی شک ہے کہ کیا وہ اسے بیچے گا بھی

جان سیوک: اجی! بیچے گا اس کا باپ! اس کی کیا ہستی ہے؟ روپے کے سترہ آنے دیجیے اور آسمان کے تارے منگوا لیجیے۔ آپ اسے میرے پاس بھیج دیجیے۔ میں خود باتیں کرلوں گا۔

پربھوسیوک: مجھے تو اندیشہ ہے کہ یہاں خام جنس بمشکل مل سکے گی۔ اس طرف تمباکو کی کاشت کم کرتے ہیں۔

جان سیوک: کچا مال پیدا کرنا تمہارا کام ہوگا۔ کاشتکار کو رکھ جو یا گیہوں سے عشق نہیں ہوتا۔ وہ جس چیز میں اپنا فائدہ دیکھے گا، وہی پیدا کرے گا۔ اس کا کچھ اندیشہ نہیں ہے (طاہر علی سے) خاں صاحب! آپ اس پنڈے کو میرے پاس کل ضرور بھیج دیجیے گا۔

طاہر علی: بہت خوب! اس سے کہوں گا

جان سیوک: کہوں گا نہیں، اس کو بھیج دیجیے گا۔ اگر آپ سے اتنا بھی نہ ہوسکا تو میں سمجھوں گا کہ آپ کو معاملہ بندی کا مطلق شعور نہیں۔

مسز سیوک: (انگریزی میں) تمہیں اس جگہ پر کوئی تجربہ کار آدمی رکھنا چاہیے تھا۔

جان سیوک: (انگریزی میں) نہیں میں تجربہ کار آدمی سے ڈرتا ہوں۔ وہ اپنے تجربہ سے اپنا فائدہ سوچتا ہے۔ تمہیں فائدہ نہیں پہنچاتا۔ میں تجربہ کاروں سے کوسوں دور رہتا ہوں۔

اس طرح باتیں کرتے ہوئے چاروں آدمی فٹن کے پاس آئے۔ یہاں صوفیہ کھڑی ہوئی سورداس سے باتیں کر رہی تھی۔ پربھو سیوک کو دیکھتے ہی انگریزی میں بولی "پربھو! یہ اندھا تو کوئی گیانی آدمی معلوم ہوتا ہے۔ پورا فلاسفر ہے۔"

مسز سیوک: تو جہاں جاتی ہے وہیں تجھے کوئی نہ کوئی گیانی آدمی مل جاتا ہے۔ کیوں بے اندھے! تو بھیک کیوں مانگتا ہے؟ کوئی کام کیوں نہیں کرتا؟

صوفیہ: (انگریزی میں) ماما! یہ اندھا بالکل گنوار نہیں ہے۔

سورداس کو صوفیہ سے عزت پانے کے بعد یہ توہین آمیز الفاظ بہت برے معلوم ہوئے۔ اپنی عزت کرنے والوں کے سامنے اپنی ہتک کئی گنا ناقابل برداشت ہو جاتی ہے۔ وہ سر اٹھا کر بولا: "بھگوان نے جنم دیا ہے۔ بھگوان کی چاکری کرتا ہوں۔ کسی دوسرے کی تابعداری اب نہیں ہو سکتی۔"

مسز سیوک: تیرے بھگوان نے تجھے اندھا کیوں بنا دیا؟ اس لیے کہ تو بھیک مانگتا پھرے؟ تیرا بھگوان بڑا بے انصاف ہے

صوفیہ: (انگریزی میں) ماما! آپ اس کی اتنی بے عزتی کر رہی ہیں کہ مجھے شرم آتی ہے۔

سورداس: بھگوان بے انصاف نہیں میرے پہلے جنم کی کمائی ہی ایسی تھی۔ جیسے کرم کیے ہیں ویسا پھل بھوگ رہا ہوں۔ یہ سب بھگوان کی لیلا ہے۔ وہ بڑا کھلاڑی ہے۔ گھروندے بناتا بگاڑتا رہتا ہے۔ اس کو کسی سے عداوت نہیں ہے۔ وہ کیوں بے انصافی کرنے لگا؟

صوفیہ: میں اگر اندھی ہوتی تو خدا کو کبھی معاف نہ کرتی

سورداس: میم صاحب! اپنے پاپ سب کو آپ بھوگنے پڑتے ہیں۔ بھگوان کا اس میں کوئی دوش نہیں۔

صوفیہ: ماما! یہ راز میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر خداوند یسوع نے ہمارے گناہوں کا کفارہ اپنے خون سے کر دیا تو پھر سارے عیسائی ایک ہی حالت میں کیوں نہیں ہیں؟ دیگر مذاہب والوں کی طرح ہماری قوم میں بھی امیر، غریب، اچھے، برے، لنگڑے، لولے سبھی طرح کے لوگ موجود ہیں۔ اس کا کیا سبب ہے؟

مسز سیوک نے ابھی کوئی جواب نہ دیا تھا کہ سورداس بول اٹھا ''میم صاحب! اپنے گناہوں کا کفارہ ہمیں آپ کرنا پڑتا ہے۔ اگر آج معلوم ہو جائے کہ کسی نے ہمارے گناہوں کے بار کو اپنے سر لے لیا تو دنیا میں اندھیرا ہو جائے''

مسز سیوک: صوفی! مجھے سخت افسوس ہے کہ اتنی موٹی سی بات تیری سمجھ میں نہیں آتی۔ حالانکہ ریورنڈ پم نے خود کئی بار تیرے شکوک کا دفعیہ کیا ہے۔

پربھوسیوک: (سورداس سے) تمہارے خیال میں ہم لوگوں کو بیراگی ہو جانا چاہیے؟ کیوں؟

سورداس: ہاں جب تک ہم بیراگی نہ ہوں گے۔ ہم دکھوں سے نہیں بچ سکتے۔

جان سیوک: بدن پر راکھ مل کر بھیک مانگنا خود ہی سب سے بڑا دکھ ہے۔ یہ ہم کو دکھوں سے کیونکر نجات دلا سکتا ہے؟

سوداس: صاحب! بیراگی ہونے کے لیے راکھ ملنے اور بھیک مانگنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے مہاتماؤں نے راکھ ملنے اور جٹا بڑھانے کو تو محض ڈھکوسلا بنا دیا ہے۔ بیراگ تو من سے ہوتا ہے۔ سنسار میں رہے مگر سنسار کا ہو کر نہ رہے۔ اسی کو بیراگ کہتے ہیں۔

مسز سیوک: ہندوؤں نے یہ باتیں یونان کے اسٹوئک نامی فرقہ سے سیکھی ہیں، لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ ان پر کاربند ہونا کتنا مشکل ہے۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ انسان پر رنج و مسرت کا

اثر نہ پڑے۔ اسی اندھے کو اگر اس وقت پیسے نہ ملیں تو اپنے دل میں ہمیں ہزاروں صلواتیں سنائے گا۔

جان سیوک: ہاں اسے کچھ مت دو۔ دیکھو کیا کہتا ہے۔ اگر ذرا بھی جھنجھنایا تو میں ہنٹر سے باتیں کروں گا۔ سارا بیراگ بھول جائے گا۔ مانگتا ہے بھیک ایک ایک دھیلے کے لیے میلوں کتے کی طرح دوڑتا ہے۔ اس پر غرہ یہ ہے کہ میں بیراگی ہوں (کوچوان سے) گاڑی بھیرو کلب ہوتے ہوئے بنگلے چلو۔

صوفیہ: ماما! کچھ تو ضرور دے دو! بے چارہ امیدیں باندھ کر اتنی دور دوڑا آیا ہے۔

پربھوسیوک: اوہو! مجھے تو پیسے بھنانے کی یاد ہی نہ رہی!

جان سیوک: ہرگز نہیں، کچھ مت دو، میں اسے بیراگ کا سبق دینا چاہتا ہوں۔

گاڑی روانہ ہوئی سورداس مایوسی کا مجسمہ بنا ہوا اپنی اندھی آنکھوں سے گاڑی کی طرف تاکتا رہا۔ گویا اس کو اب بھی یقین نہ ہوتا تھا کہ کوئی انسان اتنا بے رحم ہوسکتا ہے۔ وہ اسی نیم یقینی کی حالت میں گاڑی کے پیچھے پیچھے کئی قدم چلا بھی۔ دفعتا! صوفیا نے کہا: ''سورداس! افسوس کہ اس وقت میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ پھر کبھی ادھر آؤں گی تو تم کو اس قدر مایوس نہ ہونا پڑے گا۔''

اندھوں میں فراست کا مادہ کافی ہوتا ہے۔ سورداس موجودہ کیفیت کو بخوبی سمجھ گیا۔ دل کو تکلیف تو ہوئی مگر بے پروائی سے بولا ''میم صاحب! اس کی کیا فکر؟ بھگوان تمھاری کلیان کریں۔ تمھاری دیا چاہیے۔ میرے لیے یہی بہت ہے''

صوفیہ نے ماں سے کہا ''ماما! دیکھا آپ نے؟ اس کی طبیعت ذرا مکدر نہیں ہوئی''

پربھوسیوک: ہاں رنجیدہ تو نہیں معلوم ہوتا

جان سیوک: اس کے دل سے پوچھو

مسز سیوک: گالیاں دے رہا ہوگا

گاڑی ابھی آہستہ آہستہ چل رہی تھی کہ طاہر علی نے پکارا ''حضور یہ زمین پنڈا کی نہیں

بلکہ سورداس کی ہے یہ لوگ کہہ رہے ہیں‘‘

صاحب نے گاڑی روک دی۔ شرمندہ نظری سے مسٹر سیوک کو دیکھا۔ گاڑی سے اتر کر سورداس کے پاس آئے اور منکسرانہ انداز سے بولے’’ کیوں سورداس؟ یہ زمین تمہاری ہے؟‘‘

سورداس: ہاں حضور! میری ہی ہے۔

جان سیوک: تو میرا کام بن گیا۔ میں اندیشہ میں تھا کہ نہ جانے اس کا مالک کون ہے اور اس سے معاملہ طے بھی ہو گا یا نہیں۔ جب تمہاری ہے تو پھر کوئی اندیشہ نہیں۔ تم جیسے تارک الدنیا اور نیک شخص سے زیادہ جھنجھٹ نہ کرنا پڑے گا۔ جب تمہارے پاس اتنی زمین ہے تو تم نے یہ بھیس کیوں بنا رکھا ہے؟

سورداس: کیا کروں حضور بھگوان کی جو مرضی ہے وہ کر رہا ہوں۔

جان سیوک: تو اب تمہاری مصیبت دور ہو جائے گی۔ بس یہ زمین مجھے دے دو۔ بھلائی کی بھلائی اور فائدہ کا فائدہ میں تم کو منہ مانگی قیمت دوں گا۔

سورداس: سرکار! بزرگوں کی یہی نشانی ہے۔ اسے بیچ کر ان کو کیا منہ دکھاؤں گا؟

جان سیوک: یہیں سڑک پر ایک کنواں بنا دوں گا۔ تمہارے پرکھوں کا نام اس سے چلتا رہے گا۔

سورداس: صاحب اس زمین سے محلّہ والوں کا بہت فائدہ ہوتا ہے۔ کہیں ایک انگل بھر چری نہیں ہے۔ قرب و جوار کے کل مویشی یہیں چرنے آتے ہیں۔ فروخت کر ڈالوں گا تو مویشیوں کے لیے کوئی ٹھکانا نہ رہ جائے گا۔

جان سیوک: کتنے روپے سالانہ چرائی کے پاتے ہو؟

سوداس: کچھ نہیں مجھے بھگوان کھانے بھر کو یوں ہی دے دیتے ہیں تو کسی سے چرائی کیا لوں؟ کسی اور کچھ بھلائی نہیں کر سکتا تو اتنی ہی سہی۔

جان سیوک: (تعجب سے) تم نے اتنی زمین یوں ہی چرائی کے لیے چھوڑ رکھی ہے۔

صوفیہ سچ کہتی تھی کہ تم تیاگ کی مورت ہو۔ میں نے بڑوں بڑوں میں اتنا تیاگ نہیں دیکھا۔تم کو آفرین ہے لیکن جب مویشیوں پر اتنی دیا کرتے ہو تو انسان وک کس طرح مایوس کرو گے؟ میں یہ زمین لیے بغیر تمہارا گلا نہ چھوڑوں گا۔

سورداس: سرکار! یہ زمین میری ہے ضرور، لیکن جب تک محلّہ والوں سے پوچھ نہ لوں، کچھ کہہ نہیں سکتا۔ آپ اس کو لے کر کیا کریں گے؟

جان سیوک: یہاں ایک کارخانہ کھولوں گا جس سے ملک وقوم کی ترقی ہوگی۔غریبوں کا فائدہ ہوگا۔ ہزاروں آدمیوں کی روٹیاں چلیں گی۔اس کا ثواب بھی تمہیں کو ہوگا۔

سوداس: حضور! محلّہ کے لوگوں سے دریافت کیے بغیر میں کچھ نہیں عرض کر سکتا۔

جان سیوک: اچھی بات ہے پوچھ لو میں پھر تم سے ملوں گا اتنا سمجھ رکھو کہ میرے ساتھ سودا کرنے میں تم کو گھاٹا نہ رہے گا۔تم جس طرح خوش ہوگے، اسی طرح خوش کروں گا یہ لو (جیب سے پانچ روپے نکال کر) میں نے تم کو معمولی بھکاری سمجھ کر تمہاری توہین کی تھی۔ پس مجھے معاف کرو۔

سورداس: حضور! میں روپے لے کر کیا کروں گا؟ دھرم کے ناتے دو چار پیسے دے دیجیے، تو آپ کا کلیان مناؤں گا اور کسی ناتے سے میں روپے نہ لوں گا۔

جان سیوک: تمہیں دو چار پیسے کیا دوں؟ اسے لے لو دھرم کے ناتے ہی سمجھو

سورداس: نہیں صاحب! دھرم میں آپ کی غرض شامل ہوگئی ہے۔اب یہ دھرم نہیں رہا۔

جان سیوک نے بہت اصرار کیا، لیکن سورداس نے روپے نہ لیے۔صاحب مجبور ہو کر گاڑی پر جا بیٹھے۔مسز سیوک نے پوچھا ’’کیا باتیں ہوئیں؟‘‘

جان سیوک: ہے تو فقیر لیکن بہت مغرور ہے۔پانچ روپے دیتا تھا نہ لیے

مسز سیوک: ہے کچھ امید؟

جان سیوک: جتنا آسان سمجھ رکھا تھا۔اتنا آسان نہیں ہے

گاڑی تیز ہو گئی۔

2

سورداس لاٹھی ٹیکتا ہوا آہستہ آہستہ گھر کی طرف چلا۔ راستہ میں چلتے چلتے سوچنے لگا۔ یہ ہے بڑے آدمیوں کی خود غرضی۔ پہلے کیسی شان دکھاتے تھے۔ مجھے کتے سے بھی بدتر سمجھا، لیکن جونہی ان کو معلوم ہوا کہ زمین میری ہے تو کیسی خوشامد آمیز گفتگو کرنے لگے۔ انہیں میں اپنی زمین دیئے دیتا ہوں! پانچ روپے دکھاتے تھے۔ گویا میں نے روپے دیکھے ہی نہیں! پانچ کیا پانچ سو بھی دیں تو میں زمین نہ دوں گا۔ محلّہ والوں کو کونسا منہ دکھاؤں گا۔ ان کے کارخانہ کے لیے بیچاری گائیں ماری ماری پھریں! عیسائیوں کو دیا دھرم کا ذرا بھی خیال نہیں ہوتا۔ بس سب کو عیسائی ہی بناتے پھرتے ہیں۔ کچھ نہ دینا تھا تو پہلے ہی جواب دے دیتے۔ میل بھر دوڑا کر کہہ دیا تھا چل ہٹ معلوم ہوتا ہے کہ ان سب میں لڑکی ہی کا سو بھاؤ اچھا ہے۔ اسی میں دیا دھرم ہے۔ بڑھیا تو پوری کرک سا ہے۔ سیدھے منہ بات نہیں کرتی۔ اتنا گھمنڈ! جیسے یہی وکٹوریہ ہیں! رام رام تھک گیا ابھی تک دم پھول رہا ہے۔ ایسا آج تک کبھی نہ ہوا تھا کہ اتنا دوڑ کر کسی نے کورا جواب دے دیا ہو۔ خیر بھگوان کی یہی اچھا ہو گی۔ اے دل! اتنا غم نہ کر مانگنا تمہارا کام ہے اور دینا دوسروں کا۔ اپنا دھن ہے کوئی نہیں دیتا تو تمہیں برا کیوں لگتا ہے؟ لوگوں سے کہہ دوں کہ صاحب زمین مانگتے ہیں؟ نہیں سب گھبرا جائیں گے۔ میں نے جواب تو دے ہی دیا۔ اب دوسروں سے کہنا فضول ہے۔

یہ سوچتا ہوا وہ اپنے دروازہ پر پہنچا۔ بہت ہی معمولی جھونپڑی تھی۔ سامنے ایک نیم کا درخت تھا۔ دروازہ پر کواڑوں کی جگہ بانس کی ٹہنیوں کی ایک ٹٹی لگی ہوئی تھی۔ سورداس نے ٹٹی ہٹائی۔ کمر سے پیسوں کی ایک چھوٹی پوٹلی نکالی، جو آج دن بھر کی کمائی تھی۔ پھر جھونپڑی کی چھت میں سے ٹٹول کر ایک تھیلی نکالی، جو اس کی زندگی کا ماحصل تھی۔ اس میں پیسوں کو بہت آہستہ سے رکھا کہ کسی کے کانوں میں بھنک نہ پڑے۔ ازاں بعد اس تھیلی کو چھت

میں چھپا کر پڑوس کے گھر سے آگ مانگ لایا۔ پیڑوں کے نیچے سے کچھ سوکھی ٹہنیاں جمع کر رکھی تھیں۔ انہیں سے چولہا جلایا۔ جھونپڑی میں دھندلی سی روشنی ہوئی۔ بے سر و سامانی کا نظارہ کرنا دل شکن تھا! نہ کھاٹ نہ بستر نہ برتن نہ بھانڈے ایک گوشہ میں ایک مٹی کا گھڑا تھا جس کی عمر کا کچھ اندازہ اس پر جمی ہوئی کائی سے ہو سکتا تھا۔ چولہے کے پاس ایک ہانڈی تھی۔ پرانا اور سوراخوں سے چھلنی بنا ہوا ایک لوہے کا توا۔ ایک چھوٹی کٹھوت اور ایک لوٹا۔ بس یہی اس گھر کی ساری دولت تھی۔ انسانی خواہشات کا کتنا مکمل خلاصہ!

سورداس نے آج جتنا اناج پایا تھا، وہ سب جوں کا توں ہانڈی میں ڈال دیا۔ کچھ جو تھے کچھ گیہوں، کچھ مٹر، کچھ چنے، تھوڑی سی جوار اور مٹھی بھر چاول اوپر سے قدرے نمک ڈال دیا۔ کس کی زبان نے ایسی غذائے لطیف و نفیس کا مزہ چکھا ہوگا؟ اس میں قناعت کی شیرینی تھی، جس سے شیریں تر دنیا میں کوئی چیز نہیں۔ ہانڈی کو چولہے پر چڑھا کر وہ گھر سے نکلا۔ دروازے پر ٹٹی لگائی اور سڑک پر جا کر ایک بنیے کی دکان سے تھوڑا سا آٹا اور ایک پیسہ کا گڑ لایا۔ آٹے کو کٹھوت میں گوندھا اور پھر نصف گھنٹہ تک چولہے کے سامنے کھچڑی کا دلکش ترانا سنتا رہا۔ اس دھندلی سی روشنی میں اس کا لاغر جسم اور اس کے بوسیدہ کپڑے انسانوں کی اس محبت کا مضحکہ اڑا رہے تھے، جو ان کو زندگی کے ساتھ فطرتاً ہوا کرتی ہے۔

ہانڈی میں کئی دفعہ ابال آیا اور کئی دفعہ آگ بجھی۔ بال بال چولہا پھونکتے پھونکتے سورداس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگتا تھا۔ آنکھیں چاہے دیکھ نہ سکیں، پر رو سکتی ہیں۔ آخر وہ لذیذ مرکب تیار ہوا۔ اس نے اس کو اتار کر نیچے رکھا۔ چولہے پر توا چڑھایا اور ہاتھوں سے روٹیاں بنا بنا کر سینکنے لگا۔ کتنا صحیح اندازہ تھا! روٹیاں سب یکساں تھیں۔ نہ چھوٹی نہ بڑی، نہ سیوڑی نہ جلی ہوئی۔ توے سے تار اتار کر روٹیوں کو چولہے میں پکاتا تھا اور زمین پر رکھتا جاتا تھا۔ جب روٹیاں بن گئیں تو اس نے دروازہ پر کھڑے ہو کر زور سے پکارا ''مٹھو، مٹھو! آؤ بیٹا کھانا تیار ہے'' مگر جب مٹھو نہ آیا تو اس نے پھر دروازہ پر ٹٹی لگائی اور نایک رام کے برآمدہ میں جا کر مٹھو کو پکارنے لگا۔ مٹھو وہیں سو رہا تھا۔ آواز سن کر

چونکہ 12،13 سال کا خوب صورت اور خندرو لڑکا تھا۔ بھرا ہوا جسم سڈول ہاتھ پاؤں، یہ سورداس کا بھتیجا تھا۔ اس کے ماں باپ دونوں طاعون میں مر چکے تھے۔ تین سال سے اس کی پرورش و پرداخت کا بار سورداس ہی پر تھا۔ وہ اس کو جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ وہ خود چاہے فاقہ کرے مگر مٹھو کو ہر روز تین مرتبہ ضرور کھلاتا تھا۔ خود مٹر چبا کر رہ جاتا مگر اس کو شکر اور روٹی کبھی گھی اور نمک کے ساتھ روٹیاں کھلاتا تھا۔ اگر کوئی بھیک میں مٹھائی یا گڑ دے دیتا تو اس کو بڑی احتیاط سے اپنے انگوچھے کے گوشہ میں باندھ لیتا اور مٹھو کو دیتا سب سے کہتا" یہ کمائی بڑھاپے کے لیے کر رہا ہوں ابھی تو ہاتھ پیر چلتے ہیں۔ مانگ کھاتا ہوں جب اٹھ بیٹھ نہ سکوں گا تو لوٹا بھر پانی کون دے گا؟ مٹھو کو سوتا پا کر گود میں اٹھا لیا اور جھونپڑی کے دروازہ پر اتارا۔ پھر دروازہ کھولا اس کا منہ دھلوایا اور سامنے گڑ اور روٹیاں رکھ دیں۔ مٹھو نے روٹیاں دیکھیں تو مچل کر بولا میں روٹی اور گڑ نہ کھاؤں گا یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔"

سورداس: بیٹا! بہت اچھا گڑ ہے، کھاؤ تو دیکھو کیسی نرم نرم روٹیاں ہیں گیہوں کی ہیں

مٹھو: میں نہ کھاؤں گا

سورداس: تو کیا کھاؤ گے بیٹا؟ اتنی رات گئے اور کیا ملے گا؟

مٹھو: میں تو دودھ روٹی کھاؤں گا

سورداس: بیٹا! اس وقت کھا لو میں سویرے دودھ لا دوں گا

مٹھو رونے لگا سورداس اسے بہلا کر تھک گیا تو اپنے نصیبوں کو روتا ہوا اٹھا لکڑی اٹھائی اور ٹٹولتا ہوا بجرنگی اہیر کے گھر آیا جو اس کی جھونپڑی کے پاس ہی تھا بجرنگی کھاٹ پر بیٹھا ناریل پی رہا تھا۔ اس کی بیوی جمنی کھانا پکاتی تھی۔ صحن میں تین بھینسیں اور چار پانچ گائیں چرنی پر بندھی ہوئیں چارا کھا رہی تھیں۔ بجرنگی نے کہا" کہو سورداس! کیسے چلے؟ آج بگھی پر کون لوگ بیٹھے ہوئے تم سے باتیں کر رہے تھے؟"

سورداس: وہی گودام کے صاحب تھے۔

بجرنگی: تم بہت دور تک گاڑی کے پیچھے دوڑے۔ کچھ ہاتھ لگا؟

سورداس: پتھر ہاتھ لگا! عیسائیوں میں بھی کہیں دیا دھرم ہوتا ہے۔ میری وہی زمین لینے کو کہتے ہیں۔

بجرنگی: گودام کے پیچھے والی نا؟

سوداس: ہاں وہی بہت لالچ دیتے رہے، پر میں نے ہاں نہیں کہا

سورداس نے سوچا تھا کہ ابھی کسی سے یہ بات نہیں کہوں گا لیکن اس وقت دودھ لینے کے لیے کچھ خوشامد ضروری تھی۔ اپنا تیاگ دکھا کر سرخرو بننا چاہتا تھا

بجرنگی: تم ہاں بھی کرتے تو یہاں کون اسے چھوڑے دیتا تھا؟ تین چار گاؤں کے بیچ میں یہی تو اتنی زمین ہے وہ نکل جائے گی تو ہماری گائیں اور بھینسیں کہاں جائیں گی؟

جمنی: میں تو انہیں کے دروازہ پر ان کو باندھ آتی

سورداس: میری جان نکل جائے تب تو بیچوں ہی گا نہیں ہزار پانچ سو کس گنتی میں ہیں؟ بہو جی! ایک گھونٹ دودھ ہو تو دے دے۔ مٹھوا کھانے بیٹھا ہے۔ روٹی اور گڑ چھوتا ہی نہیں۔ بس دودھ دودھ کی رٹ لگائے ہوئے ہے۔ جو چیز گھر میں نہیں ہوتی، اس کے لیے ضد کرتا ہے۔ دودھ نہ پائے گا تو بغیر کھائے ہی سو رہے گا

بجرنگی: لے جاؤ دودھ کی کون کمی ہے؟ ابھی دوہا ہے گھیسو کی ماں! ایک کلھیا دودھ دے دو سورداس کو

جمنی: ذرا بیٹھ جاؤ سورداس! ہاتھ خالی ہو تو دوں

بجرنگی: وہاں مٹھو کھانے بیٹھا ہے تو کہتی ہے ہاتھ خالی ہو تو دوں۔ تجھ سے نہ اٹھا جائے تو میں آؤں۔

جمنی جانتی تھی کہ یہ حضرت اٹھیں گے تو پاؤ کے بدلے آدھ سیر دلے ڈالیں گے۔ جھٹ رسوئی سے نکل آئی۔ ایک کلھیا میں پانی لیا۔ اوپر سے دودھ ڈال کر سورداس کے پاس لائی اور لاآزارانہ میل کے لہجہ میں بولی ''یہ لو! اس لونڈے کی زبان تم نے ایسی بگاڑ دی

ہے کہ بنا دودھ کے کور ہی نہیں اٹھاتا۔ باپ جیتا تھا تو پیٹ بھر چنے بھی نہ ملتے تھے۔ اب دودھ کے بنا کھانے ہی نہیں اٹھا۔''

سورداس: کیا کروں بھائی؟ رونے لگتا ہے تو ترس آتا ہے۔

جمنی: ابھی اس طرح پال پوس رہے ہو کہ ایک دن کام آئے گا، مگر دیکھ لینا جو چلو بھر پانی کو بھی پوچھے۔ میری بات گانٹھ باندھ لو پرایا لڑکا کبھی اپنا نہیں ہوتا۔ ہاتھ پاؤں ہوئے اور تمہیں پھٹکار کر الگ ہو جائے گا تم اپنے لیے سانپ پال رہے ہو۔

سورداس: جو کچھ میرا دھرم ہے کیے دیتا ہوں۔ آدمی ہو گا تو کہاں تک نہ جس مانے گا۔ ہاں اپنی تقدیر ہی کھوٹی ہوئی تو کوئی کیا کرے گا اپنے ہی لڑکے کیا بڑے ہو کر منہ نہیں پھیر لیتے۔

جمنی: کیوں نہیں کہہ دیتے۔ میری بھینسیں چرالایا کرے؟ جوان تو ہوا کیا جنم بھر ننھا ہی بنا رہے گا؟ گھیسو ہی کا جوڑی دار تو ہے۔ میری بات گانٹھ باندھ لو۔ ابھی سے کسی کام میں نہ لگایا تو کھلاڑی ہو جائے گا۔ پھر کسی کام میں اس کا جی نہ لگے گا۔ ساری عمر تمہارے ہی سر پھلوریاں کھاتا رہے گا۔

سورداس نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ دودھ کی کلھیالی اور لاٹھی سے ٹٹولتا ہوا گھر چلا۔ مٹھو زمین پر پڑا سو رہا تھا۔ اس کو پھر اٹھایا اور دودھ میں روٹیاں مل کر اسے اپنے ہاتھ سے کھلانے لگا۔ مٹھو نیند سے گرا پڑتا تھا، لیکن لقمہ سامنے آتے ہی اس کا منہ خود بخود کھل جاتا تھا۔ جب وہ ساری روٹیاں کھا چکا تو سورداس نے اس کو چٹائی پر لٹا دیا اور ہانڈی میں سے اپنی پنچ میل کھچڑی نکال کر کھائی۔ پیٹ نہ بھرا تو ہانڈی دھو کر پی گیا۔ ازاں بعد مٹھو کو گود میں اٹھا کر باہر آیا۔ دروازہ پر ٹٹی لگائی اور مندر کی طرف چلا۔

یہ مندر ٹھاکر جی کا تھا۔ بستی کے دوسرے سرے پر، اونچی کرسی تھی۔ مندر کے چاروں طرف تین چار گز چوڑا گبوترا تھا۔ یہی محلّہ کی چوپال تھی۔ تمام دن یہاں دس پانچ آدمی لیٹے یا بیٹھے رہتے تھے۔ ایک پختہ کنواں بھی تھا۔ جس پر جگدھر نام کا ایک خوانچہ والا بیٹھا

کرتا۔ تیل کی مٹھائیاں، مونگ پھلی، رام دانے کے لڈو وغیرہ رکھتا تھا۔ راہ گیر آتے۔ اس سے مٹھائیاں لیتے۔ پانی نکال کر پیتے اور اپنی راہ چلے جاتے۔ مندر کے پوجاری کا نام دیا گر تھا، جو اسی مندر کے قریب ایک کٹیا میں رہتے تھے۔ ٹھوس ایشور کے پوجاری تھے۔ بھجنوں اور گانوں کو نجات کا ذریعہ سمجھتے تھے اور بلا مورت والی پوجا کو ڈھونگ کہتے تھے۔ شہر کے پرانے رئیس کنور بھرت سنگھ کے یہاں سے کچھ ماہوار وظیفہ مقرر تھا۔ اسی سے ٹھاکر جی کا بھوگ لگتا تھا۔ بستی سے بھی کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا تھا۔ بے لوٹ آدمی تھا۔ لالچ چھو بھی نہیں گیا تھا۔ صبر توکل کا پتلا تھا۔ تمام دن ذکر الٰہی میں مصروف رہتا تھا۔ مندر میں ایک چھوٹی سی سنگت تھی۔ آٹھ نو بجے رات کو دن کے کام دھندے سے فارغ ہو کر چند خوش اعتقاد لوگ جمع ہو جاتے تھے اور گھنٹے دو گھنٹے بھجن گا کر چلے جاتے تھے۔ ٹھاکر دین ڈھول بجانے میں مشاق تھے۔ بجرنگی کرتال بجاتا تھا۔ جگدھر کو طنبورہ میں کمال تھا۔ نایک رام اور دیا گر سارنگی بجاتے تھے۔ مجیرے بجانے والوں کی تعداد میں کمی بیشی ہو جایا کرتی تھی۔ جو اور کچھ نہ کر سکتا وہ مجیرا ہی بجاتا تھا۔ سورداس اس مجلس کی ناک تھا۔ ڈھول، مجیرے، کرتال، سارنگی، طنبورہ سبھی میں اس کو یکساں مہارت تھی اور گانے میں تو آس پاس کے کئی محلوں میں اس کا جواب نہ تھا۔ ٹھمری، غزل سے اس کو رغبت نہ تھی۔ کبیر، میرا، دادو، کمال پلٹو وغیرہ صوفیوں کے بھجن گاتا تھا۔ اس وقت اس کا چہرہ خوشی سے کھلا جاتا تھا۔ گاتے گاتے مست ہو جاتا۔ تن بدن کی سدھ نہ رہتی۔ سارے تفکرات و تردورات بھگتی کے اتھاہ ساگر میں ڈوب جاتے تھے۔

سورداس مٹھو کو لیے ہوئے پہنچا تو مجلس آراستہ ہو چکی تھی۔ جملہ ارکان جمع تھے۔ صرف میر مجلس کی کمی تھی۔ سورداس کو دیکھتے ہی نایک رام نے کہا ”تم نے بڑی دیر کر دی۔ آدھ گھنٹہ سے تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں۔ یہ لونڈا اسی طرح تمہارے گلے پڑا ہے۔ کیوں نہیں ہمارے گھر سے کچھ مانگ کر اسے کھلا دیا کرتے؟“

دیا گر: یہاں چلا آیا کرے تو ٹھاکر جی کے پرشاد ہی سے پیٹ بھر جائے۔

سورداس: تمہیں لوگوں کا دیا کھاتا ہے یا کسی کا؟ میں تو بنا نے بھر کو ہوں۔

جگدھر: لڑکوں کو اتنا سر چڑھانا اچھا نہیں۔ گود میں لادے پھرتے ہو جیسے کوئی ننھا سا لڑکا ہو۔ میرا ودیادھر اس سے دو سال چھوٹا ہے۔ میں اس کو کبھی گود میں لے کر نہیں پھرتا۔

سورداس: بنا ماں باپ کے لڑکے ضدی ہو جاتے ہیں۔ ہاں کیا ہوگا؟

دیاگر: پہلے رامائن کی ایک چوپائی ہو جائے۔

حاضرین نے اپنے اپنے ساز سنبھالے۔ سر ملا اور آدھ گھنٹہ تک رامائن ہوتی رہی۔

نایک رام: واہ سورداس واہ! اب تمہارے ہی دم کا ظہور ہے۔

بجرنگی: میری تو کوئی دونوں آنکھیں لے لے اور یہ ہنر مجھے دے دے تو میں خوشی سے بدل لوں۔

جگدھر: ابھی بھیرو نہیں آیا۔ اس کے بنا رنگ نہیں جمتا۔

بجرنگی: تاڑی بیچتا ہوگا۔ پیسہ کا لالچ برا ہوتا ہے۔ گھر میں ایک عورت ہے اور ایک بڑھیا ماں، پر رات دن ہائے ہائے پڑی رہتی ہے۔ کام کرنے کو تو دن ہے ہی۔ بھلا رات کو تو بھگوان کا بھجن ہو جائے۔

جگدھر: سورداس کا دم اکھڑ جاتا ہے۔ اس کا دم نہیں اکھڑتا۔

بجرنگی: تم اپنا کھونچہ بیچو۔ تمہیں کیا معلوم کہ دم کس کو کہتے ہیں؟ سورداس جتنا دم سادھتے ہیں اتنا کوئی دوسرا سادھے تو کلیجہ پھٹ جائے۔ کچھ ہنسی کھیل نہیں ہے۔

جگدھر: اچھا بھیا! سورداس کے برابر دنیا میں کوئی دم نہیں سادھ سکتا۔ اب خوش ہوئے؟

سورداس: بھیا اس میں جھگڑا کا ہے کا؟ میں کب کہتا ہوں کہ مجھے گانا آتا ہے؟ تم لوگوں کا حکم پا کر جیسا بھلا برا بنتا ہے، سنا دیتا ہوں۔

اتنے میں بھیرو بھی آ کر بیٹھ گیا۔ بجرنگی نے طنز سے کہا ''کیا اب کوئی تاڑی پینے والا نہیں تھا؟ اتنی جلد دکان کیوں بڑھا دی؟''

ٹھاکر دین: معلوم نہیں ہاتھ پیر بھی دھوئے ہیں یا وہاں سے سیدھے ٹھاکر جی کے مندر میں چلے آئے۔ اب صفائی تو کہیں رہی نہیں گئی۔

بھیرو: کیا میری دیہہ میں تاڑی پوتی ہوئی ہے؟

ٹھاکر دین: بھگوان کے دربار میں اس طرح نہ آنا چاہیے۔ ذات چاہے اونچی ہو یا نیچی پر صفائی چاہیے ضرور۔

بھیرو: تم یہاں روز نہا کر آتے ہو؟

ٹھاکر دین: پان بیچنا کوئی نیچ کام نہیں ہے۔

بھیرو: جیسے پان ویسے تاڑی، پان بیچنا کوئی اونچا کام نہیں ہے۔

ٹھاکر دین: پان بھگوان کے بھوگ کے ساتھ رکھا جاتا ہے۔ بڑے بڑے جنیو دھاری میرے ہاتھ کا پان کھاتے ہیں۔ تمہارے ہاتھ کا تو کوئی پانی نہیں پیتا۔

نایک رام: ٹھاکر دین! یہ بات تو تم نے بڑی کھری کہی۔ سچ تو ہے۔ پاسی بیکوئی گھڑے تک نہیں چھوا تا۔

بھیرو، ہماری دکان پر ایک دن آ کر بیٹھ جاؤ تو دکھادوں کہ کیسے کیسے دھرماتما اور مہاتما آتے ہیں۔ سادھو مہاتماؤں کو بھی کسی نے پان کھاتے دیکھا ہے۔ تاڑی، گانجہ، چرس پیتے ہوئے جب چاہے دیکھ لو۔ ایک سے ایک مہاتما آ کر خوشامد کرتے ہیں۔

نایک رام: ٹھاکر دین! اب اس کا جواب دو۔ بھیرو پڑھا لکھا ہوتا تو وکیلوں کے کان کاٹتا۔

بھیرو: میں تو بات سچی کہتا ہوں، جیسے تاڑی ویسے پان، بلکہ پرات کی تاڑی کو تو لوگ دوا کی طرح پیتے ہیں۔

جگدھر: یارو! دو ایک بھجن ہونے دو۔ مان کیوں نہیں جاتے۔

ٹھاکر دین: تمہیں ہارے، بھیرو جیتا سہی، چلو چھٹی ہوئی۔

نایک رام: واہ ہار کیوں مان لیں؟ ساسترارتھ ہے کیوڑہ اور گلاب کی خوشبو اڑتی

ہے۔اس کی دکان پر کوئی جائے تو بدبو کے مارے ناک پھٹنے لگتی ہے۔کھڑا نہیں رہا جاتا۔ آپ چک میں بھی ایسی بدبو نہ ہوتی ہوگی۔

بجرنگی: مجھے تو گھنٹہ بھر کے لیے راج مل جاتا، تو سب سے پہلے شہر بھر کی تاڑی کی دکانوں میں آگ لگوا دیتا۔

نایک رام: اب بتاؤ بھیرو! اس کا جواب دو۔ بدبو تو سچ مچ اڑتی ہے۔ ہے کوئی جواب؟

بھیرو: جواب ایک نہیں، سینکڑوں ہیں، پان سڑ جاتا ہے تو کوئی مٹی کے مول بھی نہیں پوچھتا یہاں تاڑی جتنی سڑتی ہے، اتنا ہی اس کا مول بڑھتا ہے۔سرکہ بن جاتی ہے تو روپے بوتل بکتی ہے اور بڑے بڑے جنیو دھاری لوگ کھاتے ہیں۔

نایک رام: کیا بات کہی ہے کہ جی خوش ہوگیا۔میرا اختیار ہوتا تو اسی دم تم کو وکالت کی سند دے دیتا۔ٹھاکردین! اب ہار مان جاؤ۔بھیرو سے پیش نہ پاسکوگے۔

جگدھر: بھیرو! چپ کیوں نہیں ہو جاتے؟ پنڈا جی کو تو جانتے ہو۔ دوسروں کو لڑا کر تماشا دیکھنا ان کا کام ہے۔اتنا کہہ دینے میں کون سی مرجادا گھٹی جاتی ہے کہ بابا تم جیتے اور میں ہارا۔

بھیرو! کیوں اتنا کہہ دوں؟ بات کہنے میں کسی سے کم ہوں کیا؟

جگدھر :تو ٹھاکردین! تمھیں چپ ہو جاؤ۔

ٹھاکردین :ہاں جی! چپ نہ ہو جاؤں گا تو کیا کروں گا؟ یہاں آئے تھے کہ کچھ بھجن کیرتنا ہوگا۔ بے فائدہ کا جھگڑا کرنے لگے۔ پنڈا جی کو کیا۔انہیں تو بے ہاتھ پیر ہلائے امرتیاں اور لڈو کھانے کو ملتے ہیں۔ان کو اسی طرح کی دل لگی سوجھتی ہے۔ یہاں تو پہر رات سے اٹھ کر پھر چکی میں جتنا ہے۔

جگدھر :میری تو اب کے بھگوان سے بھینٹ ہوگی تو کہوں گا کہ کسی پنڈے کے گھر جنم دینا۔

نایک رام: بھیا! مجھ پر ہاتھ نہ اٹھاؤ۔ دبلا پتلا آدمی ہوں۔ میں تو چاہتا ہوں کہ جل پان کے لیے تمہارے ہی کھونچے سے مٹھائیاں لیا کروں۔ مگر اس پر اتنی مکھیاں اڑتی ہیں اور اوپر اتنا میل جما رہتا ہے کہ کھانے کو جی نہیں چاہتا۔

جگدھر: (چڑ کر) تمہارے نہ لینے سے میری مٹھائیاں سڑ تو نہیں جاتیں کہ بھوکوں مرتا ہوں۔ دن بھر میں روپے بیس آنہ بنا ہی لیتا ہوں۔ جس کو مفت میں رس گلے مل جائیں، وہ میری مٹھائیاں کیوں لے گا؟

ٹھاکر دین: پنڈا جی کی آمدنی کا کوئی ٹھکانا ہے؟ جتنا روز مل جائے تھوڑا ہی ہے اور اوپر سے بھوجن کھاتے ہیں۔ کوئی آنکھ کا اندھا گانٹھ کا پورا پھنس گیا تو ہاتھی، گھوڑے، جگہ زمین سب دے گیا۔ ایسا بھاگوان اور کون ہوگا؟

دیاگر: کہیں نہیں ٹھاکر دین! اپنی محنت کی کمائی سب سے اچھی، پنڈوں کو جاتریوں کے پیچھے دوڑتے نہیں دیکھا ہے۔

نایک رام: بابا! اگر کوئی کمائی پسینہ کی ہے تو وہ ہماری ہے۔ ہماری کمائی کا حال بجرنگی سے پوچھو۔

بجرنگی: اوروں کی کمائی پسینہ کی ہوتی ہے تو تمہاری کمائی تو خون کی ہے اور لوگ پسینہ بہاتے ہیں تم خون بہاتے ہو! ایک ایک ججمان کے پیچھے لہو کی ندی بہہ جاتی ہے۔ جو لوگ کھونچہ سامنے رکھ کر دن بھر مکھی مارا کرتے ہیں وہ کیا جانیں تمہاری کمائی کیسی ہوتی ہے؟ ایک دن مورچہ تھامنا پڑے تو بھاگنے کو جگہ نہ ملے۔

جگدھر: چلو بھی! آئے ہو منہ دیکھی کہنے۔ سیر بھر دودھ کا ڈھائی سیر بناتے ہو۔ اس پر بھگوان کے بھگت بنتے ہو۔

بجرنگی: (غصہ سے) اگر کوئی مائی کا لال میرے دودھ میں ایک بوند پانی نکال دے تو اس کی ٹانگ کی راہ نکل جاؤں۔ یہاں دودھ میں پانی ملانا گئو ہتیا سمجھتے ہیں۔ تمہاری طرح نہیں کہ تیل کی مٹھائی کو گھی کی کہہ کر بیچیں اور بھولے بھالے بچوں کو ٹھگیں۔

جگدھر: اچھا بھائی! تم جیتے اور میں ہارا۔ تم سچے تمہارا دودھ سچا۔ بس ہم خراب۔ ہماری مٹھائیاں خراب۔ چلو چھٹی ہوئی۔

بجرنگی: میرے مزاج کو تم نہیں جانتے۔ چپتیاں دیتا ہوں۔ سچ کہہ کر کوئی سو جوتے مارے لیکن جھوٹی بات سن کر میرے بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔

بھیرو: بجرنگی! بہت بڑھ کر باتیں نہ کرو۔ اپنے منہ میاں مٹھو بننے سے کچھ نہیں ہوگا۔ بس منہ نہ کھلواؤ۔ میں نے تمہیں تمہارے یہاں کا دودھ پیا ہے۔ اس سے تو میری تاڑی ہی اچھی۔

ٹھاکردین: بھائی! منہ سے جو چاہے ایماندار بن لے پر اب دودھ سپنا ہو گیا۔ سارا دودھ جل جاتا ہے۔ ملائی کا نام نہیں۔ دودھ جب ملتا تھا تب ملتا تھا، ایک آنچ میں انگل بھر موٹی ملائی پڑ جاتی تھی۔

دیاگر: بچہ! ابھی بھلا برا کچھ مل تو جاتا ہے۔ وہ دن آرہے ہیں کہ دودھ آنکھوں میں لگانے کو بھی نہ ملے گا۔

بھیرو: حال تو یہ ہے کہ گھر والی سیر کا تین سیر بناتی ہے، اس پر دعویٰ یہ کہ ہم سچا مال بیچتے ہیں۔ سچا مال بیچو تو دیوالہ نکل جائے، یہ ٹھاٹ ایک دن نہ چلے۔

بجرنگی: پسینہ کی کمائی کھانے والوں کا دیوالہ نہیں نکلتا۔ دیوالہ ان کا نکلتا ہے جو دوسروں کی کمائی کھا کھا کر موٹے پڑتے ہیں۔ بھاگ کوسرا ہو کہ شہر میں ہو۔ کسی گاؤں میں ہوتے تو منہ میں مکھیاں آتیں جاتیں۔ میں تو ان سبھوں کو پاپی سمجھتا ہوں جو اونے پونے کر کے ادھر کا سودا ادھر بیچ کر اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ سچی کمائی انہیں کی ہے جو چھاتی پھاڑ کر دھرتی سے دھن نکالتے ہیں۔

بجرنگی نے بات تو کہہ ڈالی لیکن شرمندہ ہو گیا۔ اس لپیٹ میں وہاں کے سبھی آدمی آ جاتے تھے۔ وہ بھیرو، جگدھر اور ٹھاکردین کو نشانہ بنانا چاہتا تھا، لیکن سورداس، نایک رام، دیاگر سبھی پاپیوں کے درجہ میں آ گئے۔

نایک رام: تب تو بھیا! تم ہمیں بھی لے بیٹھے۔ ایک پاپی تو میں ہی ہوں کہ سارا دن مٹر گشت کرتا ہوں اور وہ بھوجن کرتا ہوں کہ بڑوں بڑوں کو میسر نہ ہو۔

ٹھاکر دین: دوسرا پاپی میں ہوں کہ شوق کی چیز بیچ کر روٹیاں کماتا ہوں۔ سنسار میں تمبولی نہ رہیں تو کس کا نقصان ہوگا؟

جگدھر: تیسرا پاپی میں ہوں کہ دن بھر اون پون کرتا رہتا ہوں۔ سیو اور خرمے کھانے کو نہ ملیں تو کوئی مر نہ جائے گا۔

بھیرو: سب سے بڑا پاپی میں ہوں کہ سب کو نشہ پلا کر اپنا پیٹ پالتا ہوں۔ سچ پوچھو تو اس سے برا کوئی کام نہیں۔ آٹھوں پہر نشہ بازوں کا ساتھ، انہیں کی باتیں سننا، انہیں کے بیچ میں رہنا، یہ بھی کوئی زندگی ہے۔

دیا گر: کیوں بجرنگی؟ سادھو مہاتما تو سب سے بڑے پاپی ہوں گے کہ وہ کچھ نہیں کرتے۔

بجرنگی: نہیں بابا بھگوان کے بھجن سے بڑھ کر کون کام ہوگا؟ رام نام کی کھیتی سب کاموں سے بڑھ کر ہے۔

نایک رام: تو یہاں اکیلے بجرنگی پنیا تما ہے اور سب کے سب پاپی ہیں۔

بجرنگی: سچ پوچھو تو سب سے بڑا پاپی میں ہوں کہ گایوں کا پیٹ کاٹ کر ان کے بچھڑوں کو بھوکوں مار کر اپنا پیٹ پالتا ہوں۔

سورداس: بھائی! کھیتی سب سے اتم ہے۔ بان (تجارت) اس سے مدھم ہے۔ بس اتنا ہی فرق ہے۔ بان کو پاپ کیوں کہتے ہو؟ اور کیوں پاپی بنتے ہو؟ ہاں چاکری بری ہے۔ چاہو تو اس کو پاپ کہو۔ اب تک تمہارے اوپر بھگوان کی دیا ہے۔ اپنا اپنا کام کرتے ہو مگر ایسے برے دن آرہے ہیں جب تمہیں سیوا اور ٹہل کر کے پیٹ پالنا پڑے گا۔ جب تم اپنے نوکر نہیں، پرائے کے نوکر ہو جاؤ گے۔ جب تم میں نیتی دھرم کا نشان بھی نہ رہے گا۔

سورداس نے باتیں نہایت متانت کے ساتھ کہیں جیسے کوئی رشی پیشین گوئی کر رہا ہو۔

سب لوگ سناتے میں آ گئے۔ ٹھاکر دین نے متفکر ہو کر پوچھا ''کیوں سورداس! کوئی مصیبت آنے والی ہے کیا؟ مجھے تو تمہاری باتیں سن کر ڈر لگ رہا ہے۔ کوئی نئی مصیبت تو نہیں آ رہی ہے؟''

سورداس: ہاں لچھن تو دکھائی دیتے ہیں۔ چمڑے کے گودام والا صاحب یہاں ایک تمباکو کا کارخانہ کھولنے جا رہا ہے۔ میری زمین مانگ رہا ہے۔ کارخانہ کا کھلنا ہی ہمارا اوپر مصیبت کا آنا ہے۔

ٹھاکر دین: تو جب یہ جانتے ہی ہو تو کیوں اپنی زمین دیتے ہو؟

سورداس: میرے دینے پر تھوڑا ہی ہے۔ بھائی! میں دوں تو بھی زمین نکل جائے گی، نہ دوں تو بھی نکل جائے گی۔ روپے والے سب کچھ کر سکتے ہیں۔

بجرنگی: صاحب روپے والے ہوں گے تو اپنے گھر کے ہوں گے۔ ہماری زمین کیا کھا کر لے لیں گے؟ ماتھے گر جائیں گے ماتھے ٹھٹھا نہیں ہے۔

ابھی یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ سید طاہر علی آ کر کھڑے ہو گئے اور نایک رام سے بولے ''پنڈا جی! مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔ ذرا ادھر چلے آئیے''

بجرنگی: اسی زمین کے بارے میں کچھ بات چیت کرنی ہے نا؟ وہ زمین نہ بکے گی۔

طاہر علی: میں تم سے تھوڑا ہی پوچھتا ہوں۔ تم اس زمین کے مالک مختار نہیں ہو۔

بجرنگی: کہہ تو دیا وہ زمین نہ بکے گی۔ مختار کوئی ہو۔

طاہر علی: آئیے پنڈا جی آپ! انہیں بکنے دیجیے

نایک رام: آپ کو جو کچھ ہو کہیے۔ یہ سب لوگ اپنے ہی ہیں کسی سے پردا نہیں ہے۔ سنیں گے تو سب سنیں گے اور جو بات طے ہو گی سب کی صلاح سے ہو گی۔ کہیے کیا کہتے ہیں؟

طاہر علی: اسی زمین کے بارہ میں بات چیت کرنی تھی۔

نایک رام: تو اس زمین کا مالک آپ کے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔ جو کچھ کہنا ہے اسی

سے کیوں نہیں کہتے۔ مجھے بیچ میں دلالی نہیں کھانی ہے۔ جب سورداس نے صاحب کے سامنے انکار کر دیا تو پھر کون سی بات باقی رہ گئی؟

بجرنگی: انہوں نے سوچا ہوگا کہ پنڈا جی کو بیچ میں ڈال کر کام نکال لیں گے۔ صاحب سے کہہ دینا یہاں صاحبی نہ چلے گی۔

طاہر علی: تم اہیر ہونا جبھی اتنے گرم ہو رہے ہو۔ ابھی صاحب کو جانتے نہیں ہو۔ جبھی بڑھ بڑھ کر باتیں کر رہے ہو۔ جس وقت صاحب زمین لینے آجائیں گے، لے ہی لیں گے، تمہارے روکنے نہ رکیں گے۔ جانتے ہو شہر کے حاکموں سے ان کا کتنا میل جول ہے۔ ان کی لڑکی کی منگنی حاکم ضلع سے ہونے والی ہے۔ ان کی بات کو کون ٹال سکتا ہے؟ سیدھے سے رضامندی کے ساتھ دو گے تو اچھے دام پاؤ گے۔ شرارت کرو گے تو زمین بھی نکل جائے گی اور کوڑی بھی ہاتھ نہ لگے گی۔ ریلوں کے مالک کیا زمین اپنے ساتھ لائے تھے؟ ہماری ہی زمین تو لی ہے۔ کیا اسی قاعدے سے یہ زمین نہیں نکل سکتی؟

بجرنگی: تمہیں بھی کچھ طے کرائی ملنے والی ہوگی۔ تبھی اتنی خیر خواہی کر رہے ہو!

جگدھر: ان سے جو کچھ ملنے والا ہو وہ ہمیں سے لے لیجیے اور ان سے کہہ دیجیے کہ زمین نہ ملے گی۔ آپ لوگ جھانسہ باز ہیں۔ ایسا جھانسہ دیجیے کہ صاحب کی عقل گم ہو جائے۔

طاہر علی: میری خیر خواہی روپے کے لالچ سے نہیں ہے۔ اپنے مالک کی آنکھ بچا کر ایک کوڑی بھی لینا حرام سمجھتا ہوں۔ خیر خواہی اس لیے کرتا ہوں کہ ان کا نمک کھاتا ہوں۔

جگدھر: اچھا صاحب بھول ہوئی معاف کیجیے۔ میں نے سنسار کے چلن کی بات کی تھی۔

طاہر علی: تو سورداس! میں صاحب سے جا کر کیا کہہ دوں؟

سورداس: بس یہی کہہ دیجیے کہ زمین نہ بکے گی۔

طاہر علی: میں پھر کہتا ہوں۔ دھوکا کھاؤ گے۔ صاحب زمین کو لے کر چھوڑیں گے۔

سورداس: میرے جیتے جی تو زمین نہ ملے گی۔ ہاں مر جاؤں تو بھلے ہی مل جائے۔

طاہر علی چلے گئے تو بھیرو بولا ''دنیا اپنا ہی فائدہ دیکھتی ہے۔ اپنا کلیان ہو دوسرے جئیں یا مریں۔''

بجرنگی! تمہاری تو گائیں چرتی ہیں۔ اس لیے تمہاری تو بھلائی اس میں ہے کہ زمین بنی رہے۔ میری کون گائے چرتی ہے؟ کارخانہ کھلا تو میری بکری چوگنی ہو جائے گی۔ یہ بات تمہارے دھیان میں کیوں نہیں آئی؟ تم سب کی طرف سے وکالت کرنے والے کون ہو؟ سورداس کی زمین ہے۔ وہ بیچے یا رکھے۔ تم کون ہوتے ہو بیچ میں کودنے والے؟

نایک رام: ہاں بجرنگی، جب تم سے کوئی واسطہ سروکار نہیں ہے تو تم کون ہوتے ہو بیچ میں کودنے والے؟ بولو! بھیرو کا جواب دو۔

بجرنگی: واسطہ سروکار کیسے نہیں؟ دس گاؤں اور محلے کے جانور یہاں چرنے آتے ہیں، وہ کہاں جائیں گے۔ صاحب کے گھر کہ بھیرو کے؟ انہیں تو اتنی دکان کی ہائے ہائے پڑی ہوئی ہے۔ کسی کے گھر سیند کیوں نہیں مارتے۔ جلدی سے دھنوان ہو جاؤ گے۔

بھیرو: سیند مارو تم، یہاں دودھ میں پانی نہیں ملاتے۔

دیاگر: بھیرو! تم سچ مچ بڑے جھگڑالو ہو۔ جب تم کو ملائم بات کہنا نہیں آتا تو چپ کیوں نہیں رہتے؟ بہت باتیں کرنا عقل مندی کی نشانی نہیں بلکہ بے عقلی کی نشانی ہے۔

بھیرو: ٹھاکر جی کے بھوگ کے بہانہ سے روز چھاچھ پا جاتے ہونا، بجرنگی کی جے نہ مناؤ گے۔

نایک رام: پٹھا بات بے لاگ کہتا ہے کہ ایک بار سن کر پھر کسی کی زبان نہیں کھلتی۔

ٹھاکردین: اب بھجن بھاؤ ہو چکا۔ ڈھول مجیرا اٹھا کر رکھ دو۔

دیاگر: تم کل سے یہاں نہ آیا کرو۔ بھیرو!

بھیرو: کیوں نہ آیا کریں؟ مندر تمہارا بنوایا ہوا نہیں ہے۔ مندر بھگوان کا ہے۔ تم کسی کو بھگوان کے دربار میں آنے سے روک دو گے؟

نایک رام: لو بابا جی! اور لو گے؟ ابھی پیٹ بھرا کہ نہیں؟

جگدھر: بابا جی! تمہیں غم کھا جاؤ۔ اس سے سادھو سنتوں کی مہما نہیں گھٹتی۔ بھیرو! سادھو سنتوں کی بات کا تمہیں برا نہ ماننا چاہیے۔

بھیرو: تم خوشامد کرو کیونکہ خوشامد کی روٹیاں کھاتے ہو۔ یہاں کسی کے دبیل نہیں ہیں۔

بجرنگی: لے اب چپ ہی رہنا۔ بھیرو! بہت ہو چکا۔ چھوٹا منہ بڑی بات۔

نایک رام: تو بھیرو کو دھمکاتے کیا ہو؟ کیا کوئی بھگوڑا سمجھ لیا ہے تم نے، جب دنگل مارے تھے تب مارے تھے، اب تم وہ نہیں ہو۔ آج کل تو بھیرو کی دوہائی ہے۔

بھیرو نایک رام کے طنزیہ مذاق پر جھلایا نہیں، ہنس پڑا۔ طنز میں زہر نہیں، رس تھا، سنکھیا مر کر رس ہو جاتا ہے۔

بھیروں کا ہنسنا تھا کہ لوگوں نے اپنے اپنے ساز سنبھالے اور بھجن ہونے لگا۔ سورداس کی سریلی تان خلا میں یوں ناچتی ہوئی معلوم ہوتی تھی جیسے پانی کے اندر روشنی کی شعاعیں ناچتی ہیں۔

بھجن

جھینی جھینی بینی چدریا

کاہے کا تانا کاہے کی بھرنی کون تارے بینی چدریا

انگلا پنگلا تانا بھرنی سکھمن تارے بینی چدریا

آٹھ کنول دل چرکھا ڈولے پانچ تتو گن تینی چدریا

سائیں کو سیت ماس دس لاگے ٹھوک ٹھوک کے بینی چدریا

سو چادر سر نر منی اوڑھیں اوڑھ کے میلی کینی چدریا

داس، کبیر، جتن سے اوڑھی جیوں کی تیوں دھر دینی چدریا

باتوں میں رات زیادہ گزر چکی تھی۔ گیارہ کا گھنٹہ سنائی دیا۔ لوگوں نے ڈھول مجیرے سمیٹ دیئے۔ مجلس برخاست ہوئی۔ سورداس نے مٹھو کو پھر گود میں اٹھایا اور اپنی جھونپڑی میں لاکر ٹاٹ پر سلا دیا۔ آپ زمین پر لیٹ رہا۔

3

مسٹر جان سیوک کا بنگلہ سگرا میں تھا۔ ان کے والد مسٹر ایشور سیوک نے فوجی محکمہ سے پنشن پانے کے بعد وہیں مکان بنوالیا تھا اور اب تک اس کے مالک تھے۔ اس کے آگے ان کے آباؤ اجداد کا پتہ نہیں چلتا اور نہ ہی اس کے جاننے کی کوئی خاص ضرورت ہے۔ ہاں یہ امر البتہ یقینی ہے کہ حضرت عیسیٰ پر اعتقاد لانے کا شرف ایشور سیوک کو نہیں بلکہ ان کے والد کو ملا تھا۔ ایشور سیوک کو اب بھی اپنا عہد طفولیت کچھ کچھ یاد آ جاتا تھا۔ جب وہ اپنی والدہ کے ساتھ گنگا اشنان کو جایا کرتے تھے۔ ماں کی لاش جلانے کی یاد بھی ابھی نہیں بھولی تھی۔ والدہ کے انتقال کے بعد ان کو یاد آتا تھا کہ میرے گھر میں کئی فوجی سپاہی گھس آئے تھے اور میرے والد کو پکڑ کر لے گئے تھے۔ اس کے بعد یادداشت کا سلسلہ شکست ہو جاتا تھا۔ ہاں ان کے گورے رنگ و شباہت سے اس بات کا بآسانی اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ عالی نسب تھے اور شاید اسی صوبہ میں ان کی قدیم جائے رہائش بھی تھی۔

یہ بنگلہ جس زمانہ میں بنا تھا، اس وقت سگرا میں زمین کی اتنی قدر نہ تھی۔ وسیع احاطہ میں پھول پتوں کی جگہ سبزی ترکاری اور پھلوں کے درخت تھے۔ یہاں تک کہ گملوں میں بھی نفع کو نفاست پر ترجیح دی گئی تھی۔ بیلیں، پرول، کندرو، سیم وغیرہ کی تھیں۔ ایک کنارے کھپریل کا برآمدہ تھا، جس میں گائیں بھینسیں پلی ہوئی تھیں۔ دوسری طرف اصطبل تھا۔ موٹر کا شوق نہ باپ کو تھا، نہ بیٹے کو۔ فٹن رکھنے میں کفایت بھی تھی اور آسائش بھی۔ ایشور سیوک کو تو موٹروں سے چڑ تھی۔ ان کے شور سے ان کی شانتی میں خلل واقع ہوتا تھا۔ فٹن کا گھوڑا احاطہ میں ایک لمبی رسی باندھ کر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اصطبل سے باغ کے لیے کھاد نکل آتی تھی اور صرف ایک سائیس سے کام چل جاتا تھا۔ ایشور سیوک کو خانہ داری کے انتظامات میں خاص ملکہ تھا اور ایسے کاموں میں ان کا حوصلہ ذرا بھی پست نہ ہوتا تھا۔ ان کی آرام کرسی بنگلے کے سائبان میں پڑی رہتی تھی۔ اس پر صبح سے شام تک بیٹھے جان سیوک کی فضول خرچی اور گھر کی بربادی کا رونا رویا کرتے تھے۔ وہ اب بھی باقاعدگی کے ساتھ اپنے لڑکے کو گھنٹہ دو گھنٹہ نصیحت کیا کرتے تھے اور شاید اسی نصیحت کا پھل تھا کہ جان سیوک کی دولت اور عزت روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ کفایت ان کی زندگی کا اصل اصول تھا اور اس کی خلاف ورزی ان کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ وہ اپنے گھر میں فضول خرچی مطلق نہ دیکھ سکتے تھے۔ خواہ روپیہ کسی مہمان ہی کا کیوں نہ ہو۔ مذہب کے ایسے پکے تھے کہ بلاناغہ دونوں وقت گرجا جاتے۔ ان کی اپنی الگ سواری تھی۔ اس تامجان کو ایک آدمی کھینچ کر گرجا کے دروازہ تک پہنچا آیا کرتا تھا۔ وہاں پہنچ کر ایشور سیوک اس کو فوراً ہی گھر واپس کر دیتے تھے۔ گرجا کے احاطہ میں تامجان کی حفاظت کے لیے کسی آدمی کو بیٹھے رہنے کی ضرورت نہ تھی۔ گھر آ کر وہ اور کوئی کام کر سکتا تھا۔ اکثر وہ واپس کرتے وقت اس کو کام بھی بتلا دیا کرتے تھے۔ دو گھنٹہ بعد وہ آدمی جا کر ان کو واپس کھینچ لاتا تھا۔ لوٹتے ہوئے وہ حتیٰ الامکان خالی ہاتھ نہ لوٹتے تھے۔ کبھی دو چار پپیتے مل جاتے۔ کبھی نارنگیاں، کبھی سیر آدھ سیر ملوئے۔ پادری ان کا احترام کرتا تھا۔ اس کی ساری امت میں اتنا مسن اور دوسرا

شخص نہ تھا۔ اس پر دھرم کا اتنا شیدائی۔ وہ اس کے مواعظ کو جتنی محویت اور توجہ سے سنتے تھے اور جتنی عقیدت سے وہاں کے بھجنوں میں شریک ہوتے تھے وہ معیار کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔

صبح کا وقت تھا۔ یہ لوگ ناشتا کی میز پر سے اٹھے۔ مسٹر جان سیوک نے گاڑی تیار کرنے کا حکم دیا۔ ایشور سیوک نے اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے چائے کا ایک پیالہ پیا تھا اور جھنجھلا رہے تھے کہ اس میں شکر کیوں اتنی جھونک دی گئی ہے۔ شکر کوئی نعمت تو نہیں کہ اچھر کر کھائی جائے ایک تو مشکل سے ہضم ہوتی ہے۔ دوسرے اتنی مہنگی، اس کی نصف شکر چائے کو مزے دار بنانے کے لیے کافی تھی۔ انفاز ے سے کام کرنا چاہیے۔ شکر کوئی پیٹ بھرنے کی چیز نہیں ہے۔ سینکڑوں بار کہہ چکا ہوں میری سنتا کون ہے؟ مجھے تو سب نے کتا سمجھ رکھا ہے۔ اس کے بھونکنے کی پرواہ کس کو ہے؟

مسز سیوک نے مذہبیت اور کفایت کا سبق خوب یاد کر رکھا تھا۔ ندامت کا اظہار کرتی ہوئی بولیں۔ ’’پاپا! معاف کیجیے آج صوفی نے شکر زیادہ ڈال دی تھی۔ کل سے آپ کو یہ شکایت نہ رہے گی۔ مگر کروں کیا؟ یہاں تو ہلکی چائے کسی کو اچھی نہیں لگتی‘‘ ایشور سیوک نے بے اعتنائی سے کہا ’’مجھے کیا کرنا ہے۔ کچھ قیامت تک تو بیٹھا رہوں گا نہیں، مگر گھر کی بربادی کی یہی علامتیں ہیں۔ یسوع مجھے اپنے دامن میں چھپا!‘‘

مسز سیوک: پاپا! میں اپنی بھول مانتی ہوں۔ مجھے اندازہ سے شکر نکال کر دینی چاہیے تھی۔

ایشور سیوک: ارے تو آج یہ کوئی نئی بات تھوڑا ہی ہے۔ روز تو یہی رونا رہتا ہے، جان سمجھتا ہے میں گھر کا مالک ہوں۔ روپے کماتا ہوں، خرچ کیوں نہ کروں؟ مگر روپیہ کمانا ایک بات ہے اور اس کا مناسب صرف دوسری بات۔ ہوشیار آدمی اس کو کہتے ہیں جو دولت مناسب صرف کرے۔ ادھر لا کر ادھر خرچ کر دیا تو کیا فائدہ؟ اس سے تو نہ لانا ہی اچھا۔ میں سمجھتا ہی رہا مگر اتنی کلاں راس کا گھوڑا لے لیا۔ اس کی کیا ضرورت تھی۔ تمہیں گھر

دوڑ نہیں کرنا ہے۔ ایک ٹٹو سے کام چل سکتا تھا۔ یہی نا کہ اوروں کے گھوڑے آگے نکل جاتے تو اس میں تمہاری کیا شیخی ماری جاتی تھی۔ کہیں دور جانا نہیں پڑتا۔ ٹٹو ہوتا تو چھ سیر کی جگہ دو سیر دانہ کھاتا۔ آخر چار سیر دانہ فضول ہی جاتا ہے نا؟ مگر میری کون سنتا ہے۔ یسوع! مجھے اپنے دامن میں چھپا! صوفی! یہاں آ بیٹی! کلام پاک سنا!

صوفیہ پر بھوسیوک کے کمرہ میں بیٹھی ہوئی مسیح کے اس ارشاد پر اپنا شبہ ظاہر کر رہی تھی کہ غریبوں کے لیے آسمان کی بادشاہت ہے اور امیروں کا بہشت میں جانا اسی قدر غیر ممکن ہے جتنا کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے میں جانا۔ اس کے دل میں سوال پیدا ہو رہا تھا کہ کیا غریب ہونا بجائے خود کوئی ثواب ہے اور امیر ہونا بجائے خود کوئی گناہ؟ اس کی عقل سلیم اس کلام کی سچائی کو قبول نہ کرتی تھی۔ کیا مسیح نے صرف اپنے بھگتوں کو خوش کرنے ہی کے لیے دولت کی اس قدر ہجو کی ہے؟ تاریخ بتلا رہی ہے کہ اوائل میں صرف غریب، رنجیدہ، مفلس اور جماعت سے خارج شدہ آدمیوں نے ہی مسیح کے دامن میں پناہ لی تھی۔ اس لیے تو انہوں نے دولت کی اتنی بےوقعتی نہیں کی تھی؟ کتنے ہی غریب ایسے ہیں جو سراپا بے قاعدگی اور بداخلاقی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ شاید ان کی بدکاری ہی ان کی مفلسی کا سبب ہے۔ کیا صرف مفلسی ان کے تمام گناہوں کا کنارہ کر دے گی؟ کتنے ہی دولت مند لوگ ہیں جن کے دل آئینہ کی طرف صاف ہیں، کیا محض ان کی ثروت ان کی تمام نیکیوں کو زائل کر دے گی؟

صوفیہ سچ جھوٹ کی جانچ میں ہمیشہ مصروف رہتی تھی۔ مذہبی اصولوں کو عقل کی کسوٹی پر کسنا اس کی فطرت میں داخل تھا اور جب تک عقل، دلایل کے ذریعہ قبول نہ کرے، اس وقت تک وہ صرف مذہبی کتب کی بنا پر کسی اصول کو ماننے کے لیے تیار نہ تھی۔ جب اس کے دل میں کوئی شک پیدا ہوتا تو اپنے بھائی پر بھوسیوک کی مدد سے اس کی دفعیہ کی کوشش کرتی۔

صوفیہ: میں اس بارے میں بہت دیر سے غور کر رہی ہوں، پر کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

حضرت مسیح نے مفلسی کو اس قدر اہمیت کیوں دی؟ اور دولت و ثروت کو کیوں قابل نفریں قرار دیا؟

پربھوسیوک: جا کر مسیح سے پوچھو

صوفیہ: تم کیا سمجھتے ہو؟

پربھوسیوک: میں کچھ نہیں سمجھتا اور نہ کچھ سمجھنا چاہتا ہوں۔ کھانا، سونا اور کھیلنا یہی انسانی زندگی کے تین اصول ہیں۔ ان کے سوا سب گورکھ دھندا ہے۔ میں مذہب کو عقل سے بالکل الگ سمجھتا ہوں۔ مذہب کے تولنے کے لیے عقل اتنی ہی بیکار ہے جتنا کہ بینگن تولنے کے لیے سنار کا کانٹا۔ مذہب مذہب ہے اور عقل عقل، یا تو مذہب کی روشنی اتنی تیز ہے کہ عقل کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں یا پھر اس میں ایسی تاریکی ہے کہ عقل کو کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ ان جھگڑوں میں بے فائدہ سر کھپاتی ہو۔ سنا! آج پاپا چلتے چلتے کیا کہہ گئے؟

صوفیہ: نہیں میرا دھیان ادھر نہ تھا۔

پربھوسیوک: یہی کہ مشینوں کے لیے جلد آرڈر دے دو۔ اس زمین کو لینے کا انہوں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ اس کا موقع بہت پسند آیا۔ چاہتے ہیں کہ جلد سے جلد بنیاد پڑ جائے، لیکن میرا جی اس کام سے گھبراتا ہے۔ میں نے یہ کاروبار سیکھا تو سچ پوچھو تو میرا جی وہاں بھی نہ لگتا تھا۔ اپنا وقت فلسفہ ادب اور اشعار کے مطالعہ میں صرف کرتا تھا۔

وہاں کے نامی گرامی عالموں اور مصنفوں سے بات چیت کرنے میں جو مسرت حاصل ہوتی تھی، وہ کارخانہ میں کہاں نصیب تھی۔ سچ پوچھو تو میں اس لیے وہاں گیا بھی تھا۔ اب عجیب کشمکش میں پڑا ہوں۔ اگر اس کام میں ہاتھ نہیں لگاتا تو پاپا کی دل شکنی ہو گی۔ وہ سمجھیں گے کہ میرے ہزاروں روپیوں پر پانی پھر گیا۔ شاید میری صورت سے نفرت کرنے لگیں۔ کام شروع کرتا ہوں تو خوف ہوتا ہے کہ کہیں میری بیدلی سے نفع کے بجائے نقصان نہ ہو۔ مجھے اس کام میں ذرا بھی دلچسپی نہیں۔ مجھے تو رہنے کو ایک جھونپڑی چاہیے اور فلسفہ ادب کا ایک عمدہ کتب خانہ۔ اس کے سوا مجھے اور کسی چیز کی خواہش نہیں۔ یہ

لو دادا کو تمہاری یاد آ گئی۔ جاؤ! نہیں تو یہاں آ پہنچیں گے اور فضول کی بکواس میں گھنٹوں وقت خراب کر دیں گے۔

صوفیہ: یہ مصیبت میرے سر بری پڑی ہے۔ جہاں کچھ پڑھنے بیٹھی، ان کا بلاوا پہنچا آج کل پیدائش کا بیان پڑھوا رہے ہیں۔ مجھے ایک ایک لفظ پر شک پیدا ہوتا ہے۔ کچھ بولوں تو بگڑ جائیں گے۔ بالکل بیگار کرنی پڑتی ہے۔

مسز سیوک بیٹی کو بلانے آ رہی تھیں۔ آخری الفاظ ان کے کانوں میں پڑ گئے۔ تلملا گئیں آ کر بولیں ''بے شک کلام پاک پڑھنا بے کار ہے۔ مسیح کا نام لینا پاپ ہے۔ تجھے تو اس اندھے بھکاری کی باتوں میں مزہ آتا ہے۔ ہندوؤں کے گپوڑے پڑھنے میں تیرا جی لگتا ہے۔ کلام پاک تو تیرے لیے زہر ہے۔ خدا جانے تیرے دماغ میں یہ خبط کہاں سے سما گیا ہے۔ جب دیکھتی ہوں تجھے اپنے پاک مذہب کی برائی کرتے ہی دیکھتی ہوں۔ تو اپنے دل میں بھلے ہی سمجھ لے کہ کلام پاک بالکل فرضی و مصنوعی ہے لیکن اندھے کی آنکھوں میں اگر آفتاب کا نور نہ پہنچے تو یہ آفتاب کا قصور نہیں بلکہ اندھے کی آنکھوں ہی کا قصور ہے۔ آج تین چوتھائی دنیا جس مہاتما کے نام پر جان دیتی ہے۔ جس مہاتما کی امرت بانی، آج ساری دنیا کو زندگی بخش رہی ہے۔ اس سے اگر تیرا دل منحرف ہو رہا ہے تو یہ تیری نافہمی اور بدبختی ہے۔ خدا تیرے حال پر رحم کرے!''

صوفیہ: مہاتما عیسیٰ کی شان میں میرے منہ سے کوئی نامناسب بات کبھی نہ نکلی۔ میں انہیں دھرم تاگ اور نیک خیالی کا اوتار سمجھتی ہوں لیکن ان پر ایمان لانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عقیدت مندوں نے ان کے مواعظ میں جو ناواجب باتیں بھر دی ہیں یا ان کی ذات سے جو معجزے منسوب کر رکھے ہیں، ان پر بھی ایمان لاؤ اور یہ زیاتی کچھ حضرت مسیح کے ساتھ ہی نہیں کی گئی بلکہ دنیا کے سبھی مہاتماؤں کے ساتھ ایسا کیا گیا ہے۔

مسز سیوک: تجھے کلام پاک کے ہر لفظ پر ایمان لانا ہوگا ورنہ تو اپنا شمار حضرت مسیح کی بھیڑوں میں نہیں کر سکتی۔

صوفیہ: تو میں اپنے کو بدرجہ مجبوری ان کی امت کے باہر سمجھوں گی کیونکہ بائبل کے ہر لفظ پر ایمان لانا میرے لیے ناممکن ہے۔

مسز سیوک: تو کافر اور مردود ہے۔ حضرت مسیح تجھے کبھی معاف نہ کریں گے۔

صوفیہ: اگر مذہبی تنگ خیالی سے دور رہنے کے سبب یہ نام دیئے جاتے ہیں تو مجھے ان کے قبول کرنے میں کوئی عذر نہیں ہے۔

مسز سیوک سے اب ضبط نہ ہو سکا۔ ابھی تک انہوں نے اپنا قاتل وار نہ کیا تھا۔ مامتا ہاتھوں کو روکے ہوئے تھی لیکن صوفیہ کی گستاخانہ بحث نے بالآخر ان کے تحمل کا خاتمہ کر دیا۔ بولی ''حضرت مسیح سے منحرف ہونے والے کے لیے اس گھر میں جگہ نہیں ہے''

پربھوسیوک: ماما! آپ سخت ظلم کر رہی ہیں۔ صوفیہ یہ کب کہتی ہے کہ مجھے حضرت مسیح پر اعتقاد نہیں ہے۔

مسز سیوک: ہاں وہ یہی تو کہہ رہی ہے۔ تمہاری سمجھ کا پھیر ہے۔ کلام پاک پر ایمان نہ لانے کے اور کیا معنے ہو سکتے ہیں؟ اس کو حضرت یسوع کے معجزوں پر شبہ اور ان کے اخلاقی مواعظ پر شک ہے۔ یہ ان کے کفارہ کی حقیقت کو نہیں مانتی۔ ان کے پاک احکامات کو تسلیم نہیں کرتی۔

پربھوسیوک: میں اس نے کو حضرت یسوع کے احکامات کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔

صوفیہ: میں مذہبی معاملات میں اپنے ضمیر کے سوا اور کسی کے احکامات کو نہیں مانتی۔

مسز سیوک: میں تجھ کو اولاد نہیں سمجھتی اور تیری صورت نہیں دیکھنا چاہتی۔

یہ کہہ کر وہ صوفیہ کے کمرہ میں گھس گئی اور اس کی میز پر سے بودھ مذہب اور ویدانت فلاسفی کی کئی کتابیں اٹھا کر باہر برآمدہ میں پھینک دیں۔ اسی جوش میں انہیں پیروں سے کچلا اور پھر جا کر ایشور سیوک سے بولیں۔ ''پاپا! آپ صوفی کو ناحق بلا رہے ہیں۔ وہ حضرت مسیح کی ہجو کر رہی ہے۔''

مسٹر ایشور سیوک ایسا چونکے گویا بدن پر آگ کی چنگاری گر پڑی ہو اور اپنی بے نور آنکھوں کو پھاڑ کر بولے: ''کیا کہا صوفی حضرت مسیح کی ہجو کر رہی ہے؟ صوفی؟''

مسز سیوک: ہاں ہاں صوفی! کہتی ہے مجھے ان کے معجزوں، ان کے مواعظ اور احکامات پر اعتقاد نہیں ہے۔

ایشور سیوک: (ٹھنڈی سانس کھینچ کر) یسوع! مجھے اپنے دامن میں چھپا! اپنی گمراہ بھیڑوں کو راہ راست پر لا! کہاں ہے صوفی! مجھے اس کے پاس لے چلو! میرے ہاتھ پکڑ کر اٹھاؤ۔ خدا میری بیٹی کے دل کو ایمان کے نور سے منور کر! میں اس کے پیروں پر گروں گا۔ اس سے منتیں کروں گا۔ اس کو عاجزی سے سمجھاوں گا۔ مجھے اس کے پاس لے چلو!

مسز سیوک: میں سب کچھ کر کے ہار گئی۔ اس پر خدا کا قہر ہے۔ میں اس کی صورت نہیں دیکھنا چاہتی۔

ایشور سیوک: بیٹی! ایسی باتیں نہ کرو وہ میرے گوشت کا گوشت، میرے خون کا خون، میری جان کی جان ہے! میں اسے کلیجہ سے لگاؤں گا۔ یسوع نے کافروں کو سینہ سے لگایا تھا۔ سیاہ کاروں کو اپنے دامن میں پناہ دی تھی۔ وہ میری صوفیہ پر ضرور رحم کرے گا۔ یسوع مجھے اپنے دامن میں چھپا!

جب مسز سیوک نے اب بھی سہارا نہ دیا تو ایشور سیوک لکڑی کے سہارے اٹھے اور لاٹھی ٹیکتے ہوئے صوفیہ کے کمرہ کے دروازہ پر آ کر بولے ''بیٹی صوفی! کہاں ہے؟ ادھر آ بیٹی! تجھے گلے سے لگاؤں۔ ہمارا یسوع خدا کا دولارا بیٹا تھا۔ غریبوں کا مددگار، کمزوروں کا محافظ، مفلسوں کا دوست، ڈوبتوں کا سہارا، گناہ گاروں کا شافع، دکھیوں کا بیڑا پار کرنے والا۔ بیٹی! ایسا اور کون سا نبی ہے جس کا دامن اتنا وسیع ہو جس کی گود میں دنیا کے سارے گناہوں، ساری برائیوں کے لیے جگہ ہو؟ وہی ایک ایسا نبی ہے جس نے بدکاروں کو، کافروں کو، گناہ گاروں کو نجات کا مژدہ دیا۔ نہیں تو ہم جیسے ناپاک لوگوں کے لیے نجات کہاں تھی؟ ہم کو بچا لینے والا کون تھا؟''

یہ کہتے کہتے انہوں نے صوفیہ کو گلے سے لگا لیا۔ ماں کے سخت الفاظ نے اس کے ضعیف غصہ کو تیز کر دیا تھا۔ وہ اپنے کمرہ میں آ کر رو رہی تھی۔ طبیعت بار بار پریشان ہو جاتی تھی۔ سوچتی تھی ابھی اسی وقت اس گھر سے نکل جاؤں۔ کیا اس وسیع دنیا میں میرے لیے جگہ نہیں ہے؟ میں کام کر سکتی ہوں۔ اپنا بوجھ آپ سنبھال سکتی ہوں۔ ضمیر کی آزادی کا خون کر کے اگر مجھ کو تفکرات زندگی سے فراغت ملی تو کیا میرا ضمیر ایسی حقیر شے نہیں ہے کہ پیٹ کے لیے اس کا خون کر دیا جائے۔ پربھو سیوک کو اپنی بہن سے ہمدردی تھی۔ مذہب پر ان کو اس کے کہیں کم اعتقاد تھا، لیکن وہ اپنی آزاد خیالی کو اپنے ہی دل تک محدود رکھتے تھے۔ گرجا چلے جاتے تھے۔ گھر کی روزانہ دعاؤں میں شریک ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ مذہبی بھجن بھی گا لیتے تھے۔ وہ مذہب کو سنجیدہ خیالی کے دائرہ سے خارج سمجھتے تھے۔ وہ گرجا میں بھی اسی خیال سے جاتے جس خیال سے کہ تھیٹر دیکھنے۔ انہوں نے کمرہ سے جھانک کر دیکھا کہ کہیں ماما تو نہیں دیکھ رہی ہیں کہ مجھ پر ان کا قہر ابھی نازل ہو جائے۔ پھر چپکے سے صوفیہ کے پاس آئے اور بولے ''صوفی! کیوں نادان بنتی ہو۔ سانپ کے منہ میں انگلی ڈالنا کون سی عقل مندی ہے؟ دل میں جو چاہے خیال کرو۔ جن باتوں کو جی چاہے مانو۔ پر اس طرح ڈھنڈورا پیٹنے سے کیا فائدہ؟ جماعت میں نکو بننے کی کیا ضرورت؟ کون تمہارے دل کے اندر دیکھنے جاتا ہے؟''

صوفیہ نے بھائی کو حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا ''میں مذہب کے معاملہ میں قول و فعل کو یکساں رکھنا چاہتی ہوں۔ چاہتی ہوں دونوں سے ایک ہی راگ نکلے میرے لیے'' گندم نمائی جو فروشی ناممکن ہے۔ ضمیر کی آزادی کے لیے میں دنیا بھر کی تکلیفیں برداشت کرنے کو تیار ہوں۔ اگر میرے لیے اس گھر میں جگہ نہیں ہے، تو خدا کی خلق کی ہوئی وسیع دنیا تو ہے۔ کہیں بھی اپنا گزارہ کر سکتی ہوں۔ میں ساری تکلیفیں سہہ لوں گی۔ رسوائی کا مجھے ذرا بھی خیال نہیں ہے۔ مگر اپنی نگاہوں میں گر کر میں زندہ نہیں رہ سکتی۔ اگر یہی مان لوں کہ میرے لیے چاروں طرف دروازے بند ہیں تو بھی میں اپنے ضمیر کا سودا

کرنے کی بہ نسبت بھوکوں مر جانا کہیں بہتر خیال کرتی ہوں

پربھوسیوک: دنیا اس سے کہیں زیادہ تنگ ہے جتنا تم خیال کرتی ہو۔

صوفیہ: قبر کے لیے تو جگہ نکل ہی آئے گی!

یکایک ایشور سیوک نے جا کر اس کو سینہ سے لگالیا اور اپنے عقیدت مندانہ آنسوؤں سے اس کی تفتہ دلی کو مٹانے کی کوشش کرنے لگے۔ صوفیہ کو ان کی خوش اعتقادی پر رحم آ گیا۔ کون ایسا بے رحم ہے جو بھولے بھالے بچے کے اسپ چوبین کا مضحکہ اڑا کر اس کا دل دکھائے۔ اس کے خوب مسرت کو پریشان کر دے؟

صوفیہ نے کہا: دادا! آپ آ کر کرسی پر بیٹھ جائیں۔ کھڑے کھڑے آپ کو تکلیف ہوتی ہے۔

ایشور سیوک: جب تک تو اپنی زبان سے نہ کہے گی کہ میں یسوع پر اعتقاد رکھتی ہوں، تب تک میں تیرے دروازہ پر اسی طرح فقیروں جیسا کھڑا رہوں گا۔

صوفیہ: دادا میں نے یہ کبھی نہیں کہا کہ میں یسوع پر اعتقاد نہیں رکھتی ہوں۔ میں انہیں ایک بہت بڑا قابل تقلید بزرگ اور عفو و رحم کا اوتار سمجھتی ہوں اور سمجھتی رہوں گی۔

ایشور سیوک نے صوفیہ کے رخساروں کو بوسہ دے کر کہا ''بس میرا دل مطمئن ہو گیا یسوع تجھے اپنے دامن میں لے۔ اب میں بیٹھتا ہوں۔ مجھ کو کلام پاک سنا! میرے کانوں کو یسوع کے کلمات سے پاک بنا؟''

صوفیہ انکار نہ کر سکی۔ پیدائش کا ایک باب کھول کر پڑھنے لگی۔ ایشور سیوک آنکھیں بند کر کے کرسی پر بیٹھ گئے اور ہمہ تن گوش ہو کر سننے لگے مسز سیوک نے یہ نظارہ دیکھا اور فاتحانہ انداز سے مسکراتی ہوئی چلی گئیں۔

یہ مسئلہ تو حل ہو گیا لیکن ایشور سیوک کے مرہم سے صوفیہ کے دل کا ناسور نہ اچھا ہو سکتا تھا۔ آئے دن اس کے دل میں مذہبی شکوک پیدا ہوتے رہتے تھے اور اسے اپنے گھر میں رہنا روز بروز زیادہ نا قابل برداشت ہوتا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ پربھوسیوک کی ہمدردی بھی کم

ہونے لگی۔ مسٹر جان سیوک کو اپنے تجارتی مشاغل سے اتنی فرصت ہی نہ ملتی تھی کہ وہ صوفیہ کی دماغی پریشانیوں کو رفع کرتے۔ مسز سیوک کامل خودمختاری سے اس پر حکومت کرتی تھی۔ صوفیہ کے لیے سخت ترین آزمائش کا موقع وہ ہوتا تھا جب وہ ایشور سیوک کو بائبل پڑھ کر سناتی تھی۔ اس آزمائش سے بچنے کے لیے وہ ہر روز بہانے ڈھونڈتی رہتی تھی۔ پس اس کو اپنی مصنوعی زندگی سے نفرت ہوتی جاتی تھی۔ اس کا دل بار بار تقاضا کرتا کہ گھر سے کہیں نکل جائے اور آزادی کے ساتھ حق و باطل کی تحقیق میں مصرف ہو لیکن اس خواہش وک عملی میدان میں قدم رکھتے ہوئے ہچک جانا پڑتا تھا۔ پہلے پربھوسیوک سے اپنے شکوک کا اظہار کر کے وہ مطمئن ہو جایا کرتی تھی مگر جوں جوں ان کی بے رخی بڑھنے لگی، صوفیہ کے دل سے بھی ان کی عزت اور محبت زائل ہونے لگی۔ اس کے دل میں خیال پیدا ہو گیا کہ پربھوسیوک کا دل صرف آسائش اور آرام طلبی کا غلام ہے جس کا اصولوں سے کوئی علاقہ نہیں۔ یہاں تک کہ ان کے اشعار بھی جنہیں وہ پہلے بڑے شوق سے سنا کرتی تھی، اب اس کو محض فرضی باتوں سے مملو معلوم ہوتے تھے۔ وہ اکثر ٹال دیا کرتی کہ میرے سر میں درد ہے۔ سننے کو جی نہیں چاہتا۔ اپنے دل میں کہتی کہ ان کو ایسے پاک جذبات و خیالات کو قلمبند کرنے کا کیا حق ہے جن کا اظہار دلی ایجاب اور تجربہ پر مبنی نہ ہو۔

ایک روز جب گھر سے سب لوگ گرجا گھر جانے لگے تو صوفیہ نے دردسر کا بہانہ کیا۔ اب تک وہ شکوک کے باوجود بھی گرجا چلی جایا کرتی تھی۔ پربھوسیوک اس کے دل کی بات تاڑ گئے۔ بولے ”صوفی! گرجا جانے میں تمہیں کیا عذر ہے؟ وہاں جا کر آدھ گھنٹہ خاموش بیٹھے رہنا کوئی ایسا مشکل کام نہیں۔“

پربھوسیوک بڑے شوق سے گرجے جایا کرتے تھے۔ وہاں انہیں ریا و نمود، ڈھونگ اور ڈھکوسلہ کی فلسفیانہ تحقیقات کرنے اور گنز گوئیوں کے لیے مسالہ جمع کرنے کا موقع خوب ملتا تھا۔ صوفیہ کے لیے عبادت کھیل کی چیز نہ تھی بلکہ تسکین و آسودگی کی بولی ”تمہارے لیے آسان ہے مگر میرے لیے مشکل“

پربھوسیوک: کیوں اپنی جان وبال میں ڈالتی ہو؟ ماما کے مزاج سے تو خوب واقف ہو۔

صوفیہ: میں تم سے رائے نہیں طلب کرتی۔ اپنے کاموں کی ذمہ داری اپنے اوپر لینے کو تیار ہوں۔

مسز سیوک نے آ کر پوچھا: صوفی! کیا سر میں اتنا درد ہے کہ گرجا تک نہیں جا سکتیں۔

صوفیہ: جا کیوں نہیں سکتی۔ پر جانا نہیں چاہتی

مسز سیوک: کیوں؟

صوفیہ: میری طبیعت، میں نے گرجا جانے کا عہد نہیں کر رکھا ہے؟

مسز سیوک: کیا تو چاہتی ہے کہ ہم کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں؟

صوفیہ: ہرگز نہیں میں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ آپ مجھے گرجا جانے کے لیے مجبور نہ کریں

ایشور سیوک پہلے ہی اپنے تامجان پر بیٹھ کر چل دیئے تھے۔ جان سیوک نے آ کر صرف اتنا پوچھا "صوفی! کیا سر میں زیادہ درد ہے؟ میں ادھر سے کوئی دوا لیتا آؤں گا۔ ذرا پڑھنا کم کر دو اور روز گھومنے جایا کرو"

یہ کہہ کر پربھوسیوک کے ساتھ فٹن پر جا بیٹھے، لیکن مسز سیوک اتنی آسانی سے اس کا گلا چھوڑنے والی نہ تھیں بولیں "تجھے یسوع کے نام سے کیوں اتنی نفرت ہے؟"

صوفیہ: میں ان پر دل سے اعتقاد رکھتی ہوں

مسز سیوک: تو جھوٹ بولتی ہے

صوفیہ: اگر دل میں اعتقاد نہ ہوتا تو زبان سے ہرگز نہ کہتی۔

مسز سیوک: تو یسوع کو اپنا نجات دہندہ سمجھتی ہے۔

صوفیہ: ہرگز نہیں میرا عقیدہ ہے کہ میری نجات اگر ہو سکتی ہے تو میرے اعمال کے ذریعے

مسز سیوک: تیرے اعمال سے تیرا منہ سیاہ ہوگا۔ تیری نجات نہ ہوگی۔

یہ کہہ کر مسز سیوک بھی فٹن پر جا بیٹھیں۔ شام ہو گئی تھی۔ سڑک پر عیسائیوں کے دل کے دل کوئی اوورکوٹ پہنے، کوئی ماگھ کی سردی سے سکڑے ہوئے خوش خوش گرجے چلے جا رہے تھے۔ لیکن صوفیہ کو آفتاب کی کمزور کرنیں بھی نا قابل برداشت ہو رہی تھیں۔ وہ ایک ٹھنڈی سانس کھینچ کر بیٹھ گئی "تیرے اعمال سے تیرا منہ سیاہ ہوگا" یہ الفاظ اس کے دل میں نشتر کی طرح چبھتے تھے۔ سوچنے لگی۔ میری تن پروری کی یہی مناسب سزا ہے۔ میں صرف روٹیوں کے لیے اپنے ضمیر کا خون کر رہی ہیں۔ اتنی حقارت اور ذلت برداشت کر رہی ہوں۔ اس گھر میں کون میرا ہمدرد ہے۔ کون ہے جو میرے مرنے کی خبر پا کر آنسو کی چار بوندیں گرا دے؟ شاید میرے مرنے سے لوگوں کو خوشی ہو۔ میں ان کی نظروں میں اتنا گر گئی ہوں۔ ایسی زندگی پر لعنت ہے۔ میں نے دیکھے ہیں۔ ہندو گھروں میں مختلف عقائد کے لوگ کتنی محبت سے رہتے ہیں۔ باپ سناتنی ہے تو بیٹا آریہ سماجی۔ شوہر برہمو سماج میں ہے تو بیوی بت پرستوں میں۔ سبھی اپنے اپنے عقائد پر عامل ہوتے ہیں۔ کوئی کسی سے نہیں بولتا۔ ہمارے یہاں آتما کچلی جاتی ہے پھر بھی یہ دعوی ہے کہ ہماری تعلیم وتہذیب آزاد خیالی کے معاون ہے! ہیں تو ہمارے یہاں بھی وسیع الخیال لوگ۔ پربھو سیوک ہی ان کی ایک مثال ہے لیکن ان کی وسیع الخیالی دراصل نافہمی ہے۔ ایسے وسیع الخیال آدمیوں سے تو تنگ خیال ہی اچھے۔ ان میں کچھ یقین کا مادہ تو ہے۔ بالکل بروپئے تو نہیں ہیں۔ آخر ماما اپنے دل میں کیا سمجھتی ہیں کہ بات بات پر اپنے سخت کلامی کے تیروں سے مجھے چھید نے لگتی ہیں۔ ان کے دل میں یہی خیال ہوگا کہ اس کا کہیں اور ٹھکانا نہیں ہے۔ کوئی اس کا پوچھنے والا نہیں ہے۔ میں انہیں دکھا دوں گی کہ میں اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکتی ہوں۔ اب اس گھر میں رہنا نرک میں رہنا ہے۔ اس بے حیائی کی روٹیاں کھانے سے بھوکوں مر جانا بہتر ہے۔ بلا سے، لوگ ہنسیں گے، میں آزاد تو ہو جاؤں گی۔ کسی کے طعنے تو نہ سننے پڑیں گے۔

صوفیہ اٹھی اور کسی مقام کو تجویز کیے بغیر ہی احاطہ سے باہر نکل آئی۔ اس گھر کی ہوا اب اس کو ناگوار معلوم ہوتی تھی۔ وہ آگے بڑھتی جاتی تھی، پر دل میں لگاتار سوال اٹھ رہا تھا کہ کہاں جاؤں۔ جب وہ گھنی آبادی میں پہنچی تو شہدوں نے اس پر ادھر ادھر سے آوازے کسنے شروع کیے۔ مگر وہ شرم سے سر نیچا کرنے کے بجائے ان کی آوازوں اور بری نگاہوں کا جواب نفرت آمیز نگاہوں سے دیتی چلی جاتی تھی۔ جیسے کوئی تیز پانی کی دھار پتھروں کو ٹھکراتی ہوئی آگے بہتی چلی جائے۔ یہاں تک کہ وہ اس کشادہ سڑک پر آ گئی جو دمسالو میدھ گھاٹ کی طرف جاتی ہے۔

اس کے جی میں آیا ذرا دریا کی سیر کرتی چلوں۔ شاید کسی بھلے آدمی سے ملاقات ہو جائے۔ جب تک دو چار آدمیوں سے شناسائی نہ ہو اور وہ میرا حال نہ جانیں، مجھ سے کون ہمدردی کا اظہار کرے گا۔ کون میرے دل کا حال جانتا ہے۔ ایسے رحم دل اشخاص اتفاق ہی سے ملتے ہیں۔ جب اپنے ماں باپ دشمن ہو رہے ہیں تو دوسرے سے بھلائی کی کیا امید۔

وہ اسی ناامیدی کی حالت میں چلی جا رہی تھی کہ یکایک اس کو ایک عالی شان محل نظر آیا جس کے سامنے بہت وسیع سبزہ زار تھا۔ اندر جانے کے لیے ایک اونچا پھاٹک تھا جس کے اوپر ایک سنہرا گنبد بنا ہوا تھا۔ اس گنبد میں نوبت بج رہی تھی۔ پھاٹک سے محل تک سرخی کی ایک روش تھی جس کے دونوں طرف بیلیں اور گلاب کی کیاریاں تھیں۔ سبزہ زار پر کتنے ہی مرد عورت بیٹھے ہوئے ماگھ کی سرد سرد ہوا کا لطف اٹھا رہے تھے۔ کوئی لیٹا ہوا تھا۔ کوئی تکیہ دار چوکیوں پر بیٹھا سگار پی رہا تھا۔

صوفیہ نے شہر میں ایسا پر فضا مقام نہ دیکھا تھا۔ اس کو تعجب ہوا کہ شہر کے درمیانی حصہ میں بھی ایسے دلکش مقامات موجود ہیں۔ وہ ایک چوکی پر بیٹھ گئی اور سوچنے لگی ”اب لوگ گرجا سے آ گئے ہوں گے۔ مجھے گھر میں نہ دیکھ کر چونکیں گے۔ تو ضرور سمجھ لیں گے۔ کہیں گھومنے گئی ہوگی۔ اگر رات بھر یہیں بیٹھی رہوں تو بھی وہاں کسی کو کچھ فکر نہ ہوگی۔ آرام

سے کھا پی کر سو جائیں گے۔ ہاں دادا کو ضرور دکھ ہوگا۔ وہ بھی محض اس لیے کہ انہیں بائبل پڑھ کر سنانے والا کوئی نہیں۔ ماما تو دل میں خوش ہوں گی کہ اچھا ہوا آنکھوں سے دور ہو گئی۔ میرا کسی سے تعارف نہیں۔ اسی سے کہا ہے کہ سب سے ملتے رہنا چاہیے۔ نہ جانے کب کس سے کام پڑ جائے۔ مجھے برسوں رہتے ہو گئے اور کسی سے راہ و رسم نہ پیدا کی۔ میرے ساتھ نینی تال میں یہاں کے کسی رئیس کی لڑکی پڑھتی تھی۔ بھلا سا نام تھا ہاں اندو مزاج میں کتنی نرمی تھی۔ بات بات سے محبت ٹپکی پڑتی تھی۔ ہم دونوں گلے میں باہیں ڈال کر ٹہلتی تھیں۔ وہاں کوئی لڑکی ایسی خوب صورت اور با اخلاق نہ تھی۔ میرے اور اس کے خیالات میں کتنی یکسانیت تھی۔ کہیں اس کا پتہ مل جاتا تو دس پانچ روز اسی کے یہاں مہمان ہو جاتی۔ اس کے والد کا اچھا سا نام تھا۔ ہاں یاد آ گیا۔ کنور بھرت سنگھ۔ پہلے یہ بات نہ سوجھی تھی ورنہ ایک کارڈ لکھ کر ڈال دیتی۔ مجھے بھول تو کیا گئی ہوگی۔ اتنی بے انس تو نہ معلوم ہوتی تھی۔ کم سے کم انسانی اخلاق کی پرکھ ہو جائے گی۔"

مجبوری میں ہمیں ان لوگوں کی یاد آتی ہے ن کی صورت بھی بھول چکی ہوتی ہے۔ پردیس میں اپنے محلّہ کا نائی یا کہار بھی مل جائے تو ہم اس کے گلے مل جاتے ہیں۔ چاہے دیس میں اس سے کبھی سیدھے منہ بات بھی نہ کی ہو۔

صوفیہ سوچ ہی رہی تھی کہ کس سے کنور بھرت سنگھ کا پتہ دریافت کروں۔ اسی اثناء میں محل کے سامنے والے پختہ چبوترہ پر فرش بچھ گیا۔ کئی آدمی ستار، بیلا، مردنگ لیے ہوئے آ بیٹھے اور ان سازوں کے ساتھ سر ملا کر کئی نوعمر لوگ ایک ہی لہجہ میں گانے لگے۔

پاک جنگ میں کبھی بھول کر صبر نہیں کھلونا ہو گا
بجلی کا ہو وار سروں پر نہیں مگر رونا ہو گا
دشمن سے بدلہ کا من میں بیج نہیں بونا ہو گا
گھر میں ان روئی دے کر پھر تجھے نہیں سونا ہو گا
دیش داغ کو خونیں جل سے خوش ہو کر دھونا ہو گا

دیش کاج کی بھاری گٹھڑی سر پر رکھ کر ڈھونا ہو گا
آنکھیں لال بھویں ٹیڑھی کر کرودھ نہیں کرنا ہو گا
بل بیدی پر تجھے خوشی سے چڑھ کر کٹ مرنا ہو گا
فانی ہے یہ جسم موت سے کبھی نہیں ڈرنا ہو گا
سچائی کی راہ چھوڑ کر پیر نہیں دھرنا ہو گا
ہو گی جیت ضرور دھرم کی یہی بھاؤ بھرنا ہو گا
ماتری بھوم کے لیے جگ میں جینا اور مرنا ہو گا

گانے میں نہ کشش تھی نہ لطافت، لیکن وہ طاقت وہ تحریک بھری ہوئی تھی جو ہم آہنگی کا خاصہ ہے۔ ایثار و ترقی کا مقدس پیغام وسیع خلاء میں ساکت آسمان میں اور صوفیہ کے غیر مطمئن دل میں گونجنے لگا۔ وہ ابھی تک مذہبی تحقیقات ہی میں مصروف رہتی تھی۔ قومی پیغام کے سننے کا موقع اسے کبھی نہ ملا تھا۔ شمع سے نور نکلتا ہے۔ اسی طرح صوفیہ کی روئیں روئیں سے وہی آواز نکل رہی تھی ''ماتری بھول کے لیے جگ میں جینا اور مرنا ہو گا!''

اس کے دل میں ایک ترنگ اٹھی کہ میں بھی جا کر گانے والوں کے ساتھ گانے لگتی۔ طرح طرح کے جذبات و خیالات پیدا ہونے لگے ''میں کسی دور دراز ملک میں جا کر ہند کی فریاد سناتی۔ یہیں کھڑی ہو کر کہہ دوں۔ میں اپنے کو ملکی خدمت کے لیے بھینٹ کرتی ہوں۔ اپنی زندگی کے مقصد پر ایک تقریر کرتی کہ ہم اپنی قسمت کا رونا رونے کے لیے اپنی تنزل پذیر حالت پر آنسو بہانے کے لیے نہیں بنائے گئے ہیں۔''

سماں بندھا ہوا تھا۔ صوفیہ کی آنکھوں کے سامنے اسی قسم کے جذبات کی تصویریں ناچتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔

ابھی نغمہ کی آواز گونج رہی تھی کہ اچانک اسی احاطہ کے اندر ایک کھپریل کے مکان میں آگ لگ گئی۔ جب تک لوگ ادھر دوڑے، آگ کے شعلے زیادہ بلند ہو گئے۔ سارا میدان جگمگا اٹھا۔ درخت اور پودے چمک دار روشنی کے سمندر میں نہا اٹھے۔ گانے والوں نے

فوراً اپنے اپنے ساز وہیں چھوڑے۔ دھوتیاں سمیٹ کر باندھیں۔ آستینیں چڑھائیں اور آگ بجھانے دوڑے۔ محل کے اندر سے اور بھی کتنے نوجوان نکل پڑے۔ کوئی کنوئیں سے پانی لانے دوڑا۔ کوئی آگ کے منہ میں گھس کر اندر کی چیزوں کو نکال نکال کر باہر پھینکنے لگا۔ لیکن کہیں وہ پریشانی، وہ گھبراہٹ، وہ سراسیمگی، وہ کہرام، وہ دوڑو دوڑو کا شو، وہ خود کچھ بھی نہ کرتے ہوئے دوسروں کو حکم دینے کا غل نہ تھا۔ جو ایسی آسمانی مصیبتوں کے نزول کے موقعوں پر بالعموم ہوا کرتا ہے۔ سبھی لوگ ایسے عمدہ اور با قاعدہ طریقہ پر اپنا اپنا کام کر رہے تھے کہ ایک بوند پانی بھی بیکار نہ گرنے پاتا تھا۔ آگ کا زور بھی لحہ لحہ کم ہو رہا تھا۔ لوگ ایسی خوبی سے آگ میں کودتے تھے، گویا وہ پانی کا حوض ہے۔

ابھی آگ اچھی طرح نہ بجھی تھی کہ دوسری طرف سے آواز آئی۔ دوڑو دوڑو! آدمی ڈوب رہا ہے۔ محل کی دوسری طرف ایک پختہ تالاب تھا جس کے کنارے جھاڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ گھاٹ پر ایک چھوٹی سی کشتی کھونٹے سے بندھی ہوئی پڑی تھی۔ آواز سنتے ہی آگ بجھانے والی جماعت سے کئی آدمی نکل کر تالاب کی طرف لپکے اور ڈوبتے ہوئے کو بچانے کے لیے پانی میں کود پڑے۔ ان کے کودنے کی آواز دھم دھم صوفیہ کے کانوں میں پڑی۔ ایشور کا کیسا قہر کہ ایک ساتھ ہی دو خاص عناصر میں یہ ہیجان! اور ایک ہی جگہ پر! وہ اٹھ کر تالاب کی طرف جانا ہی چاہتی تھی کہ دفعتاً اس نے ایک شخص کو پانی کا ڈول لیے پھسل کر زمین پر گرتے ہوئے دیکھا۔ چاروں طرف آگ فرو ہو چکی تھی۔ لیکن جہاں وہ شخص گرا تھا وہاں اب تک بڑے زوروں کے ساتھ جل رہی تھی۔ آگ کی لپٹ اپنا خوف ناک منہ کھولے ہوئے اس بدنصیب شخص کی طرف لپکی۔ وہ لپیٹ اس کو نگل جاتی لیکن صوفیہ بجلی کی تیزی کے ساتھ شعلہ کی طرف دوڑی اور اس شخص کو کھینچ کر باہر نکال لائی۔ یہ سب ایک لحہ میں ہو گیا۔ غریب آدمی کی جان بچ گئی، لیکن صوفیہ کا نازک جسم آگ کی لپٹ میں جھلس گیا۔ وہ شعلوں کے حلقہ سے باہر آتے ہی بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑی!

صوفیہ نے تین روز تک آنکھیں نہیں کھولیں۔ دل نہ جانے کس کس دنیا کی سیر میں

مصروف تھا۔کبھی عجیب،کبھی خوف ناک نظارے دکھائی دیتے تھے ۔کبھی یسوع کی شانت مورتی آنکھوں کے سامنے آجاتی۔کبھی کسی عقیلہ خاتون کی چاندسی صورت کے درشن ہوتے۔جنھیں یہ سینٹ میری سمجھتی۔

جب چوتھے روز صبح کے وقت اس نے آنکھیں کھولیں تو اپنے کو ایک آراستہ کمرہ میں پایا۔گلاب اور صندل کی خوشبو آرہی تھی۔سامنے کرسی پر وہی خاتون بیٹھی ہوئی تھی جس کو اس نے حالت خواب میں سینٹ میری سمجھا تھا اور سرہانے ایک سن رسیدہ شخص بیٹھا ہوا تھا،جس کی آنکھوں سے رحم ٹپکا پڑتا تھا۔انہیں کو شاید اس نے نیم خوابی کی حالت میں عیسیٰ سمجھا تھا۔خواب محض یادداشت کی تکرار ہے۔

صوفیہ نے نحیف لہجہ میں پوچھا"میں کہاں ہوں؟ ماما کہاں ہیں؟"

بڈھے آدمی نے کہا"تم کنور بھرت سنگھ کے گھر میں ہو۔تمہارے سامنے رانی صاحبہ بیٹھی ہوئی ہیں۔تمہارا جی اب کیسا ہے؟"

صوفیہ:اچھی ہوں پیاس لگی ہے،ماما کہاں ہیں؟ پاپا کہاں ہیں؟ آپ کون ہیں؟

رانی:یہ ڈاکٹر گنگولی ہیں۔تین دن سے تمہاری دوا کررہے ہیں،تمہارے پاپا ماما کون ہیں؟

صوفیہ:پاپا کا نام مسٹر جان سیوک ہے ہمارا بنگلہ سگرا میں ہے۔

ڈاکٹر:اچھا تو تم مسٹر جان سیوک کی بیٹی ہو۔ہم ان کو جانتا ہے۔ابھی بلاتا ہے

رانی:کسی کو ابھی بھیج دوں

صوفیہ:کوئی جلدی نہیں ہے۔آجائیں گے،میں نے جس آدمی کو پکڑ کر کھینچا تھا اس کی کیا حالت ہے؟

رانی:بیٹی!ایشور کی دیا سے وہ بہت اچھی طرح ہے۔اسے ذرا بھی آنچ نہیں لگی۔وہ میرا بیٹا ونے ہے۔ابھی آتا ہوگا۔تمہیں نے تو اس کی جان بچائی۔اگر تم دوڑ کر نہ پہنچ جاتیں تو آج نہ جانے کیا ہوتا۔میں تمہارے احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتی۔تم

میرے خاندان کی حفاظت کرنے والی دیوی ہو۔

صوفیہ: جس گھر میں آگ لگی تھی۔ اس کے آدمی سب بچ گئے۔

رانی: بیٹی وہ تو محض تماشا تھا۔ ونے نے یہاں ایک سیوا سمتی بنا رکھی ہے۔ جب شہر میں کوئی میلہ ہوتا ہے۔ یا کہیں سے کسی حادثہ کی خبر آتی ہے تو سمتی وہاں پہنچ کر ضرورت خدمت اور مدد کرتی ہے۔ اس روز سمتی کے امتحان کے لیے کنور صاحب نے یہ تماشا کیا تھا۔

ڈاکٹر: کنور صاحب دیوتا ہیں۔ کتنے غریب لوگوں کی اچھا کرتا ہے۔ یہ سمتی ابھی تھوڑے دن ہوئے بنگال گئی تھی۔ یہاں سورج گرہن کا اشنان ہونے والا ہے۔ لاکھوں جاتری دور دور سے آئے گا۔ اسی کے لیے یہ سب تیاری ہو رہا ہے۔

اتنے میں ایک نوجوان حسینہ وہاں آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے چہرے سے شمع روشن کی طرح نور کی کرنیں چھٹک رہی تھیں۔ گلے میں موتیوں کے ہار کے سوا اس کے جسم پر کوئی زیور نہ تھا۔ صبح کی سفید روشنی مجسم نمودار تھی۔

صوفیہ نے اسے ایک لمحہ تک غور سے دیکھا پھر بولی ''اندو! تم یہاں کہاں؟ آج کتنے دنوں کے بعد تمہیں دیکھا ہے؟''

اندو چونک پڑی۔ تین دن سے برابر صوفیہ کو دیکھ رہی تھی۔ خیال آتا تھا کہ اسے کہیں دیکھا ہے۔ پر کہاں دیکھا ہے۔ یہ یاد نہ پڑتا تھا۔ اس کی باتیں سنتے ہی یادداشت تازہ ہو گئی۔ آنکھیں چمک اٹھیں۔ گلاب کھل گیا۔ بولی ''او ہو صوفی! تم ہو؟''

دونوں سہیلیاں گلے مل گئیں۔ یہ وہی اندو تھی جو صوفیہ کے ساتھ نینی تال میں پڑھتی تھی۔ صوفیہ کو امید نہ تھی کہ اندو اتنی محبت سے ملے گی۔ اندو پچھلی باتوں کو یاد کر کے کبھی روتی کبھی ہنستی کبھی گلے مل جاتی۔ اپنی ماں سے اس کی تعریف کرنے لگی۔ ماں اس کی محبت کو دیکھ کر پھولی نہ سماتی تھی بالآخر صوفیہ نے شرماتے ہوئے کہا ''اندو! ایشور کے لیے اب میری زیادہ تعریف نہ کرو۔ ورنہ میں تم سے نہ بولوں گی۔ اتنے عرصہ تک کبھی خط بھی نہ

لکھا۔ منہ دیکھے کی محبت کرتی ہو"

رانی: نہیں بیٹی صوفی! اندو مجھ سے کئی بار تمہارا ذکر کر چکی ہے۔ یہاں کتنے ہی رئیسوں کی لڑکیاں اس سے ملنے آتی ہیں، پر کسی سے اس کا دل نہیں ملتا۔ کسی سے ہنس کر بولتی تک نہیں۔ تمہارے سوا میں نے اسے اور کسی کی تعریف کرتے نہیں سنا۔

اندو: بہن! تمہاری شکایت بجا ہے۔ پر کروں کیا؟ مجھے خط ہی نہیں لکھنا آتا۔ ایک تو بڑی بھول یہ ہوئی کہ تمہارا پتہ نہیں پوچھا اور اگر پتہ معلوم بھی ہوتا تو بھی میں خط نہ لکھ سکتی۔ مجھے خوف ہے کہ کہیں تم ہنسنے نہ لگو۔ میرا خط کبھی ختم نہ ہوتا اور نہ جانے کیا کیا لکھ جاتی۔

کنور صاحب کا معلوم ہوا کہ صوفیہ باتیں کر رہی ہے تو وہ بھی شکریہ ادا کرنے کے لیے وہاں آئے۔ پورے چھ فٹ کے آدمی تھے۔ بڑی بڑی آنکھیں، لمبے بال، لمبی داڑھی، موٹے کپڑے کا ایک لمبا کرتہ پہنے ہوئے تھے۔ صوفیہ نے ایسا نورانی چہرہ کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس نے اپنے دل میں رشیوں کی جو شکل قائم کر رکھی تھی، وہ بالکل اسی قسم کی تھی۔ اس بڑے جسم میں بیٹھی ہوئی بڑی آتما دونوں آنکھوں سے تاک رہی تھی۔ صوفی نے تعظیماً اٹھنا چاہا لیکن کنور صاحب شیریں اور سادہ لہجہ میں بولے "بیٹی لیٹی رہو تمہیں اٹھنے میں تکلیف ہو گی۔ لو میں بیٹھا جاتا ہوں۔ تمہارے پاپا سے مجھے ملاقات ہے۔ پر کیا معلوم تھا کہ تم مسٹر سیوک کی بیٹی ہو۔ میں نے ان کو بلایا ہے، لیکن میں کہے دیتا ہوں کہ میں ابھی تمہیں جانے نہ دوں گ۔ یہ کمرہ اب تمہارا ہے اور یہاں سے چلے جانے پر بھی تم کو ایک مرتبہ روزانہ یہاں آنا پڑے گا (رانی سے) جاہنوی! یہاں پیانو منگوا کر رکھ دو۔ آج مس سہراب جی کو بلوا کر صوفیہ کی ایک روغنی تصویر تیار کروا لو۔ سہراب جی زیادہ ہوشیار ہیں۔ پر میں نہیں چاہتا کہ ان کے سامنے بیٹھنا پڑے۔ وہ تصویر ہم کو یاد دلاتی رہے گی کہ کس نے سخت مصیبت کے وقت ہماری مدد کی۔"

رانی: کچھ اناج بھی دان کرا دوں؟

یہ کہہ کر رانی نے ڈاکٹر گنگولی کی طرف دیکھ کر آنکھوں سے اشارہ کیا۔ کنور صاحب فوراً

بولے ’’پھر وہی ڈھکو سلے! اس زمانہ میں جو غریب ہے، اسے غریب ہونا چاہیے۔ جو بھوکوں مرتا ہے، اسے بھوکوں مرنا چاہیے۔ جب گھنٹے دو گھنٹے کی محنت سے کھانے بھر کو مل سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ کیوں کوئی شخص بھوکوں مرے۔ دان نے ہماری قوم میں جتنے سست آدمی پیدا کر دیئے ہیں، اتنے کل نشوں نے بھی مل کر نہ پیدا کیے ہوں گے۔ دان کو اتنی اہمیت کیوں دی گئی۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آتا‘‘

رانی: رشیوں نے بھول کی کہ تم سے صلاح نہ لے لی۔

کنور: ہاں میں ہوتا تو صاف کہہ دیتا کہ آپ لوگ یہ کاہلی، بداعمالی اور بدی کا بیج بو رہے ہیں۔ دان کاہلی کی جڑ ہے اور کاہلی تمام گناہوں کی جڑ۔ پس دان ہی گناہوں کی جڑ ہے۔ کم سے کم اس کا معاون تو ضرور ہی ہے۔ دان نہیں۔ اگر جی چاہتا ہو دوستوں کی دعوت کر دو۔

ڈاکٹر: صوفیہ! تم راجہ صاحب کا بات سنتا ہے؟ تمہارا یسوع تم دان کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ تم کنور صاحب سے کچھ نہیں کہتا۔

صوفیہ نے اندو کی طرف دیکھا اور مسکرا کر آنکھیں نیچی کر لیں۔ گویا کہہ رہی تھی کہ میں ان کی عزت کرتی ہوں، ورنہ جواب دینے کے ناقابل نہیں ہوں۔

صوفیہ دل ہی دل میں ان لوگوں کی باہمی محبت کا مقابلہ اپنے گھر والوں سے کر رہی تھی۔ آپس میں کتنی محبت ہے! ماں باپ دونوں اندو پر جان دیتے ہیں۔ ایک میں بد نصیب ہوں کہ کوئی منہ بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔ چار دن یہاں پڑے ہو گئے، کسی نے خبر تک نہ لی۔ کسی نے کھوج ہی نہ کی ہو گی۔ ماما نے تو سمجھ لیا ہو گا۔ کہیں ڈوب مری ہو گی۔ جی میں خوش ہوں گی کہ اچھا ہوا سر سے ایک بلا ٹل گئی۔ میں ایسے نیک دل لوگوں کے ساتھ رہنے کے قابل نہیں ہوں۔ میری ان سے کیا برابری۔

اگرچہ یہاں کسی کے برتاؤ میں رحم کا شائبہ بھی نہ تھا لیکن صوفیہ کو انہیں اپنی اس قدر خاطر و مدارات کرتے دیکھ کر اپنی بے کسی کی حالت پر رنج ہوتا تھا۔ اندو سے بھی تکلف کا

برتاؤ کرنے لگی۔ اندو اس کو محبت سے تم کہتی تھی پر وہ اس کو آپ کہہ کر باتیں کرتی تھی۔

کنور صاحب کہہ گئے تھے۔ میں نے مسٹر سیوک کو اطلاع کر دی ہے۔ وہ آتے ہی ہوں گے۔ صوفیہ کو اب یہ خوف ہونے لگا کہ کہیں وہ آ نہ رہے ہوں۔ آتے ہی آتے مجھے اپنے ساتھ چلنے کو کہیں گے۔ میرے سر پھر وہی مصیبت پڑے گی۔ اندو سے اپنی مصیبت کی داستان کہوں تو شاید اس کو مجھ سے کچھ ہمدردی ہو۔ یہ خادمہ یہاں فضول ہی بیٹھی ہوئی ہے۔ اندو آئی بھی تو اس سے کس طرح باتیں کروں گی؟ پاپا کے آنے سے قبل ایک بار اندو سے تنہائی میں ملنے کا موقع مل جاتا تو اچھا ہوتا۔ کیا کروں؟ اندو کو بلا بھیجوں؟ نہ جانے کیا کرنے لگی؟ پیانو بجاؤں تو شاید سن کر آئے۔

اس طرف اندو بھی صوفیہ سے کتنی ہی باتیں کرنا چاہتی تھیں۔ رانی جی کے سامنے اس کو دل کی باتیں کہنے کا موقع نہ ملتا تھا۔ خوف تھا کہ صوفیہ کے باپ اس کو لیتے گئے تو میں پھر اکیلی ہو جاؤں گی۔ ڈاکٹر گنگولی نے کہا تھا کہ انہیں زیادہ باتیں نہ کرنے دینا۔ آج اور آرام سے سو لیں تو پھر کوئی اندیشہ نہ رہے گا۔ اس لیے وہ آنے کا ارادہ کر کے ابھی رک جاتی تھی۔ آخر نو بجتے بجتے وہ بے صبر ہو گئی۔ آ کر خادمہ کو اپنا کمرہ صاف کرنے کے بہانے وہاں سے ہٹا دیا اور صوفیہ کے سرہانے بیٹھ کر بولی ''کیوں بہن بہت کمزوری تو نہیں معلوم ہوتی؟''

صوفیہ: بالکل نہیں مجھے تو معلوم ہوتا ہے کہ میں بالکل اچھی ہو گئی۔

اندو: تمہارے پاپا کہیں تم کو اپنے ساتھ لے گئے تو میری جان نکل جائے گی۔ ان کے آتے ہی خوش ہو کر جاؤ گی اور شاید پھر کبھی میری یاد بھی نہ کرو گی؟

یہ کہتے کہتے اندو کی آنکھیں اشک آلودہ ہو گئیں۔ جذبات کے نامناسب جوش کو ہم اکثر آنسوؤں سے چھپاتے ہیں۔ اندو کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ پر وہ مسکرا رہی تھی۔

صوفیہ بولی: آپ مجھے بھول سکتی ہیں، پر میں آپ کو کیسے بھولوں گی؟

وہ اپنا دردِ دل سنانے کو تھی کہ غیرت نے زبان بند کر دی۔ بات پھیر کر بولی ”میں کبھی کبھی آپ سے ملنے آیا کروں گی۔“

اندو: میں ابھی یہاں سے تم کو پندرہ روز تک نہ جانے دوں گی۔ مذہب کی رکاوٹ نہ ہوتی تو کبھی نہ جانے دیتی۔ اماں جی تم کو اپنی بہو بنا کر چھوڑتیں۔ تمہارے اوپر بے طرح ریجھ گئی ہیں۔ جہاں بیٹھتی ہیں تمہاری ہی چرچا کرتی ہیں۔ ونے بھی تمہارے ہاتھوں بکا ہوا سا معلوم ہوتا ہے۔ تم چلی جاؤ گی تو سب سے زیادہ رنج اسی کو ہوگا۔ ایک راز کی بات تم سے کہتی ہوں۔ اماں جی تم کو کوئی چیز تحفہ کے طور پر دیں تو انکار نہ کرنا۔ ورنہ ان کو بہت رنج ہوگا۔

اس محبت آمیز ضد نے تامل کا لنگر اکھاڑ دیا۔ جو اپنے گھر میں روزانہ سخت الفاظ سننے کا عادی ہو، اس کے لیے اس قدر ہمدردی کافی سے زیادی تھی۔ اب صوفیہ کو اندو سے اپنے خیالات پوشیدہ رکھنا آئین دوستی کے خلاف معلوم ہوا۔ دردناک لہجہ میں بولی ”اندو! میرا بس ہوتا تو کبھی رانی جی کے چرنوں کو نہ چھوڑتی۔ پر اپنا کیا بس ہے؟ یہ محبت اور کہاں ملے گی؟“

اندو اس کا مطلب نہ سمجھ سکی۔ اپنی فطرتی سادگی سے بولی ”کہیں شادی کی بات چیت ہو رہی ہے کیا؟“

اس کی سمجھ میں شادی کے سوا لڑکیوں کے اس قدر غمگین ہونے کا کوئی سبب نہ تھا۔

صوفیہ: میں نے تو عہد کر لیا ہے کہ شادی نہ کروں گی۔

اندو: کیوں؟

صوفیہ: اس لیے کہ شادی سے مجھی کو اپنی مذہبی آزادی ترک کر دینا ہوگی۔ مذہب آزاد خیالی کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔ میں اپنی آتما کو کسی مذہب کے ہاتھ نہیں بیچنا چاہتی۔ مجھے ایسا عیسائی شوہر ملنے کی امید نہیں جس کا دل اتنا فیاض ہو کہ وہ میرے مذہبی شکوک سے درگزر کر سکے۔ میں حالات سے مجبور ہو کر حضرت یسوع کو خدا کا بیٹا اور نجات دہندہ نہیں مان

سکتی۔ نہ مجبوری سے گرجا میں ایشور کی عبادت کرنے کے لیے جانا چاہتی ہوں۔ میں یسوع کو ایشور تسلیم نہیں کرسکتی

اندو: میں تو سمجھتی تھی کہ تمہارے یہاں ہم لوگوں کے یہاں سے کہیں زیادہ آزادی ہے۔ جہاں چاہو تنہا جاسکتی ہو۔ ہمارا تو گھر سے نکلنا مشکل ہے۔

صوفیہ: لیکن اس قدر مذہبی تنگ خیالی تو نہیں ہے؟

اندو: نہیں کوئی کسی کو پوجاپاٹ کے لیے مجبور نہیں کرتا۔ بابو جی گنگا اشنان کرتے ہیں۔ گھنٹوں شو جی کی پوجا کرتے ہیں۔ اماں جی بھی بھول کر بھی اشنان کرنے نہیں جاتیں۔ نہ کسی دیوتا کی پوجا ہی کرتی ہیں۔ پر بابو جی کبھی ہٹ نہیں کرتے۔ بھگتی کا انحصار تو اپنے اعتقاد اور خیال پر ہے۔ ہم بھائی بہن کے خیالات میں بھی زمین آسمان کا فرق ہے میں کرشن کو مانتی ہو۔ وہ نے ایشور کی ہستی سے بھی منکر ہے۔ پر بابو جی ہم لوگوں سے کبھی نہیں کہتے اور نہ ہم بھائی بہن میں کبھی اس پر بحث مباحثہ ہوتا ہے۔

صوفیہ: ہماری آزادی جسمانی ہے اور اس لیے جھوٹی۔ آپ کی آزادی روحانی ہے اور اس لیے سچی۔

اندو: تم گرجا کبھی نہیں جاتیں؟

صوفیہ: پہلے جبراً جاتی تھی اب کے نہیں گئی۔ اس پر گھر والے بہت ناراض ہوئے۔ بری طرح میری بے عزتی کی گئی۔

اندو نے محبت آمیز سادگی سے کہا ''وہ لوگ ناراض ہوئے ہوں گے۔ تو تم بہت روئی ہو گی؟''

صوفیہ: پہلے رویا کرتی تھی اب پروا نہیں کرتی۔

اندو: مجھے تو کبھی کوئی کچھ کہہ دیتا ہے تو دل پر تیر سا لگتا ہے۔ دن دن بھر روتی رہی رہ جاتی ہوں۔ آنسو ہی نہیں تھمتے۔ وہ بات بار بار دل میں چبھا کرتی ہے۔ سچ پوچھو تو مجھے کسی کے غصہ پر رونا نہیں آتا۔ رونا آتا ہے اپنے اوپر کہ میں نے کیوں انہیں ناراض کیا۔ کیوں

مجھ سے ایسی بھول ہوئی۔

صوفیہ کو وہم ہوا کہ اندو مجھے اپنی خطا بخشی سے نادم کرنا چاہتی ہے۔ ماتھے پر شکن پڑ گئی۔ بولی ''میری جگہ پر آپ ہوتیں تو ایسا نہ کہتیں۔ آخر کیا آپ اپنے مذہبی خیالات کو ترک کر دیتیں؟''

اندو: یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ میں کیا کرتی پر گھر والوں کو خوش رکھنے کی کوشش کرتی۔

صوفیہ: آپ کی ماتا جی اگر آپ کو جبراً کرشن کی عبادت کرنے سے روکیں تو کیا آپ مان جائیں گی؟

اندو: ہاں میں تو مان جاؤں گی۔ اماں کو ناراض نہ کروں گی۔ کرشن تو عالم الغیب ہیں۔ انہیں خوش رکھنے کے لیے عبادت کی ضرورت نہیں۔ عبادت تو صرف اپنے دل کی تسکین کے لیے ہے۔

صوفیہ: (تعجب سے) آپ کو ذرا بھی دماغی تکلیف نہ ہوگی؟

اندو: ضرور ہوگی پر ان کی خاطر سہہ لوں گی۔

صوفیہ: اچھا اگر وہ آپ کی مرضی کے خلاف آپ کی شادی کرنا چاہیں تو؟

اندو: (شرماتے ہوئے) وہ مسئلہ تو حل ہو چکا۔ ماں باپ نے جس سے سمجھا بیاہ دیا۔ میں نے زبان تک نہیں کھولی۔

صوفیہ: ارے یہ کب؟

اندو: اس کو تو دو سال ہو گئے (آنکھیں نیچی کر کے) اگر میرا اپنا بس ہوتا تو ان کو کبھی نہ بیاہتی۔ چاہے کنواری ہی رہتی۔ میرے مالک مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ دولت کی کوئی کمی نہیں لیکن میں ان کے دل کے صرف ایک چوتھائی کی مالکہ ہوں۔ اس کے تین حصے رفاہ عام کے کاموں کی نذر ہوتے ہیں۔ ایک کے بدلے چوتھائی پا کر کون آسودہ ہو سکتا ہے۔ مجھے تو باجرے کی پوری بسکٹ کی چوتھائی حصے سے کہیں زیادہ بھلی معلوم ہوتی ہے۔ بھوک تو رفع ہو جاتی ہے جو کھانا کھانے کا واقعی مقصد ہے۔

صوفیہ: آپ کی مذہبی آزادی میں تو خلل نہیں ڈالتے؟

اندو: نہیں، انہیں اتنی فرصت کہاں ہے؟

صوفیہ: تب تو میں آپ کو مبارک باد دوں گی

اندو: اگر کسی قیدی کو مبارک باد دینا مناسب ہو تو شوق سے دو۔

صوفیہ: زنجیر محبت کی ہو تو؟

اندو: ایسا ہوتا تو میں خود ہی تم سے مبارک باد دینے کے لیے اصرار کرتی۔ میں بندھ گئی وہ آزاد ہیں۔ مجھے یہاں آئے تین مہینے ہوئے۔ آتے ہیں، پر تین دفعہ سے زیادہ نہیں آئے اور وہ بھی ایک ایک گھنٹہ کے لیے! اسی شہر میں رہتے ہیں۔ دس منٹ میں موٹر آسکتی ہے مگر اتنی فرصت کس کو ہے۔ ہاں خطوط سے اپنی ملاقات کا کام نکالنا چاہتے ہیں۔ اور وہ خطوط بھی کیسے ہوتے ہیں۔ اول سے آخر تک اپنے دکھڑوں سے بھرے ہوئے۔ آج یہ کام ہے کل وہ کام ہے۔ ان سے ملنے جانا ہے ان کا خیر مقدم کرنا ہے۔ میونسپلٹی کے چیئرمین کیا ہو گئے، راج مل گیا۔ جب دیکھو وہی دھن سوار۔ اور سب کاموں کے لیے فرصت ہے، اگر فرصت نہیں تو صرف یہاں آنے کی! میں تم کو متنبہ کیے دیتی ہوں کسی ملک وقوم کے خادم سے بیاہ نہ کرنا ورنہ پچھتاؤ گی۔ تم اس کے فرصت کے وقت کی محض ایک دل بہلاوے کی چیز رہو گی۔

صوفیہ: میں تو پہلے ہی اپنی رائے قائم کر چکی۔ سب سے الگ ہی الگ رہنا چاہتی ہوں۔ جہاں میری آزادی میں خلل ڈالنے والا کوئی نہ ہو۔ میں ٹھیک راستہ پر چلوں گی یا غلط پر۔ یہ ذمہ داری بھی اپنے ہی سر لینا چاہتی ہوں۔ میں بالغ ہوں اور اپنا نفع نقصان خود سمجھ سکتی ہوں۔ تمام عمر کسی کی حفاظت میں نہیں رہنا چاہتی کیونکہ اس حفاظت کے معنی غلامی کے سوا اور کچھ نہیں۔

اندو: کیا تم اپنے ماما اور پاپا کے تحت میں نہیں رہنا چاہتی؟

صوفیہ: ناماتحتی میں نوعیت کا نہیں صرف حدود کا فرق ہے۔

اندو: تو میرے ہی گھر کیوں نہیں رہتیں؟ میں اسے اپنی خوش نصیبی سمجھوں گی اور اماں جی تو تم کو آنکھوں کی پتلی بنا کر رکھیں گی۔ میں بھی چلی جاتی ہوں تو وہ اکیلی گھبرایا کرتی ہیں۔ تمہیں پا جائیں تو پھر گلا نہ چھوڑیں۔ کہو تو اماں سے کہوں یہاں تمہاری آزادی میں کوئی دخل نہ دے گا۔ بولو کہوں جا کر اماں سے؟

صوفیہ: نہیں ابھی بھول کر بھی نہیں آپ کی اماں جی کو جب معلوم ہوگا کہ اس کے ماں باپ اس کی بات نہیں پوچھتے تو میں ان کی نظروں سے بھی گر جاؤں گی۔ جس کی اپنے گھر میں عزت نہیں، اس کی باہر بھی عزت نہیں ہوتی۔

اندو: نہیں صوفی! اماں جی کا سوبھاؤ بالکل نرالا ہے۔ جس بات سے تمہیں اپنی بے عزتی کا خوف ہے، وہی بات اماں جی سے عزت پانے کی چیز ہے۔ وہ خود اپنی ماں سے کسی بات پر ناراض ہوگئی تھیں۔ جب سے میکے نہیں گئیں۔ نانی مر گئیں پر اماں جی نے انہیں معاف نہیں کیا۔ سینکڑوں بلاوے آئے، پر ان کو دیکھنے تک نہ گئیں۔ انہیں جوں ہی یہ بات معلوم ہوگی، تمہاری دونی عزت کرنے لگیں گی۔

صوفیہ نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا ''بہن میری لاج اب آپ ہی کے ہاتھ ہے''

اندو نے اس کا سر اپنے زانو پر رکھ کر کہا ''وہ مجھے اپنی لاج سے کم عزیز نہیں ہے۔''

ادھر مسٹر جان سیوک کو کنور صاحب کا خط ملا تو آکر بیوی سے بولے ''دیکھا میں کہتا نہ تھا کہ صوفی پر کوئی مصیبت آپڑی۔ یہ دیکھو! کنور بھرت سنگھ کا خط ہے۔ تین روز سے ان کے گھر پڑی ہوئی ہے۔ ان کے ایک جھونپڑے میں آگ لگ گئی تھی۔ اس کے بجھانے میں وہ مصروف تھی۔ کہیں لپٹ گئی''

مسز سیوک: یہ سب بہانے ہیں مجھے اس کی کسی بات کا اعتبار نہیں رہا۔ جس کا دل خدا سے پھر گیا اسے جھوٹ بولنے سے کیا ڈر؟ یہاں سے بگڑ کر گئی تھی۔ سمجھا ہوگا گھر سے نکلتے ہی پھولوں کی سیج بچھی ہوئی ملے گی۔ جب کہیں ٹھکانا نہ لگا تو یہ خط لکھوا دیا۔ اب آٹا دال کا بھاؤ معلوم ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خدا نے اس کے کفر کی یہ سزا دی ہو۔

جان سیوک: چپ بھی رہو۔ تمہاری بے دردی پر مجھے تعجب ہوتا ہے۔ میں نے تم جیسی سخت دل عورت نہیں دیکھی۔

مسز سیوک: میں تو نہیں جانتی، تمہیں جانا ہو جاؤ!

جان سیوک: مجھے تو دیکھ رہی ہو۔ مرنے کی فرصت نہیں ہے۔ اسی پانڈے پور والی زمین کے بارے میں بات چیت کر رہا ہوں۔ ایسے موذی سے پالا پڑا ہے۔ کہ کسی طرح قابو میں ہی نہیں آتا۔ دیہاتیوں کو جو لوگ سادہ لوح کہتے ہیں، بڑی غلطی کرتے ہیں۔ ان سے زیادہ چالاک آدمی ملنا مشکل ہے۔ تمہیں اس وقت کوئی کام نہیں ہے۔ موٹر منگائے دیتا ہوں۔ شان سے چلی جاؤ اور اس کو اپنے ساتھ لیتے آؤ۔

ایشور سیوک وہیں آرام کرسی پر آنکھیں بند کیے ہوئے یاد الٰہی میں محو تھے جیسے بہرا آدمی مطلب کی بات سنتے ہی چونک پڑتا ہے، موٹر کار کا ذکر سنتے ہی دھیان ٹوٹ گیا بولے، ''موٹر کی کیا ضرورت ہے؟ کیا دس پانچ روپے کاٹ رہے ہیں؟ یہاں اڑنے کے لیے تو قارون ک خزانہ بھی کافی نہ ہوگا۔ کیا گاڑی پر جانے سے شان میں فرق آ جائے گا؟ تمہاری موٹر دیکھ کر کنور صاحب رعب میں نہ آئیں گے۔ انہیں خدا کی بہتیری موٹریں دیں ہیں۔ یسوع! مجھے اپنے دامن میں لو! اب دیر نہ کرو! میری صوفی بیچاری وہاں بیگانوں میں پڑی ہوئی ہے۔ نہ جانے اتنے دن کس طرح کاٹے ہوں گے؟ خدا اس کو راہ راست پر لائے۔ میری آنکھیں اس کو ڈھونڈ رہی ہیں۔ جب سے وہ گئی ہے کلام پاک سننے کی نوبت نہیں آئی۔ یسوع! اسے اپنے دامن میں لے! وہاں اس بیچاری کا کون پوچھنے والا ہے۔ امیروں کے گھر میں غریبوں کا گذر کہاں۔''

جان سیوک: اچھا ہی ہوا یہاں ہوتی تو روزانہ ڈاکٹر کی فیس نہ دینی پڑتی۔

ایشور سیوک: ڈاکٹر کی کیا ضرورت تھی۔ اللہ کے فضل سے میں خود تھوڑی بہت ڈاکٹری جانتا ہوں۔ گھر والوں کی محبت و تیمارداری ڈاکٹر کی دواؤں سے کہیں زیادہ نفع بخش ہوتی ہے۔ میں اپنی بچی کو گود میں لے کر کلام پاک سناتا۔ اس کے لیے خدا سے دعا مانگتا۔

مسز سیوک: تو آپ ہی چلے جایئے نا؟

ایشور سیوک: بسر و چشم میرا تانگہ منگوا دو۔ ہم سب کو چلنا چاہیے۔ گمراہوں کو محبت ہی راہ راست پر لاتی ہے۔ میں بھی چلتا ہوں۔ بیٹی! امیروں کے سامنے عاجزی دکھلانی پڑتی ہے۔ ان سے برابری کا دعویٰ نہیں کیا جاتا۔

جان سیوک: مجھے ابھی ساتھ نہ لے جایئے۔ میں کسی دوسرے موقع پر جاؤں گا۔ اس وقت وہاں بجز رسمی شکر گزاری کیا اور کوئی کام نہ ہوگا۔ میں ان کا شکریہ ادا کروں گا۔ میں اس کے تعارف کو غیبی امداد سمجھتا ہوں۔ اطمینان سے ملوں گا۔ کنور صاحب کا شہر میں خاصا دباؤ ہے۔ میونسپلٹی کے صدر ان کے داماد ہیں۔ ان کی مدد سے پانڈے پور والی زمین مجھ کو بہت آسانی سے مل جائے گی۔ ممکن ہے کہ وہ چند حصے بھی خرید لیں مگر آج ان باتوں کا موقع نہیں ہے۔

ایشور سیوک: مجھے تمہاری اس فراست پر ہنسی آتی ہے۔ جس آدمی سے ربط ضبط پیدا کر کے تمہارے اتنے کام نکل سکتے ہیں، اس سے ملنے میں بھی تمہیں اتنا تامل ہے۔ تمہارا وقت اتنا قیمتی ہے کہ نصف گھنٹہ کے لیے بھی وہاں نہیں جا سکتے۔ اول ہی ملاقات میں ساری باتیں طے کر لینا چاہتے ہو۔ ایسا سنہرا موقع پا کر بھی تمہیں اس سے فائدہ اٹھانا نہیں آتا۔

جان سیوک: خیر آپ کا اصرار ہے تو میں ہی چلا جاؤں گا۔ میں ایک ضروری کام کر رہا تھا۔ پھر کر لوں گا۔ آپ کو تکلیف اٹھانے کی ضرورت نہیں (بیوی سے) تم تو چل رہی ہو۔

مسز سیوک: مجھے ناحق لے چلتے ہو۔ مگر خیر چلو!

کھانا کھا کر چلنا طے ہوا۔ انگریزی رواج کے مطابق یہاں دن کا کھانا ایک بجے ہوتا تھا۔ درمیانی وقت تیاریوں میں صرف ہوا۔ مسز سیوک نے اپنے زیور نکالے جنہیں انہوں نے عالم ضعیفی میں بھی ترک نہیں کیا تھا۔ اپنا بہترین گون اور بلاؤز نکالا۔ اتنا بناؤ سنگار وہ اپنے سال گرہ کے دن کے علاوہ اور کسی تقریب پر نہ کرتی تھیں۔ مطلب تھا صوفیہ کو جلانا۔

اس کو دکھانا کہ تیرے چلے آنے سے میں رو رو کر مری نہیں جا رہی ہوں۔ کوچوان کو گاڑی دھو کر صاف کرنے کا حکم دیا گیا۔ پربھو سیوک کو بھی ساتھ لے چلنے کی رائے ہوئی، لیکن جان سیوک نے اس کے کمرہ میں جا کر دیکھا تو اس کا پتہ نہ تھا۔ اس کی میز پر ایک فلسفہ کی کتاب کھلی پڑی تھی۔ معلوم ہوتا تھا پڑھتے پڑھتے اٹھ کر کہیں چلا گیا ہے۔ دراصل یہ کتاب تین روز سے اسی طرح کھلی پڑی تھی۔ پربھو سیوک کو اسے بند کر کے رکھ دینے کی بھی فرصت نہ تھی۔ وہ صبح سے دو گھڑی رات گئے تک شہر کا چکر لگایا کرتا۔ صرف دو بار کھانا کھانے گھر آتا تھا۔ ایسا کوئی اسکول نہ تھا جہاں اس نے صوفی کو نہ تلاش کیا ہو۔ کوئی شناسا، کوئی دوست ایسا نہ تھا جس کے گھر جا کر اس نے کھوج نہ کی ہو۔ تمام دن کی دوا دوش کے بعد رات کو مایوس ہو کر لوٹ آتا اور چارپائی پر لیٹ کر گھنٹوں سوچتا اور روتا کہاں چلی گئی؟ پولیس کے دفتر میں دن میں دس دس بار جاتا اور پوچھتا کچھ پتہ چلا؟ اخباروں میں بھی اعلان کر دیا تھا۔ وہاں بھی روزانہ کئی بار جا کر دریافت کرتا۔ اسے یقین ہوتا جاتا تھا کہ صوفی ہم سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئی۔ آج بھی حسب معمول ایک بجے تھکا ہوا اور اداس لوٹ کر گھر آیا تو جان سیوک نے مژدہ سنایا کہ صوفی کا پتہ مل گیا۔

پربھو سیوک کا چہرہ شگفتہ ہو گیا بولا ''سچ؟ کہاں ہے؟ کیا اس کا کوئی خط آیا ہے؟''

جان سیوک: کنور بھرت سنگھ کے مکان پر ہے۔ آؤ کھانا کھا لو تمہیں بھی وہاں چلنا ہے۔

پربھو سیوک: میں تو لوٹ کر کھانا کھاؤں گا۔ بھوک غائب ہو گئی ہے تو اچھی طرح؟

مسز سیوک: ہاں ہاں بہت اچھی طرح ہے! خدا نے یہاں سے روٹھ کر جانے کی سزا دے دی۔

پربھو سیوک: ماما! خدا نے آپ کا دل نہ جانے کس پتھر کا بنایا ہے۔ کیا گھر سے آپ ہی آپ روٹھ کر چلی گئی تھی؟ آپ ہی نے اسے نکالا اور اب بھی آپ کو اس پر ذرا رحم نہیں آتا!

مسز سیوک: گمراہوں پر رحم کرنا گناہ ہے۔

پربھوسیوک: اگر صوفی گمراہ ہے تو عیسائیوں میں 99 فیصد آدمی گمراہ ہیں! وہ مذہب کا سوانگ نہیں بھرنا چاہتی۔ اس میں یہی عیب ہے۔ نہیں تو حضرت عیسیٰ پر جتنا اعتقاد اس کو ہے اتنا انہیں بھی نہ ہوگا جو عیسیٰ پر جان دینے کا دم بھرتے ہیں۔

مسز سیوک: خیر معلوم ہوگیا کو تم اس کی وکالت خوب کر سکتے ہو۔ مجھے ان دلائل کے سننے کی فرصت نہیں۔ یہ کہہ کر مسز سیوک وہاں سے چلی گئیں۔ کھانے کا وقت آیا۔ لوگ میز پر بیٹھے۔ پربھوسیوک بہت اصرار کرنے پر بھی نہ گیا۔ تینوں آدمی فٹن میں بیٹھے تو ایشور سیوک نے چلتے چلتے جان سیوک سے کہا "صوفی کو ضرور ساتھ لانا اور موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دینا۔ یسوع تمہیں عقل عطا کریں اور کامیابی"

ذرا دیر میں فٹن کنور صاحب کے مکان پر پہنچ گئی۔ کنور صاحب نے بڑے تپاک سے ان کا خیر مقدم کیا۔ مسز سیوک نے دل میں ٹھان لی کہ میں صوفیہ سے ایک لفظ بھی نہ بولوں گی۔ دور ہی کھڑی دیکھتی رہوں گی، لیکن جب صوفیہ کمرہ میں پہنچی اور اس کا پژمردہ چہرہ دیکھا تو دل پر قابو نہ رہا۔ ماما ابل پڑی۔ بے اختیار اس سے لپٹ گئی۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس بہاؤ میں صوفیہ کی دلی کدورت بھی بہہ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ ماں کی گردن میں ڈال دیئے اور کئی منٹ دونوں محبت کے روحانی مزہ سے لطف اندوز ہوتی رہیں۔ جان سیوک نے صوفیہ کو پیشانی پر بوسہ دیا مگر پربھوسیوک آنکھوں میں آنسو بھرے اس کے سامنے کھڑا رہا۔ بہن کو چھوتے ہوئے اسے خوف ہوتا تھا کہ مبادا دل نہ پھٹ جائے۔ ایسے موقعوں پر اس کا دل اور زبان دونوں ساکت و بے کار ہو جاتے تھے۔

جب جان سیوک صوفی کو دیکھ کر کنور صاحب کے ساتھ باہر چلے گئے تو مسز سیوک بولیں "تجھے اس دن کیا سوجھی کہ یہاں چلی آئی! یہاں اجنبیوں میں پڑے پڑے تیری طبیعت گھبراتی رہی ہوگی۔ یہ لوگ اپنی دولت کے گھمنڈ میں تیری بات بھی نہ پوچھتے ہوں گے"

صوفیہ: نہیں ماما یہ بات نہیں ہے۔ گھمنڈ تو یہاں کسی میں چھو تک نہیں گیا ہے۔ سبھی

ہمدردی اور انکسار کے پتلے ہیں۔ یہاں تک کہ نوکر چاکر بھی اشاروں سے کام کرتے ہیں۔ مجھے آج چوتھے دن ہوش آیا ہے، پر ان لوگوں نے اتنی محبت سے تیمارداری نہ کی ہوتی تو شاید مجھے ہفتوں تک بستر علالت پر پڑا رہنا ہوتا۔ میں اپنے گھر میں بھی زیادہ سے زیادہ اتنے ہی آرام سے رہتی۔

مسز سیوک: تم نے اپنی جان خطرے میں ڈالی تھی تو کیا یہ لوگ اتنا کرنے سے بھی رہے۔

صوفیہ: نہیں ماما یہ لوگ نہایت خلیق اور نیک ہیں۔ خود رانی جی عموماً میرے پاس بیٹھی ہوئی پنکھا جھلتی رہتی ہیں۔ کنور صاحب دن میں کئی بار آ کر دیکھ جاتے ہیں اور اندو سے میرا بہناپا سا ہو گیا ہے۔ یہی لڑکی ہے جو میرے ساتھ نینی تال میں پڑھا کرتی تھی۔

مسز سیوک: (چڑ کر) تجھے دوسروں میں سب وصف ہی وصف نظر آتے ہیں، برائیاں سب گھر والوں ہی کے حصہ میں پڑی ہیں۔ یہاں تک کہ دوسرے مذہب بھی اپنے سے اچھے ہیں۔

پربھو سیوک: ماما! آپ تو ذرا ذرا سی بات پر بگڑ اٹھتی ہیں۔ اگر کوئی اپنے ساتھ اچھا سلوک کرے تو کیا اس کا احسان نہ مانا جائے؟ احسان فراموشی سے برا کوئی عیب نہیں ہے۔

مسز سیوک: یہ آج کوئی نئی بات تھوڑا ہی ہے۔ گھر والوں کی برائی کرنا تو اس کی عادت میں داخل ہے۔ یہ مجھے جتانا چاہتی ہے کہ یہ لوگ اس کے ساتھ مجھ سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ دیکھوں یہاں سے جاتی ہے تو کون سی سوغات دے دیتے ہیں۔ کہاں ہیں کہاں ہیں تیری رانی صاحبہ؟ میں بھی ان کا شکریہ ادا کر دوں۔ ان سے اجازت لے لو اور گھر چلو پاپا کیلئے گھبرا رہے ہوں گے۔

صوفیہ: وہ تم سے ملنے کی بہت مشتاق تھیں۔ وہ یہاں کب کی آ گئی ہوتیں۔ لیکن شاید ہمارے درمیان میں بغیر بلائے آنا مناسب نہ سمجھتی ہوں گی۔

پربھوسیوک: ماما! ابھی صوفی کو یہاں دو چار دن اور آرام سے پڑی رہنے دیجیے۔ ابھی اس کو اٹھنے میں تکلیف ہوگی۔ دیکھیے نا کتنی کمزور ہوگئی ہے۔

صوفیہ: رانی جی بھی یہی کہتی تھیں کہ ابھی میں تم کو نہ جانے دوں گی

مسز سیوک: یہ کیوں نہیں کہتی کہ تیرا ہی جی یہاں سے جانے کو نہیں چاہتا۔ وہاں تیرا اتنا پیار کون کرے گا؟

صوفیہ: نہیں ماما! آپ میرے ساتھ بے انصافی کر رہی ہیں۔ میں اب یہاں ایک دن بھی اور نہیں رہنا چاہتی۔ میں اب ان لوگوں کو زیادہ تکلیف نہ دوں گی مگر ایک بات مجھے معلوم ہو جانی چاہیے مجھ پر پھر تو ظلم نہیں کیا جائے گا؟ میری مذہبی آزادی میں پھر تو کوئی رکاوٹ نہ ڈالی جائے گی؟

پربھوسیوک: صوفی! تم خواہ مخواہ ان باتوں کا تذکرہ کیوں کرتی ہو؟ تمہارے ساتھ کون سا جبر کیا جاتا ہے۔ ذرا سی بات کا بتنگڑ بناتی ہو۔

مسز سیوک: نہیں تو نے یہ بات پوچھ لی بہت اچھا کیا۔ میں بھی تجھے مغالطہ میں نہیں رکھنا چاہتی میرے گھر میں یسوع کے مخالفین کے لیے جگہ نہیں ہے۔

پربھوسیوک: آپ ناحق اس سے الجھتی ہیں۔ سمجھ لیجیے کوئی ہذیان بک رہی ہے۔

مسز سیوک: کیا کروں؟ میں نے تمہاری طرح فلسفہ نہیں پڑھا۔ واقعہ کو خواب نہیں سمجھ سکتی۔ یہ وصف تو فلاسفروں ہی میں ہو سکتا ہے۔ یہ مت سمجھو کہ مجھے اپنی اولاد سے محبت نہیں ہے۔ خدا جانتا ہے میں نے تمہاری خاطر کیا کیا تکلیفیں نہیں اٹھائیں۔ اس وقت تمہارے پاپا ایک دفتر میں کلرک تھے۔ گھر کا سارا کام کاج مجھی کو کرنا پڑتا تھا۔ بازار جاتی، کھانا پکاتی، جھاڑو لگاتی۔ تم دونوں ہی بچپن میں کمزور تھے۔ روز ہی ایک نہ ایک روگ لگا رہتا تھا۔ گھر کے کاموں سے ذرا فرصت ملتی تو ڈاکٹروں کے پاس جاتی۔ اکثر تمہیں گود میں لیے ہی لیے راتیں کٹ جاتیں۔ اتنی قربانی سے پالی ہوئی اولاد کو جب ایشور سے منحرف ہوتے دیکھتی ہوں تو غم و غصہ سے پاگل ہو جاتی ہوں۔ تمہیں میں سچا ایمان کا پکا

یسوع کا بندہ بنانا چاہتی تھی۔ اس کے برعکس جب تمہیں یسوع سے منہ موڑتے دیکھتی ہوں۔ ان کی زندگی، ان کے وعظ، ان کے معجزات پر شبہ کرتے پاتی ہوں تو میرا دل پاش پاش ہو جاتا ہے اور یہی جی چاہتا ہے کہ اس کی صورت نہ دیکھوں۔ مجھے اپنا مسیح ساری دنیا سے اولاد سے یہاں تک کہ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔

صوفیہ: آپ کو یسوع اتنا عزیز ہے تو مجھے بھی اپنی روح اپنا ایمان اس سے کم عزیز نہیں ہیں۔ میں ان پر کسی قسم کا جبر ہونا برداشت نہیں کر سکتی۔

مسز سیوک: خدا تجھے اس کفر کی سزا دے گا۔ میری اس سے یہی دعا ہے کہ پھر مجھے تیری صورت نہ دکھائے۔

یہ کہہ کر مسز سیوک کمرہ سے باہر نکل آئیں۔ رانی صاحبہ اور اندو ادھر سے آ رہی تھیں۔ دروازہ پر ان سے ملاقات ہو گئی۔ رانی صاحبہ مسز سیوک کے گلے لپٹ گئیں اور تشکر آمیز الفاظ کا دریا بہا دیا۔ مسز سیوک کو اس خالص محبت میں بھی تصنع کی بو آئی، لیکن رانی صاحبہ کو مردم شناسی کا ملکہ نہ تھا۔ اندو سے بولیں ''مس صوفیہ سے کہہ دے کہ ابھی جانے کی تیار نہ کرے۔ مسز سیوک! آپ میری خاطر صوفیہ کو ابھی دو چار روز اور یہاں رہنے دیں۔ میں آپ سے عاجزانہ اصرار کرتی ہوں۔ ابھی میری طبیعت اس کی باتوں سے سیر نہیں ہوئی اور نہ میں اس کی کچھ خدمت ہی کر سکی۔ میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں میں خود اس کو آپ کے پاس پہنچا دوں گی۔ جب تک وہ یہاں رہے گی، آپ سے کم از کم روزانہ ایک مرتبہ ملاقات ہوتی رہے گی۔ آپ خوش نصیب ہیں آپ کو ایسی اچھی لڑکی ملی۔ رحم اور روشن خیالی کا مجسمہ ہے۔ ایثار تو اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔''

مسز سیوک: میں اسے اپنے ساتھ چلنے پر مجبور نہیں کرتی۔ آپ جتنے دن چاہیں شوق سے رکھیں۔

رانی: بس بس میں اتنا ہی چاہتی تھی آپ نے مجھے خرید لیا۔ آپ سے ایسی ہی امید بھی تھی۔ آپ خود اس قدر خلیق نہ ہوتیں تو صاحبزادی میں یہ اوصاف کہاں سے آتے؟ ایک

میری اندو ہے کہ باتیں کرنے کا بھی طریقہ نہیں جانتی۔ایک بڑی ریاست کی رانی ہے، پر اتنا بھی نہیں جانتی کہ میری سالانہ آمدنی کیا ہے۔لاکھوں کے زیورات صندوق میں پڑے ہوئے ہیں۔انہیں چھوتی تک نہیں۔ہاں گھومنے کو کہہ دیجیے تو دن بھر گھوما کرے۔کیوں اندو! جھوٹ کہتی ہوں؟

اندو: تو کیا کروں؟ من بھر سونا لادے بیٹھی رہوں؟ مجھے تو اس طرح اپنے جسم کو جکڑنا اچھا نہیں لگتا۔

رانی: سنی آپ نے اس کی باتیں؟ گہنوں سے اس کا جسم جکڑ جاتا ہے۔آئیے! اب آپ کو اپنے مکان کی سیر کراؤں۔

مسز سیوک: مسٹر سیوک باہر کھڑے میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔دیر ہوگی

رانی: وہ اتنی جلدی! کم از کم آج یہاں کھانا تو تناول فرمالیجیے۔لنچ کھا کر ہوا کھانے چلیں۔پھر لوٹ کر کچھ دیر گپ شپ کریں۔رات کا کھانا کھا لینے کے بعد میری موٹر آپ کو گھر پہنچا دے گی۔

مسز سیوک انکار نہ کرسکیں۔رانی نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور اپنے محل کی سیر کرانے لگیں۔ نصف گھنٹہ تک مسز سیوک گویا عالم طلسمات کی سیر کرتی رہیں۔محل کیا تھا۔تفریح، آسائش، شوق اور عظمت کا تماشا گاہ تھا۔سنگ مرمر کے فرش پر قیمتی قالین بچھے ہوئے تھے۔چلتے وقت ان میں پیر گھس جاتے تھے۔دیواروں پر دلفریب مرصع کاری، کمروں کی دیواروں پر بڑے بڑے قد آدم آئینے، نقش و نگار اس قدر خوب صورت کہ آنکھیں محو ہو جائیں۔شیشہ کی قیمتی کمیاب اشیاء، قدیم مصوروں کی صنعت کے نمونے، چینی کے بڑھیا گلدان، جاپان، چین، یونان اور ایران کے صنعتی کمال کی عمدہ مثالیں۔سونے کے گملے، لکھنو کے بولتے ہوئے کھلونے، اٹلی کے بنے ہوئے ہاتھی دانت کے پلنگ، لکڑی کے نفیس طاق، دیوار گیریں، کشتیاں، آنکھوں کو لبھانے والی پنجروں میں چہکتی ہوئی طرح طرح کی چڑیاں، صحن میں سنگ مرمر کا حوض اور اس کے کنارے سنگ مرمر کی حوریں۔مسز سیوک

نے ان ساری چیزوں میں سے کسی کی تعریف نہیں کی۔ کہیں بھی حیرت یا مسرت کا ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالا۔ انہیں خوشی کے بجائے حسد ہوتا تھا۔ حسد میں قدر دانی کا مادہ نہیں ہوتا۔ وہ سوچ رہی تھیں۔ ایک یہ خوش قسمت ہیں کہ خدا نے ان کو عیش و تکلف، آرائش و تفریح کی اتنی چیزیں دے رکھی ہیں ایک بد قسمت میں ہوں کہ جھونپڑے میں پڑی ہوئی دن کاٹ رہی ہوں! سجاوٹ اور بناوٹ کا تو ذکر ہی کیا۔ ضروری چیزیں بھی کافی نہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ ہم صبح سے شام تک جان توڑ محنت کرتے ہیں۔ یہاں کوئی تنکا تک نہیں اٹھاتا۔ لیکن اس کا غم کیا؟ آسمان کی بادشاہت میں تو امیروں کا حصہ نہیں۔ وہ تو ہماری میراث ہوگی۔ امیر لوگ کتوں کی طرح دھتکارے جائیں گے۔ کوئی جھانکنے تک نہ پائے گا۔

اس خیال سے انہیں گونہ تشفی ہوئی۔ حسد کی ہمہ گیری ہی مساوات عامہ کے اصولوں کی ہردلعزیزی کا سبب ہے۔ رانی صاحبہ کو تعجب ہو رہا تھا کہ ان کو میری کوئی چیز پسند نہ آئی۔ کسی چیز کی تعریف نہ کی۔ میں نے ایک ایک تصویر اور ایک ایک پیالہ کے لیے ہزاروں روپے خرچ کیے ہیں۔ ایسی چیزیں یہاں اور کس کے پاس ہیں۔ اب نایاب ہیں۔ لاکھوں روپے خرچ کرنے پر بھی نہ ملیں گی۔ کچھ نہیں یا تو یہ بن رہی ہیں یا ان میں اتنی پرکھ نہیں کہ ایسی چیزوں کی قدر کر سکیں۔

اتنے پر بھی رانی صاحبہ مایوس نہیں ہوئیں۔ ان کو اپنا باغ دکھانے لگیں۔ طرح طرح کے پھول اور پودے دکھائے مالی بڑا ہوشیار تھا۔ ہر پودے کے حالات و اوصاف بیان کرتا جاتا تھا۔ کہاں سے آیا، کب آیا، کس طرح نصب کیا گیا۔ کیسے اس کی حفاظت کی جاتی ہے۔ پر مسز سیوک کا منہ اب بھی نہ کھلا۔ یہاں تک کہ آخر میں اس نے ایک ایسی ننھی سی جڑی بوٹی دکھائی جو یروشلم سے لائی گئی تھی۔ کنور صاحب اسے خود ہی نہایت احتیاط سے لائے تھے اور اس میں ایک ایک پتی کا نکلنا ان کے لیے ایک ایک خوشخبری تھی۔ مسز سیوک نے فوراً ہی اس گملے کو اٹھالیا۔ اسے آنکھوں سے لگایا اور پتیوں کو بوسہ دیا بولیں ''

میری خوش نصیبی ہے کہ اس نایاب شے کی زیارت نصیب ہوئی‘‘ رانی نے کہا’’ کنور صاحب خود اس کی نہایت قدر کرتے ہیں۔ اگر یہ آج خشک ہو جائے تو دو روز تک وہ یقیناً کھانا نہ کھائیں‘‘

اس اثنا میں چائے تیار ہوئی۔ مسز سیوک لنچ پر بیٹھیں۔ رانی جی کو چائے سے رغبت نہ تھی۔ و نے اور اندو کے بارے میں باتیں کرنے لگیں۔ و نے کے عادات و اخلاق، خدمت و اطاعت، جود و سخا کی تعریف کی۔ یہاں تک کہ مسز سیوک کا جی اکتا گیا۔ اس کے جواب میں وہ اپنی اولاد کی ثنا خوانی نہ کر سکتی تھیں۔

ادھر مسٹر جان سیوک اور کنور صاحب دیوان خانہ میں بیٹھے لنچ تناول کر رہے تھے۔ چائے اور انڈوں سے کنور صاحب کو رغبت نہ تھی۔ و نے بھی ان دونوں چیزوں کو قابل ترک سمجھتے تھے۔ جان سیوک ان آدمیوں میں تھے جن کی شخصیت جلد ہی دوسرے کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ ان کی باتیں اس قدر عالمانہ ہوتی تھیں کہ اور لوگ اپنی باتیں بھول کر انہیں کی سننے لگتے تھے۔ اور یہ بات نہ تھی کہ ان کی گفتگو میں فقط لسانی ہو۔ ان کے معلومات وسیع تھے۔ ان کو طبائع انسانی کا اچھا خاصا تجربہ تھا۔ ذہانت خداداد تھی جس کے بغیر کسی مجلس میں عزت نہیں مل سکتی۔ اس وقت وہ ملک کی صنعت و حرفت کی تباہی پر اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔ موقع سے ان تجاویز کا بھی ذکر کرتے جاتے تھے جو ان حالات کے اصلاح کی لیے انہوں نے سوچ رکھی تھیں۔ آخر میں بولے ہمارے ملک کی نجات صنعت و حرفت کی ترقی میں ہے۔ اس سگریٹ کے کارخانہ سے کم از کم ایک ہزار آدمیوں کے کسب معاش کی صورت نکل آئے گی اور ان کا بار زراعت کے سر سے دور ہو جائے گا۔ جتنی زمین کو ایک شخص بخوبی کاشت کر سکتا ہے اس میں گھر بھر کا لگا رہنا بالکل فضول ہے۔ میرا کارخانہ ایسے بیکاروں کو اپنی روٹی کمانے کا موقع دے گا۔

کنور صاحب: لیکن جن کھیتوں میں اس وقت اناج بویا جاتا ہے انہیں میں تمباکو کی کاشت ہوگی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ اناج اور مہنگا ہو جائے گا۔

جان سیوک: میری سمجھ میں تمبا کو کی کاشت کا اثر جوٹ، سن، تلہن اور افیون پر پڑے گا۔ رفتنی والی جنس کچھ کم ہو جائے گی۔ غلہ پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ پھر ہم اس اراضی کو بھی مزروعہ بنانے کی کوشش کریں گے جو ابھی تک برتی پڑی ہوئی ہے۔

کنور صاحب: لیکن تمبا کو کوئی اچھی چیز تو نہیں۔ اس کا شمار مسکرات میں ہے اور اس کا اثر صحت پر برا ہی پڑتا ہے۔

جان سیوک: (ہنس کر) یہ سب ڈاکٹروں کی محض فرضی باتیں ہیں، جن پر سنجیدگی سے غور کرنے کی مطلقاً ضرورت نہیں۔ ڈاکٹروں کی رائے کے مطابق اگر ہم زندگی بسر کرنا چاہیں تو زندی کا خاتمہ ہی ہو جائے۔ دودھ میں دق وسل کے جراثیم ہیں۔ گھی میں چربی کی مقدار زیادہ ہے۔ چائے اور قہوہ محرک ہیں۔ یہاں تک کہ سانس لینے سے بھی امراض کے جراثیم بدن میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ان کے کہنے کے مطابق تو ساری دنیا کیڑوں سے بھری ہوئی ہے جو ہماری جان لینے پر تلے ہوئے ہیں۔ کاروباری لوگ ان گورکھ دھندوں میں نہیں پھنستے۔ ان کا تعلق صرف حالات حاضرہ سے ہوا کرتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے یہاں ممالک غیر سے کروڑوں روپے کے سگریٹ اور سگار آتے ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ اس روپیوں کے بہاؤ کو دوسرے ملکوں میں جانے سے روکیں۔ اس کے بغیر ہماری اقتصادی زندگی کی نمو نا ممکن ہے۔

یہ کہہ کر انہوں نے کنور صاحب کو فاتحانہ انداز سے دیکھا۔ کنور صاحب کے شکوک بہت کچھ رفع ہو چکے تھے۔ عموماً معترض کو لاجواب ہوتے دیکھ کر ہم زیادہ دلیر ہو جاتے ہیں۔ بچہ بھی بھاگتے ہوئے کتے پر بے خوف ہو کر پتھر پھینکتا ہے۔

جان سیوک بے خوف ہو کر بولے: میں نے ان تمام پہلوؤں پر غور کر کے یہ رائے قائم کی اور آپ کے خادم کو (پربھو سیوک کی طرف اشارہ کر کے) اس فن میں ماہر ہونے کے لیے امریکہ بھیجا۔ میری کمپنی کے پیشتر حصے فروخت ہو چکے ہیں لیکن ابھی روپے نہیں وصول ہوئے۔ ان اطراف میں ابھی تک مشترکہ کاروبار کرنے کا رواج نہیں۔

لوگوں میں اعتبار نہیں۔ اس لیے میں ابھی نے صرف دس فی صدی سرمایہ وصول کر کے کام شروع کر دینا تجویز کیا ہے۔ سال دو سال میں جب امید سے زیادہ کامیابی ہو گی اور سالانہ نفع ہونے لگے گا تو سرمایہ خود بخود دوڑا ہوا چلا آئے گا۔ چھت پر بیٹھا ہوا کبوتر آ آ کی آواز سن کر خوف زدہ ہو جاتا ہے اور زمین پر نہیں اترتا، مگر تھوڑا سا دانہ بکھیر دیجیے تو فوراً اتر آتا ہے۔ مجھے یقین کامل ہے کہ اول ہی سال ہم کو 25 فی صدی نفع ہو گی۔ پراسپکٹس حاضر ہے۔ اسے بغور ملاحظہ فرمائیے۔ میں نے منافع کا اندازہ کرنے میں نہایت احتیاط سے کام لیا ہے۔ خواہ زیادہ ہو جائے کم تو ہو ہی نہیں سکتا۔

کنور صاحب: پہلے ہی سال 25 فی صدی

جان سیوک: جی ہاں بڑی آسانی سے، آپ سے میں حصہ خریدنے کی درخواست کرتا، لیکن جب تک ایک سال کا منافع دکھلا نہ دوں اصرار نہیں کر سکتا۔ ہاں یہ ضرور عرض کروں گا کہ اس حالت میں ممکن ہے حصے برابر پر نہ مل سکیں۔ سو کے حصے شاید دو سو پر ملیں۔

کنور صاحب: مجھے اب ایک ہی شک اور ہے۔ اگر اس کاروبار میں اس قدر منافع ہو سکتا ہے تو اب تک ایسی اور کمپنیاں کیوں نہ قائم ہوئیں؟

جان سیوک: (ہنس کر) اس لیے کہ ابھی تک تعلیم یافتہ جماعت میں کاروبار میں تمیز پیدا نہیں ہوئی۔ لوگوں کی رگ رگ میں غلامی بھری ہوئی ہے۔ وکالت یا سرکاری ملازمت کے سوا اور کسی طرف نگاہ جاتی ہی نہیں۔ دو چار کمپنیاں کھلیں بھی لیکن انہیں کسی ماہر کی رائے اور تجربہ سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں ملا۔ اگر ملا بھی تو بہت مہنگا پڑا۔ مشینری منگانے میں ایک کے دو دینے پڑے۔ بندوبست معقول نہ ہو سکا۔ مجبوراً ان کا کاروبار بند کرنا پڑا۔ یہاں بالعموم سبھی کمپنیوں کا یہی حال ہے۔ ڈائرکٹروں کی جیبیں بھری جاتی ہیں۔ حصے بیچنے اور اشتہار دینے میں لاکھوں روپے اڑا دیئے جاتے ہیں۔ نہایت فیاضی سے دلالوں کی خاطر تواضع کی جاتی ہے۔ عمارتوں پر سرمایہ کا بیشتر حصہ صرف کر دیا جاتا ہے۔ مینجر کو بھی بہت زیادہ تنخواہ دی جاتی ہے۔ نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ ڈائریکٹر صاحبان اپنی

جیبیں بھرتے ہیں۔منیجر اپنی تنخواہ سے مستفید ہوتا ہے۔دلال اپنی دلالی لیتا ہے۔مطلب یہ ہے کہ اس طرح سارا سرمایہ اوپر ہی اڑ جاتا ہے۔میرا اصول ہے کم سے کم خرچ اور زیادہ سے زیادہ نفع۔میں نے دلالی ایک کوڑی نہیں دی۔اشتہاروں کی مداڑا دی۔یہاں تک کہ میں نے منیجر کو بھی صرف پانچ سو روپے مشاہرہ دینا طے کیا ہے۔حالانکہ کسی دوسرے کارخانہ میں ایک ہزار آسانی سے مل جاتے ہیں۔اس پر گھر کا آدمی۔ڈائریکٹروں کے بارے میں بھی میری یہ تجویز ہے کہ سفر خرچ کے سوا اور کچھ نہ دیا جائے۔

کنور صاحب دنیاوی آدمی نہ تھے۔ان کا زیادہ وقت صرف مذہبی کتب کے مطالعہ کے نذر ہوتا تھا۔وہ کسی ایسے کام میں شریک نہ ہونا چاہتے تھے جو ان کی مذہبی یکسوئی میں خلل انداز ہو۔برے لوگوں نے انہیں انسانی عادات کا نکتہ چین بنا دیا تھا۔انہیں کسی پر اعتبار نہ ہوتا تھا۔مدرسوں اور یتیم خانوں کو چندہ دیتے ہوئے وہ بہت ڈرتے تھے اور اکثر ان معاملات میں حدود مناسب سے بھی تجاوز کر جاتے تھے۔مستحقین کو بھی ان سے مایوس ہو جانا پڑتا تھا، لیکن احتیاط میں نفع کا یقین ہو جانے پر حد سے زیادہ بے احتیاطی پیدا ہو جاتی ہے۔مسٹر جان سیوک کی تقریر تاجرانہ معاملہ فہمی سے مملو تھی، مگر کنور صاحب پر اس سے زیادہ اثر ان کی شخصیت کا پڑا۔وہ اب ان کی نگاہوں میں صرف دولت کے پجاری نہ تھے، بلکہ ایک خیر خواہ دوست۔ایسا شخص انہیں مغالطہ نہ دے سکتا تھا۔بولے، جب آپ اتنی کفایت سے کام کریں گے تو آپ کا کارخانہ ضرور سرسبز ہوگا۔اس میں کوئی شبہ نہیں۔ آپ کو شاید ابھی معلوم نہ ہو۔میں نے یہاں ایک سیوا سمتی قائم کر رکھی ہے۔کچھ دنوں سے یہی خبط سوار ہے۔اس میں اس وقت تقریباً ایک سو والنٹیر ہیں۔میلوں میں عوام کی حفاظت اور خدمت کرنا اس کا کام ہے۔میں چاہتا ہوں کہ اس کو مالی مشکلات سے ہمیشہ کے لیے فراغت کر دوں۔ہمارے یہاں کی کام کرنے والی جماعتیں اکثر روپیہ کی کمی کی وجہ سے صرف چند روز زندہ رہتی ہیں۔میں اپنی اس جماعت کو مضبوط بنانا چاہتا ہوں اور میری یہ دلی تمنا ہے کہ اس سے ملک میں کچھ بہتری ہو۔میں اس کام میں کسی سے کچھ مدد

نہیں لینا چاہتا۔ اس کو بلا کسی رکاوٹ کے جاری رکھنے کے لیے میں ایک مستقل سرمایہ کی فراہمی کا بندوبست کر دینا چاہتا ہوں۔ میں آپ کو اپنا دوست اور خیر خواہ سمجھ کر دریافت کرتا ہوں کہ کے آپ کے کارخانے میں حصہ لے لینے سے میرا مقصد حاصل ہو سکتا ہے؟ آپ کے خیال میں کس قدر روپیہ لگا دینے سے ایک ہزار ماہوار کی آمدنی ہو سکتی ہے۔

جان سیوک کی کاروباری طمع نے ابھی ان کے نیک ارادوں کو زائل نہیں کر دیا تھا۔ کنور صاحب نے ان کی رائے پر فیصلہ چھوڑ کر انہیں شش و پنج میں ڈال دیا۔ اگر ان کو پہلے سے معلوم ہوتا کہ یہ مسئلہ درپیش ہو گا تو نفع کا تخمینہ بتلانے میں زیادہ احتیاط سے کام لیتے۔ غیروں سے چال بازی کرنا قابل عفو سمجھا جاتا ہے، لیکن ایسے خود غرضی کے بندے کم ملیں گے جو دوستوں سے دغا کریں۔ سادہ مزاج کے آدمیوں کے سامنے فریب بھی شرمندہ ہو جاتا ہے۔

جان سیوک ایسا جواب دینا چاہتے تھے جس میں اپنے فائدہ کا لحاظ بھی ہو اور اپنے ضمیر کا بھی بولے، ''کمپنی کی جو کچھ حالت ہے وہ میں نے بے کم و کاست آپ سے بیان کر دی۔ اس کے جاری رکھنے کی ترکیبیں بھی آپ سے بتلا چکا ہوں۔ میں نے کامیابی کے جملہ ذرائع پر نگاہ رکھی ہے۔ اس پر بھی ممکن ہے مجھ سے غلطیاں ہو گئی ہوں۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ انسان خدا کے ہاتھوں کا صرف ایک کھلونا ہے۔ اس کا سارا قیاس، ساری عقل مندی، ساری خیر اندیشی قدرتی طاقت کے محتاج ہیں۔ تمباکو کی پیداوار بڑھانے کے لیے کاشتکاروں کو پیشگی رقمیں دینی ہی پڑیں گی۔ ایک رات کا پالا کمپنی کے لیے مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔ جلتے ہوئے سگریٹ کا ایک ٹکڑا کل کارخانہ کو خاک سیاہ کر سکتا ہے۔ ہاں میری محدود عقل کی وسعت جہاں تک ہے، میں نے کوئی بات مبالغہ کے ساتھ نہیں کہی ہے۔ ناگہانی حادثات کے خیال سے آپ نفع کے تخمینہ میں کسی قدر تخفیف کر سکتے ہیں۔''

کنور صاحب: آخر کہاں تک؟

جان سیوک: بیس فی صد سمجھیے

کنور صاحب: اور پہلے سال!

جان سیوک: کم از کم پندرہ فی صدی

کنور صاحب: میں پہلے سال دس اور اس کے بعد پندرہ فیصدی پر قناعت کر سکوں گا۔

جان سیوک: تو پھر میں آپ سے یہی کہوں گا کہ آپ حصے خریدنے میں توقف نہ کریں۔ خدا نے چاہا تو آپ کو کبھی مایوسی نہ ہوگی۔

حصے سو روپے کے تھے۔ کنور صاحب نے پانچ سو حصے خرید لینے کا وعدہ کیا۔ اور بولے "کل اول قسط کے دس ہزار روپے بینک کی معرفت آپ کے پاس بھیج دوں گا۔"

جان سیوک کا زیادہ سے زیادہ تخمینہ بھی اس حد تک کا نہ تھا لیکن وہ اس کامیابی پر خوش نہ ہوئے۔ ان کا ضمیر اب بھی انہیں ملامت کر رہا تھا۔ تم نے ایک سادہ مزاج شریف آدمی کو دھوکا دیا۔ تم نے ملک کی تجاتی ترقی کے لئے نہیں بلکہ اپنے فائدہ کے لئے یہ کوشش کی ہے۔ ملک کے خادم بن کر تم اپنی پانچوں انگلیاں گھی میں رکھنا چاہتے ہو۔ تمہارا دلی منشا یہی ہے کہ منافع کا معتدبہ حصہ کسی نہ کسی حیلہ سے خود ہضم کرو۔ تم نے اس کہاوت پر عمل کیا کہ بنیا مارے جان۔ چور مارے انجان۔

اگر کنور صاحب کی شرکت سے عوام میں کمپنی کی ساکھ قائم ہو جانے کا یقین نہ ہوتا تو مسٹر جان سیوک صاف کہہ دیتے کہ کمپنی اتنے حصے آپ کو نہیں دے سکتی۔ ایک مفید خلایق جماعت کے روپے کو کسی مشتبہ کاروبار میں لگا کر اس کی ہستی کو معرض خطر میں ڈالنا خودغرضی کے لئے بھی ایک لقمہ تلخ تھا، مگر دولت کا دیوتا ضمیر کی قربانی ہوئے بغیر خوش نہ ہوتا۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ اب تک وہ اس کام کو محض ذاتی نفع کے لئے کرنا چاہتے تھے۔ ان کی نیت صاف نہیں تھی۔ منافع کو مختلف ناموں سے اپنے ہی ہاتھ میں رکھنا چاہتے تھے۔ اب انہوں نے بے لوثی کے ساتھ نیک نیتی سے برتاؤ

کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ بولے۔ ''میں کمپنی کے منتظم کی حیثیت سے اس امداد کے لیے آپ کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔ خدا نے چاہا تو آپ کو اس اپنے فیصلہ پر کبھی کف افسوس نہ ملنا پڑے گا۔ اب میں آپ سے ایک اور استدعا کرتا ہوں۔ کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ۔ میں نے کارخانہ کے لیے جو زمین پسند کی ہے، وہ پانڈے پور کے آگے پختہ سڑک پر واقع ہے۔ ریلوے اسٹیشن بھی وہاں سے نزدیک ہے اور قرب و جوار میں بہت سے موضع ہیں۔ رقبہ دس بیگہ کا ہے۔ زمین پرتی پڑی ہوئی ہے۔ ہاں گاؤں کے مواشی اس میں چرنے آیا کرتے ہیں۔ اس کا مالک ایک اندھا فقیر ہے۔ اگر آپ کبھی اس طرف ہوا خوری کے لیے گئے ہوں گے تو آپ نے اس اندھے کو ضرور دیکھا ہوگا۔''

کنور صاحب: ہاں ہاں۔ ابھی تو کل ہی گیا تھا۔ وہی اندھا ہے۔ نا؟ کالا کالا۔ دبلا دبلا۔ جو گاڑیوں کے پیچھے دوڑا کرتا ہے؟

جان سیوک: جی ہاں۔ وہی وہی۔ وہ زمین اسی کی ہے، مگر وہ اس زمین کو کسی قیمت پر بھی نہیں دینا چاہتا۔ میں اسے پانچ ہزار تک دیتا تھا وہ راضی نہ ہوا۔ وہ کچھ سڑی سا ہے۔ کہتا ہے میں یہاں دھرم سالہ، مندر اور تالاب بنواؤں گا۔ دن بھر بھیک مانگ کر تو گزر کرتا ہے۔ اس پر ارادے اتنے بلند ہیں۔ شاید محلّہ والوں کے خوف سے اسے کوئی معاملہ کرنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ میں ایک ذاتی معاملہ میں حکام سے مدد لینا مناسب نہیں سمجھتا، لیکن ایسی حالت میں بجز اس کے اور کوئی چارہ نظر نہیں آتا اور پھر یہ بالکل میرا ذاتی معاملہ بھی نہیں ہے۔ میونسپلٹی اور سرکار دونوں کو اس کارخانہ سے ہزاروں روپے کی آمدنی ہوگی۔ ہزاروں تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ لوگوں کا بھلا ہوگا۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو یہ ایک قومی کام ہے اور پس سرکار سے امداد حاصل کرنے میں میں واجبیت کے خلاف نہیں کرتا۔ اگر آپ ذرا توجہ کریں تو نہایت آسانی سے کام نکل جائے۔

کنور صاحب: میرا اس فقیر پر کوئی دباؤ نہیں۔ اور ہوتا بھی تو میں اس سے کام نہ لیتا۔

جان سیوک: آپ راجہ صاحب چتاری.........

کنور صاحب: نہیں میں ان سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ وہ میرے داماد ہیں اور اس معاملہ میں میرا ان سے کہنا قرین مصلحت نہیں ہے۔ کیا وہ آپ کے حصہ دار نہیں ہیں؟

جان سیوک: جی نہیں۔ وہ خود بے انتہا دولت کے مالک ہو کر بھی دولت مندوں سے بے اعتنائی برتتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ کل کارخانے سرمایہ داروں کا قابو بڑھا کر عوام کو مضرت پہنچاتے ہیں۔ انہیں خیالات نے تو ان کو یہاں چیئرمین بنا دیا۔

کنور صاحب: یہ تو اپنا اپنا عقیدہ ہے۔ ہم دو رنگی زندگی بسر کر رہے ہیں اور میرا خیال ہے کہ حقوق عامہ کے حامی جتنے اونچے درجہ کے لوگوں میں ملیں گے، اتنے نیچے درجہ کے آدمیوں میں نہ ملیں گے۔ خیر آپ ان سے مل کر دیکھئے تو۔ کیا کہوں شہر کے متصل میری ایک ایکڑ زمین بھی نہیں ہے۔ ورنہ آپ کو یہ دقت نہ ہوتی۔ میرے لائق اور جو کام ہو اس کے لیے حاضر ہوں۔

جان سیوک: جی نہیں۔ میں آپ کو زیادہ تکلیف نہیں دینا چاہتا۔ میں خود ان سے مل کر طے کر لوں گا۔

کنور صاحب: ابھی تو مس صوفیہ کامل صحت یاب ہونے تک یہیں رہے گی نا؟ آپ کو تو اس میں کوئی عذر نہیں ہے؟

مسٹر جان سیوک اس بارے میں صرف دو چار باتیں کر کے یہاں سے رخصت ہوئے۔ مسز سیوک فٹن پر پہلے ہی سے آ بیٹھی تھیں۔ پربھو سیوک ونے کے ساتھ باغ میں ٹہل رہے تھے۔ ونے نے آ کر جان سیوک سے ہاتھ ملایا۔ پربھو سیوک ان سے اگلے روز پھر ملنے کا وعدہ کر کے جان سیوک کے ساتھ چلے۔ راستہ میں باتیں ہونے لگیں۔

جان سیوک: آج ایک ملاقات میں جتنا کام ہوا، اتنا مہینوں کی دوا دوش سے بھی نہ ہوا تھا۔ کنور صاحب نہایت شریف آدمی ہیں۔ پچاس ہزار کے حصے خرید لیے۔ ایسے ہی دو چار بھلے آدمی اور مل جائیں تو بیڑا پار ہے۔

پربھو سیوک: اس گھر کے سبھی لوگ دیا اور دھرم کے پتلے ہیں۔ میں نے ونے سنگھ جیسا رموز شاعری سے واقف شخص نہیں دیکھا۔ مجھے تو ان سے بے حد محبت ہوگئی ہے۔

جان سیوک: کچھ کام کی بات چیت بھی کی؟

پربھو سیوک: جی نہیں۔ آپ کے نزدیک جو کام کی بات چیت ہے، ان کو اس سے ذرا رغبت نہیں۔ وہ خدمت عامہ کا عہد کر چکے ہیں اور راتنی دیر تک اپنی سیوا سمتی کی ہی چرچا کرتے رہے۔

جان سیوک: کیا تم کو یہ امید ہے کہ تمہاری ملاقات چتاری کے راجہ صاحب پر بھی کچھ اثر ڈال سکتی ہے؟ ونے سنگھ راجہ صاحب سے ہمارا کچھ کام نکلوا سکتے ہیں؟

پربھو سیوک: ان سے کہے کون؟ مجھ میں تو اتنی ہمت نہیں ہے۔ انہیں آپ وطن پرست سنیاسی سمجھئے۔ مجھ سے اپنی سمتی میں شامل ہو جانے کے لیے بہت اصرار کیا ہے۔

جان سیوک: شامل ہو گئے نا؟

پربھو سیوک: جی نہیں۔ کہہ آیا ہوں کہ سوچ کر جواب دوں گا۔ بلا غور و خوض کے ایسا مشکل عہد کس طرح کر لیتا؟

جان سیوک: مگر سوچنے سمجھنے میں مہینوں نہ لگا دینا۔ دو چار روز میں آ کر نام لکھا لینا۔ جبھی تم کو ان سے کچھ کام کی باتیں کرنے کا حق حاصل ہو جائے گا (بیوی سے) تمہاری رانی صاحبہ سے کیسی نبھی؟

مسز سیوک: مجھے تو ان سے نفرت ہو گئی۔ میں نے کسی میں اتنا غرور نہیں دیکھا۔

پربھو سیوک: ماما! آپ ان کے ساتھ سخت ناانصافی کر رہی ہیں۔

مسز سیوک: تمہارے لیے دیوی ہوں گی۔ میرے لیے تو نہیں ہیں۔

جان سیوک: یہ تو میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ تمہاری ان سے نہ پٹے گی۔ کام کی باتیں نہ تمہیں آتی ہیں، نہ انہیں۔ تمہارا کام تو دوسروں میں عیب نکالنا ہے۔ صوفی کو کیوں نہیں لائیں؟

مسز سیوک: وہ آئے بھی تو یا جبراً گھسیٹ لاتی؟

جان سیوک: آئی نہیں یا رانی نے آنے نہیں دیا؟

پربھو سیوک: وہ تو آنے کو تیار تھی، مگر اسی شرط پر کہ مجھ پر مذہبی معاملات میں کوئی جبر نہ کیا جائے۔

جان سیوک: انہیں یہ شرط کیوں منظور ہونے لگی؟

مسز سیوک: ہاں۔ اس شرط پر میں اس کو نہیں لا سکتی۔ وہ میرے گھر رہے گی تو میری بات ماننی پڑے گی؟

جان سیوک: تم دونوں میں سے ایک کو بھی عقل سے سروکار نہیں۔ تم احمق ہو۔ وہ ضدی۔ اس کو کسی طرح منا کر جلد لانا چاہیے۔

پربھو سیوک: اگر ماما اپنی بات پر اڑی رہیں گی تو شاید وہ پھر گھر نہ جائے۔

جان سیوک: آخر جائے گی کہاں؟

پربھو سیوک: اسے کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ رانی اس پر جان دیتی ہیں۔

جان سیوک: یہ بیل منڈھے چڑھنے کی نہیں۔ دو میں سے ایک کو دبنا پڑے گا۔

لوگ گھر پہنچے تو گاڑی کی آہٹ پاتے ہی ایشور سیوک نے بڑے محبت آمیز اشتیاق کے ساتھ پوچھا۔ ''صوفی آ گئی نا؟ آ تجھے گلے لگا لوں، یسوع تجھے دامن میں لے!''

جان سیوک: پاپا! وہ ابھی یہاں آنے کے قابل نہیں ہے۔ بہت کمزور ہو گئی ہے۔ دو چار دن کے بعد آئے گی۔

ایشور سیوک: غضب خدا کا! اس کی یہ حالت ہے اور تم سب اسے اس کے حال پر چھوڑ آئے! کیا تم لوگوں میں ذرا بھی غیرت و حمیت نہیں؟ بالکل خون سفید ہو گیا؟

مسز سیوک: آپ جا کر اس کی خوشامد کیجیے گا تو آئے گی۔ میرے کہنے سے تو نہیں آئی۔ بچی تو نہیں کہ گود میں اٹھا لاتی۔

جان سیوک: پاپا! وہاں بہت آرام سے ہے۔ راجہ اور رانی دونوں ہی اس کے ساتھ محبت کرتے ہیں۔ سچ پوچھیے تو رانی ہی نے اس کو نہیں چھوڑا۔

ایشور سیوک: کنور صاحب سے کچھ کام کی بات چیت بھی ہوئی؟

جان سیوک: جی ہاں مبارک ہو۔ پچاس ہزار کی رقم ہاتھ لگی۔

ایشور سیوک: شکر ہے شکر ہے۔ یسوع! مجھ پر اپنا سایہ کر۔

(4)

شریر لڑکوں کے لیے اندھے دل بہلاؤ کی چیز ہوا کرتے ہیں۔ سورداس کو ان کی بے رحمانہ حرکتوں سے اتنی تکلیف ہوتی تھی کہ وہ منہ اندھیرے گھر سے نکل پڑتا اور چراغ جلنے کے بعد واپس آتا۔ جس روز اس کو جانے میں دیر ہو جاتی، اس دن وہ بڑی مصیبت میں مبتلا ہو جاتا۔ سڑک پر راہ گیروں کے سامنے اس کو کوئی خوف نہ تھا، لیکن آبادی کی گلیوں میں قدم قدم پر کسی سانحہ کا اندیشہ قائم رہتا۔ کوئی اس کی لاٹھی چھین کر بھاگتا۔ کوئی کہتا۔ ''سورداس! سامنے گڑھا ہے! بائیں ہاتھ ہو جاؤ۔'' سورداس ادھر گھومتا تو گڑھے میں گر پڑتا، مگر بجرنگی کا لڑکا گھیسو اتنا شریر تھا کہ وہ محض سورداس کو چھیڑنے کے لیے گھڑی رات رہے، اٹھ بیٹھتا۔ اس کی لاٹھی چھین کر بھاگنے میں اسے بڑی خوشی ہوتی۔

ایک روز قبل طلوع آفتاب سورداس گھر سے چلے تو گھیسو ایک تنگ گلی میں چھپا ہوا کھڑا تھا۔ سورداس کو وہاں پہنچتے ہی کچھ شک ہوا۔ وہ کھڑا ہو کر آہٹ لینے لگا۔ اب گھیسو ہنسی کو ضبط نہ کر سکا۔ اس نے جھپٹ کر سورداس کا ڈنڈا پکڑ لیا۔ سورداس ڈنڈے کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا۔ گھیسو نے پورے طاقت سے کھینچا۔ ہاتھ پھسل گیا۔ اپنے ہی زور میں گر پڑا۔ سر میں چوٹ لگی۔ خون نکل آیا۔ اس نے خون دیکھا تو چیختا چلاتا گھر پہنچا۔ بجرنگی نے پوچھا۔ ''کیوں روتا ہے رے! کیا ہوا؟'' گھیسو نے اس کو کچھ جواب نہ دیا۔ لڑکے خوب جانتے ہیں کہ کس عدالت میں ان کی

جیت ہوگی۔ جا کر اپنی ماں سے بولا۔ ''سورداس نے مجھے دھکیل دیا'' ماں سے سر کی چوٹ کا خون دیکھا تو آنکھوں میں خون اتر آیا۔ لڑکے کا ہاتھ پکڑے ہوئے بجرنگی کے سامنے جا کھڑی ہوگئی۔ اور بولی۔ ''اب اس اندھے کی شامت آ گئی ہے۔ لڑکے کو ایسا دھکیلا کہ لہولہان ہوگیا۔ اس کی اتنی ہمت؟ روپیہ کا گھمنڈ اتار دوں گی!''

بجرنگی نے مصالحانہ لہجہ میں کہا۔ ''اسی نے کچھ چھیڑا ہوگا۔ وہ بےچارہ تو اس سے آپ اپنی جان چھپاتا پھرتا ہے۔''

جمنی: اسی نے چھیڑا تھا سہی۔ تو بھی کیا اس کو اتنی بیدردی سے دھکیل دینا چاہیے تھا کہ سر پھٹ جائے؟ اندھوں کو سبھی لڑکے چھیڑتے ہیں، پر وہ سب سے لٹھیاؤ نہیں کرتے پھرتے۔

اتنے میں سورداس بھی آ کر کھڑا ہوگیا۔ چہرہ سے ندامت برس رہی تھی۔ جمنی لپک کر اس کے سامنے آئی اور بجلی کی طرح کڑک کر بولی۔ ''کیوں سورداس؟ شام ہوتے ہی روز لوٹیا لے کر دودھ کے لیے سر پر سوار ہو جاتے ہو اور ابھی گھیسو نے ذرا لاٹھی پکڑ لی تو اسے اتنی زور سے دھکا دیا کہ اس کا سر پھٹ گیا۔ جس پتل میں کھاتے ہو، اسی میں چھید کرتے ہو۔ کیوں روپے کا گھمنڈ ہوگیا ہے کیا؟''

سورداس: بھگوان جانتے ہیں جو میں نے گھیسو کو پہچانا ہو۔ سمجھا کوئی شریر لونڈا ہوگا۔ لاٹھی کو مضبوط پکڑے رہا۔ گھیسو کا ہاتھ پھسل گیا۔ وہ گر پڑا۔ مجھے معلوم ہوتا کہ گھیسو ہے تو لاٹھی اس کو دے دیتا۔ اتنے دن ہوگئے کوئی مجھے کہہ دے کہ میں نے کسی لڑکے کو جھوٹ موٹ بھی مارا ہے۔ تمہارا ہی دیا کھاتا ہوں۔ تمہارے ہی لڑکے کو ماروں گا۔

جمنی: نہیں اب تمہیں گھمنڈ ہوگیا ہے۔ بھیک مانگتے ہو۔ پھر بھی لاج نہیں آتی۔ سب کی برابری کرنے کو پھرتے ہو۔ آج میں لہو کا گھونٹ پی کر رہ گئی نہیں تو جن ہاتھوں سے تم نے اس کو دھکیلا ہے، اس میں ٹوکا لگا دیتی۔

بجرنگی جمنی کو منع کر رہا تھا اور لوگ بھی سمجھا رہے تھے، مگر وہ کسی کی نہ سنتی تھی۔ سورداس

مجرموں کی طرح سر جھکائے پھٹکاریں سن رہا تھا۔منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلتا تھا۔

بھیرو تاڑی اتارنے جا رہا تھا۔رک گیا اور سورداس پر دو چار چھینٹے جما دیئے۔''زمانہ ہی ایسا ہے۔سب روزگاروں سے بڑھ کر بھیک مانگنا۔ابھی چار دن پہلے گھر میں بھونی بھانگ نہ تھی۔اب چار پیسے کے آدمی ہو گئے ہیں۔پیسے ہوتے ہیں تبھی گھمنڈ ہوتا ہے۔نہیں تو کیا گھمنڈ کریں گے ہم اور تم جن کی ایک روپیہ کمائی ہے اور دو کا خرچ ہے۔''

جگدھر اوروں سے تو بھیگی بلی بنا رہتا تھا،سورداس کو لعنت ملامت کرنے کے لیے وہ بھی نکل پڑا۔سورداس پچھتا رہا تھا کہ میں نے لاٹھی کیوں نہ چھوڑ دی۔کون کہے کہ کوئی دوسری لکڑی نہ ملتی؟جگدھر اور بھیرو کے سخت الفاظ سن کر وہ اور بھی ملول ہو رہا تھا۔اسے اپنی بیکسی پر رونا آتا تھا۔اسی اثنا میں مٹھوا بھی آ پہنچا۔یہ بھی شرارت کا پتلا تھا۔گھیسو سے بھی دو انگل بڑھا ہوا۔جگدھر کو دیکھتے ہی یہ بول سنا سنا کر چڑانے لگا۔لالو کا لال منہ جگدھر کا کالا۔جگدھر تو ہو گیا الو کا سالا۔

بھیرو کو بھی اس نے ایک اپنا بنایا ہوا بول سنایا۔''بھیرو بھیرو تاڑی بیچ۔یا بیوی کی ساڑی بیچ۔''

چڑنے والے چڑتے کیوں ہیں؟اس کی تحقیقات تو علم الخیال کے ماہرین بھی کر سکتے ہیں۔ہم نے لوگوں کو بالعموم پریم یا بھگتی کی وجہ سے چڑتے دیکھا ہے۔کوئی رام یا کرشن کے ناموں سے اس لیے چڑتا ہے کہ لوگ اسے چڑانے ہی کے بہانے ایشور کا نام لیں۔کوئی اس لیے چڑاتا ہے کہ لڑکے اس کو گھیرے رہیں۔کوئی بینگن یا مچھلی سے اس لیے چڑاتا ہے کہ لوگ ان نہ کھانے لائق چیزوں سے نفرت کریں۔خلاصہ یہ کہ چڑنا ایک فلسفیانہ عمل ہے۔اس کا مقصد صرف سبق دینا ہے،لیکن بھیرو اور جگدھر میں یہ عقیدت مندانہ فیاضی کہاں۔وہ بچوں کے طفلانہ مشاغل سے لطف اٹھانا کیا جانیں۔دونوں جھلا اٹھے۔جگدھر مٹھوا کو گالیاں دینے لگا،لیکن بھیرو کو محض گالیاں دینے سے صبر نہ ہوا۔اس نے لپک کر مٹھوا کو پکڑ لیا اور دو تین طمانچے زور زور سے جمائے اور نہایت بے رحمی سے اس

کو کان پکڑ کر کھینچنے لگا۔ مٹھوا بلبلا اٹھا۔ سورداس ابھی تک خفت آمیز انداز سے سر جھکائے کھڑا تھا۔ مٹھوا کا رونا سنتے ہی اس کے تیور پر بل پڑ گئے اور چہرہ تمتما اٹھا۔ سر اٹھا کر اندھی آنکھوں سے تاکتا ہوا بولا۔ ''بھیرو! بھلا چاہتے ہو تو اس کو چھوڑ دو۔ نہیں تو ٹھیک نہ ہوگا۔ اس نے تم کو کون سی ایسی گولی مار دی تھی کہ تم اسے مارے ڈالتے ہو۔ کیا سمجھتے ہو کہ اس کے سر پر کوئی ہے ہی نہیں۔ جب تک میں جیتا ہوں، کوئی اسے ٹیڑھی نگاہوں سے دیکھ نہیں سکتا۔ دلاوری تو جب دیکھتا کہ کڑے آدمی سے ہاتھ ملاتے۔ اس لڑکے کو پیٹ دیا تو کون سی بڑی بہادری دکھائی؟''

بھیرو: مارکی اتنی اکھر ہے تو اسے روکتے کیوں نہیں؟ ہم کو چڑائے گا تو ہم پیٹیں گے۔ ایک بار نہیں۔ ہزار بار۔ تم کو جو کرنا ہو کر لو۔

جگدھر: لڑکے کو ڈانٹنا تو دور، اوپر سے اور شہ دیتے ہو۔ وہ تمہارا دولارا ہوگا۔ دوسرے کیوں..

سورداس: چپ بھی رہو۔ آئے ہو وہاں سے نیائے کرنے۔ لڑکوں کی تو یہ عادت ہی ہوتی ہے، پر اس کے لیے کوئی انہیں مار بھی نہیں ڈالتا۔ تمہیں لوگوں کو اگر کسی دوسرے لڑکے نے چڑایا ہوتا تو منہ تک نہ کھولتے۔ دیکھتا تو ہوں جدھر سے نکلتے ہو۔ لڑکے تالیاں بجا بجا کر چڑاتے ہیں۔ پر آنکھیں بند کیے اپنی راہ چلے جاتے ہو۔ جانتے ہو نا کہ جن لڑکوں کے ماں باپ ہیں، انہیں ماریں گے تو وہ آنکھیں نکال لیں گے۔ کیلے کے لیے تو ٹھیکرا بھی تیز ہوتا ہے۔

بھیرو: دوسرے لڑکوں کی اور اس کی برابری ہے؟ داروغہ جی کی گالیاں کھاتے ہیں تو ڈومڑوں کی گالیاں بھی کھائیں؟ ابھی تو دو ہی طمانچے لگائے ہیں پھر چڑائے تو اٹھا کر پٹک دوں۔ مرے یا جیے۔

سورداس: (مٹھو کا ہاتھ پکڑ کر) مٹھوا چڑا تو! دیکھوں یہ کیا کرتے ہیں؟ آج جو کچھ ہونا ہے یہیں ہو جائے گا۔

لیکن مٹھوا کے گالوں میں ابھی تک جلن ہو رہی تھی۔ منہ بھی سوج گیا تھا۔ سسکیاں بند نہ ہوتی تھیں۔ بھیروں کا غضب ناک چہرہ دیکھا تو اس کے رہے سہے ہوش بھی اڑ گئے۔ جب بہت بڑھاوا دینے پر بھی اس کا منہ نہ کھلا تو سورداس نے جھنجھلا کر کہا۔ ''اچھا میں ہی چڑاتا ہوں۔ دیکھوں میرا کیا بنا لیتے ہو۔''

یہ کہہ کر اس نے لاٹھی مضبوط پکڑ لی اور بار بار اسی بول کی رٹ لگانے لگا جیسے کوئی لڑکا اپنا سبق یاد کر رہا ہو۔

بھیرو، بھیرو تاڑی بیچ۔ یا بیوی کی ساڑی بیچ

ایک ہی سانس میں اس نے کئی بار یہی رٹ لگائی۔ بھیرو کہاں تو غصہ سے پاگل ہو رہا تھا۔ کہاں سورداس کی یہ طفلانہ حرکت دیکھ کر ہنس پڑا۔ اور لوگ بھی ہنسنے لگے۔ اب سورداس کو معلوم ہوا کہ میں کتنا عاجز و بیکس ہوں۔ میرے غصہ کی یہ عزت ہے! میں طاقت ور ہوتا تو میرا غصہ دیکھ کر یہ لوگ تھر تھر کانپنے لگتے۔ نہیں تو کھڑے کھڑے ہنس رہے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ ہمارا کر ہی کیا سکتا ہے۔ بھگوان نے اتنا اپنگ نہ بنا دیا ہوتا تو کیوں یہ ذلت اٹھانی پڑتی۔ یہ سوچ کر بے اختیار اسے رونا آ گیا۔ بہت ضبط کرنے پر بھی آنسو نہ رک سکے۔

بجرنگی نے بھیرو اور جگدھر دونوں کو ملامت کی۔ ''کیا اندھے سے ہیکڑی جتاتے ہو۔ شرم نہیں آتی! ایک تو بیچارے لڑکے کا طمانچوں سے منہ لال کر دیا۔ اس پر اور گرجتے ہو۔ وہ بھی تو لڑکا ہی ہے۔ غریب کا ہے تو کیا؟ جتنا لاڈ پیار اس کا ہوتا ہے، اتنا بھلے گھروں کے لڑکوں کا بھی نہیں ہوتا! جیسے اور سب لڑکے چڑاتے ہیں وہ بھی چڑاتا ہے، اس میں اتنا بگڑنے کی کیا بات ہے۔ (جمنی کی طرف دیکھ کر) یہ سب تیرے ہی کارن ہوا۔ اپنے لونڈے کو ڈانٹتی نہیں۔ بیچارے اندھے پر غصہ اتارنے چلی ہے۔''

جمنی سورداس کا رونا دیکھ کر سہم گئی تھی۔ جانتی تھی کہ بیکس کی آہ میں کتنا اثر ہوتا ہے۔ نادم ہو کر بولی۔ ''میں کیا جانتی تھی کہ ذرا سی بات کا اتنا بتنگڑ بن جائے گا۔ آ بیٹا مٹھو! چل

بچھوا پکڑ لے تو دودھ دوہوں۔''

دولارے لڑکے تنکے کی مار بھی نہیں سہہ سکتے۔مٹھو دودھ کی دعوت سے بھی چپ نہ ہوا تو جمنی نے آ کر اس کے آنسو پونچھے اور گودی میں اٹھا کر گھر کے اندر لے گئی۔اس کو غصہ جلد آتا تھا مگر جلد ہی پگھل بھی جاتی تھی۔

مٹھو تو ادھر گیا۔بھیرو اور جگدھر نے بھی اپنی راہ لی مگر سورداس سڑک کی طرف نہ گیا۔ اپنی جھونپڑی میں جا کر اپنی بیکسی پر رونے لگا۔اپنے نابینا ہونے پر آج اس کو جتنا ملال ہو رہا تھا اتنا اور کبھی نہ ہوا تھا۔سوچا ''میری درگت اسی لیے ہے کہ میں اندھا ہوں۔بھیک مانگتا ہوں۔محنت کی کمائی کھاتا ہوتا تو میں بھی گردن اٹھا کر نہ چلتا۔میرا بھی مان نہ ہوتا؟ کیوں چیونٹی کی طرح پیروں کے نیچے مسلا جاتا۔آج بھگوان نے اپنگ نہ بنا دیا ہوتا تو کیا دونوں آدمی لڑکے کو مار کر ہنستے ہوئے چلے جاتے۔ایک ایک کی گردن مروڑ دیتا۔بجرنگی سے کیوں نہیں بولتا کہ گھسوا نے بھیرو کی تاڑی کا مٹکا پھوڑ دیا تھا۔کئی روپے کا نقصان ہوا لیکن بھیرو نے چوں تک نہ کی۔جگدھر کو اس کے مارے گھر سے نکلنا مشکل ہے۔ابھی دس ہی پانچ دن کی بات ہے۔اس کا کھونچہ الٹ دیا تھا۔جگدھر نے سانس تک نہ لی۔ جانتے ہیں نا کہ ذرا بھی گرم ہوئے اور بجرنگی نے گردن پکڑی۔نہ جانے اس جنم میں ایسے کرن سے پاپ کیے تھے جن کا یہ ڈنڈ مل رہا ہے،لیکن بھیک نہ مانگوں تو کھاؤں کیا اور پھر پیٹ ہی پالنے کے لیے تھوڑا ہی ہے۔کچھ آگے کے لیے تو کرنا ہے نہیں۔اس جنم میں تو اندھا ہوا ہی ہوں،اس جنم میں اس سے بھی زیادہ دردسا ہوگی۔پتروں کا دن سر پر سوار ہے۔گیا جی میں ان کا سرادھ نہ کیا تو وہ بھی کیا سمجھیں گے کہ ہمارے بنس میں کوئی ہے۔ میرے ساتھ تو بنس کا انت ہی ہے۔میں یہ دن نہ چکاؤں گا تو اور کون لڑکا بیٹھا ہوا ہے جو چکاوے گا۔کون اودم کروں۔کسی بڑے آدمی کے گھر پنکھا کھینچ سکتا ہوں مگر یہ کام بھی سال میں چار مہینے ہی رہتا ہے۔باقی آٹھ مہینے کیا کروں گا۔سنتا ہوں اندھے کرسی،موڑھے، دری،ٹاٹ بن سکتے ہیں۔پر یہ کام کس سے سیکھوں کچھ بھی ہو اب بھیک نہ مانگوں گا۔''

ہر طرف سے مایوس ہونے پر سورداس کے دل میں یکایک یہ خیال آیا کہ اس زمین کو کیوں نہ بیچ دوں۔ اس کے سوا اب مجھے اور کوئی سہارا نہیں ہے۔ کہاں تک باپ دادا کے نام کو روؤں۔ صاحب اسے لینے کو منہ پھیلائے ہوئے ہیں۔ دام بھی اچھے دے رہے ہیں۔ انہیں کو دے دوں۔ چار پانچ ہزار بہت ہوتے ہیں۔ اپنے گھر میں سیٹھ کی طرح بیٹھا ہوا چین کی بنسی بجاؤں گا۔ چار آدمی گھیرے رہیں گے۔ محلّہ میں اپنا مان ہونے لگے گا۔ یہی لوگ جو آج مجھ پر رعب جما رہے ہیں، میرا منہ تاکیں گے۔ میری خوشامد کریں گے۔ یہی ہوگا نہ محلّہ کی گائیں ماری ماری پھریں گی۔ پھریں۔ اس کو میں کیا کروں۔ جب تک نبھ سکا نبھایا۔ اب نہیں نبھ سکتا۔ جن کی گائیں چرتی ہیں کون میری بات پوچھتے ہیں۔ آج کوئی میری پیٹھ پر کھڑا ہو جاتا تو بھیرو مجھے رلا کر یوں مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا چلا نہ جاتا۔ جب اتنا بھی نہیں ہے تو مجھے کیا پڑی ہے کہ دوسروں کے لیے مروں۔ جی ہے تو جہان ہے۔ جب آبرو ہی نہ رہی تو جینے پر دھکار ہے۔

سورداس یہ سوچ کر اپنی جھونپڑی سے باہر نکلا اور لاٹھی ٹیکتا ہوا گودام کی طرف چلا۔ گودام کے سامنے پہنچا تو دیاگر سے بھینٹ ہوگئی۔ انہوں نے پوچھا۔ ''ادھر کہاں چلے۔ سورداس؟ تمہاری جگہ تو پیچھے رہ گئی۔''

سورداس: ذرا انہیں میاں صاحب سے کچھ بات چیت کرنی ہے۔

دیاگر: کیا اسی زمین کے بارے میں؟

سورداس: ہاں میرا ارادہ ہے کہ یہ زمین بیچ کر کہیں تیرتھ جاترا کرنے چلا جاؤں۔ اس محلّہ میں اب نباہ نہیں ہے۔

دیاگر: سنا ہے آج بھیرو تمہیں مارنے کی دھمکی دے رہا تھا۔

سورداس: میں طرح نہ دے جاتا تو اس نے مار ہی دیا ہوتا۔ سارا محلّہ بیٹھا ہنستا رہا۔ کسی کی زبان نہ کھلی کہ اندھے اپاہج آدمی پر یہ انیائے کیوں کرتے ہو۔ تو جب میرا کوئی ہتو نہیں ہے تو میں کیوں دوسروں کے لیے مروں۔

دیا گر: نہیں سورداس۔ میں تمہیں زمین بیچنے کی صلاح نہ دوں گا۔ دھرم کا پھل اس جنم میں نہیں ملتا۔ ہمیں آنکھیں بند کر کے نارائن پر بھروسہ رکھتے ہوئے دھرم کے راستے پر چلتے رہنا چاہیے۔ سچ پوچھو تو آج نارائن نے تمہارے دھرم کی پرکچھا کی ہے۔ سنکٹ ہی میں دھیرج اور دھرم کی پرکچھا ہوتی ہے۔ دیکھو گوسائیں جی نے کہا ہے۔

آپت کال پرکھیے چاری   دھیرج، دھرم ہتر اور ناری

زمین پڑی ہے پڑی رہنے دو۔ گائیں چرتی ہیں۔ یہ کتنا بڑا پن ہے! کون جانتا ہے کبھی کوئی دانی دھرماتما آدمی مل جائے تو دھرم شالہ، کنواں، مندر بنوا دے کہ مرنے پر بھی تمہارا نام امر رہے۔ رہی تیرتھ جاترا۔ اس کے لیے روپے کی ضرورت نہیں۔ سادھو سنت جنم بھر یہی کیا کرتے ہیں۔ پھر گھر سے روپوں کی تھیلی باندھ کر نہیں چلتے۔ میں بھی شیوراتری کے بعد بدری نارائن جانے والا ہوں۔ ہمارا تمہارا ساتھ بھی ہو جائے گا۔ راستہ میں تمہاری ایک کوڑی خرچ نہ ہوگی۔ اس کا میرا ذمہ۔

سورداس: نہیں بابا۔ اب یہ انیائے نہیں سہا جاتا۔ بھاگ میں دھرم کرنا نہیں لکھا ہوا تو کیسے دھرم کروں گا؟ ذرا ان لوگوں کو بھی تو معلوم ہو جائے کہ سورداس کوئی چیز ہے۔

دیا گر: سورداس! آنکھیں بند ہونے پر بھی کچھ نہیں سوجھتا۔ یہ اہنکار (خودی) ہے۔ اسے مٹاؤ نہیں تو یہ جنم بھی بگڑ جائے گا۔ یہ اہنکار سب پاپوں کی جڑ ہے۔ نہ یہاں تم ہو نہ تمہاری زمین ہے۔ نہ تمہارا کوئی دوست ہے۔ نہ دشمن۔ جہاں دیکھو بھگوان ہی بھگوان ہیں۔ ان جھگڑوں میں نہ پڑو!

سورداس: بابا جی۔ جب تک بھگوان کی دیا نہ ہوگی۔ بھگتی اور بیراگ کسی پر من نہ جمے گا۔ اس گھڑی میرا دل رو رہا ہے۔ اس میں اپدیش اور گیان کی باتیں نہیں سما سکتیں۔ گیلی لکڑی کھرادپر نہیں چڑھتی۔

دیا گر: پچھتاؤ گے اور کیا؟

یہ کہہ کر دیا گر اپنی راہ چلے گئے۔ وہ ہر روز گنگا نہانے جایا کرتے تھے۔

ان کے چلے جانے پر سورداس نے دل میں کہا۔ یہ بھی مجھی کو گیان سکھاتے ہیں۔ غریبوں پر اپدیش کا بھی داؤں چلتا ہے۔ موٹے آدمیوں کو کوئی نہیں سمجھاتا۔ وہاں تو جا کر ٹھکر سوہاتی کرنے لگتے ہیں۔ مجھے گیان سکھانے چلے ہیں۔ دونوں جون بھوجن مل جاتا ہے نا۔ ایک دن نہ ملے تو سارا گیان نکل جائے۔

تیزی سے چلتی ہوئی گاڑی رکاوٹوں کو پھاند جاتی ہے۔ سورداس سمجھانے سے اور بھی ضد پکڑ گیا۔ سیدھا گودام کے برآمدہ میں جا کر رکا۔ اس وقت وہاں بہت سے چمار جمع تھے۔ کھالوں کی خرید ہو رہی تھی۔ چودھری نے کہا۔ ''آؤ سورداس! کیسے چلے؟''

سورداس اتنے لوگوں کے سامنے اپنی خواہش ظاہر نہ کر سکا۔ لحاظ نے اس کی زبان بند کر دی بولا۔ ''کچھ نہیں۔ ایسے ہی چلا آیا ہوں۔''

طاہر: صاحب ان سے پیچھے والی زمین مانگتے ہیں۔ منہ مانگے دام دینے پر تیار ہیں۔ مگر یہ کسی طرح راضی نہیں ہوتے۔ انہوں نے خود سمجھایا۔ میں نے کتنی منت کی، پر ان کے دل پر کوئی بات جمتی ہی نہیں۔

حیا میں نہایت بے حیائی بھی ہوتی ہے۔ آخر وقت بھی جب ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس کی الٹی سانسیں چل رہی ہیں۔ وہ ایک دم زندہ ہو جاتی ہے اور پہلے سے بھی زیادہ فرض شناس۔ ہم پریشانیوں میں مبتلا ہو کر کسی دوست سے مدد مانگنے کے لیے گھر سے نکلتے ہیں لیکن دوست سے آنکھیں چار ہوتے ہی حیا ہمارے سامنے آ کر کھڑی ہو جاتی ہے اور ہم ادھر ادھر کی باتیں کر کے واپس آ جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہم ایک بھی ایسا لفظ منہ سے نہیں نکلنے دیتے جس سے ہماری اندرونی تکلیف کا اظہار ہو۔

طاہر علی کی باتیں سنتے ہی سورداس کی حیا قہقہہ مارتی ہوئی باہر نکل آئی۔ بولا۔ ''میاں صاحب! یہ زمین تو پرکھوں کی نشانی ہے۔ بھلا میں اسے بیچ یا پٹہ کیسے کر سکتا ہوں؟ میں نے اسے دھرم کاج کے لیے سنکلپ کر دیا ہے۔''

طاہر: دھرم کاج بغیر روپوں کے کیسے ہوگا؟ جب روپے ملیں گے جبھی تو تیرتھ کرو گے۔

سادھو لوگوں کی سیوا کرو گے۔ مندر اور کنواں بنواؤ گے۔

چودھری: سورداس! اس بکھت (وقت) اچھے دام ملیں گے۔ ہماری تو یہی صلاح ہے کہ دے دو۔ تمہارا اس سے کوئی لابھ تو ہوتا نہیں۔

سورداس: محلّہ بھر کی گائیں چرتی ہیں۔ کیا اس سے پن نہیں ہوتا۔ گئو کی سیوا سے بڑھ کر اور کون پن کا کام ہے۔

طاہر: اپنا پیٹ پالنے کے لیے تو بھیک مانگتے پھرتے ہو۔ چلے ہو دوسروں کے ساتھ پن کرنے! جن کی گائیں چرتی ہیں وہ تو تمہاری بات بھی نہیں پوچھتے۔ احسان ماننا تو دور رہا اسی دھرم کے پیچھے تمہاری یہ حالت ہو رہی ہے۔ ورنہ ٹھوکریں نہ کھاتے پھرتے۔

طاہر علی خود بڑے دین دار آدمی تھے لیکن دوسرے مذہبوں کی برائی کرنے میں ان کو ذرا تامل نہ ہوتا تھا۔ دراصل وہ اسلامی مذہب کے سوا اور کسی مذہب کو مذہب نہیں سمجھتے تھے۔

سورداس نے ذرا تند لہجہ میں کہا۔ ''میاں صاحب! دھرم احسان کے لیے نہیں کیا جاتا۔ نیکی کر کے دریا میں ڈال دینا چاہیے۔''

طاہر: پچھتاؤ گے اور کیا۔ صاحب سے جو کچھ کہو گے، وہی کریں گے۔ تمہارے لیے گھر بنوا دیں گے۔ ماہوار وظیفہ دیں گے۔ مٹھوا کو کسی مدرسہ میں پڑھنے کو بٹھا دیں گے۔ اسے نوکر رکھا دیں گے۔ تمہاری آنکھوں کی دوا کرا دیں گے۔ ممکن ہے تمہاری آنکھیں کھل جائیں۔ آدمی بن جاؤ گے۔ نہیں تو دھکے کھاتے رہو گے۔

سورداس پر اور کسی ترغیب کا اثر نہ ہوا، لیکن آنکھوں کے علاج کا ذکر سن کر وہ نرم پڑا۔ بولا۔ ''کیا جنم کے اندھوں کی بھی دوا ہو سکتی ہے؟''

طاہر: تم جنم کے اندھے ہو گیا؟ جن تو مجبوری ہے، لیکن تمہاری آسائش کے اتنے سامان جمع کر دیئے جائیں گے کہ تمہیں آنکھوں کی ضرورت ہی نہ رہے گی۔

سورداس: نہیں۔ میں صاحب! اس میں بڑی ناموسی ہو گی۔ لوگ چاروں طرف سے

دھتکارنے لگیں گے۔

چودھری: تمہاری جائیداد ہے۔ بیع کرو چاہے پٹہ لکھو۔ دوسرے کو دخل دینے کا کیا اختیار ہے۔

سورداس: باپ دادوں کا نام تو نہیں ڈبویا جاتا۔

جہلاء کے پاس دلیلیں نہیں ہوتیں۔ دلائل کا جواب وہ ضد سے دیتے ہیں۔ دلیل قائل ہوسکتی ہے۔ نرم ہوسکتی ہے۔ پر ہٹ کو کون قائل کرسکتا ہے۔

سورداس کی ہٹ سے طاہر علی کو غصہ آ گیا۔ بولے۔ ''تمہاری تقدیر میں بھیک مانگنا لکھا ہے تو کوئی کیا کرسکتا ہے؟ ان بڑے آدمیوں سے ابھی پالا نہیں پڑا ہے۔ ابھی تمہاری خوشامد کر رہے ہیں۔ معاوضہ دینے پر تیار ہیں، لیکن تمہارا مزاج نہیں ملتا۔ اور وہی جب قانونی داؤں پیچ کھیل کر زمین پر قبضہ کرلیں گے۔ دو چار سو روپے برائے نام معاوضہ دے دیں گے تو پھر سیدھے ہو جاؤ گے۔ محلّہ والوں پر پھولے بیٹھے ہو۔ پر دیکھ لینا جو کوئی پاس بھی پھٹکے۔ صاحب یہ زمین لیں گے ضرور، چاہے ہنس کر دو چاہے رو کر۔''

سورداس نے متکبرانہ انداز سے جواب دیا۔ ''خان صاحب! اگر زمین جائے گی تو اس کے ساتھ میری جان بھی جائے گی!''

یہ کہہ کر اس نے لکڑی سنبھالی اور اپنے اڈے پر جا بیٹھا۔

ادھر دیاگر نے جا کر نایک رام سے یہ حال کہا۔ بجرنگی بھی بیٹھا تھا۔ یہ خبر سن کر دونوں کے ہوش اڑ گئے۔ سورداس کے بل پر دونوں اچھلتے رہے۔ اس دن طاہر علی سے کیسی باتیں کیں اور آج سورداس ہی نے دھوکا دیا۔ بجرنگی نے متفکر ہو کر کہا۔

''اب کیا کرنا ہوگا۔ پنڈا جی! بتاؤ۔''

نایک رام: کرنا کیا ہوگا؟ جیسا کیا ہے ویسا بھگتنا ہوگا۔ جا کر اپنی گھروالی سے پوچھو۔ اسی نے آج آگ لگائی تھی۔ جانتے تو ہو کہ سورداس مٹھوا پر جان دیتا ہے۔ پھر کیوں بھیرو کی مرمت نہیں کی؟ میں ہوتا تو کبھی بھیرو کو دو چار کھری کھوٹی سنائے

بغیر نہ جانے دیتا اور نہیں تو دکھاوے کے لیے ہی۔ اس بے چارہ کو بھی معلوم ہو جاتا کہ میری پیٹھ پر کوئی ہے۔ آج اس کو بڑا رنج ہوا ہے۔ نہیں تو زمین بیچنے کا اسے کبھی خیال ہی نہیں آیا تھا۔

بجرنگی: ارے تو اب کوئی تدبیر سوچو گے یا بیٹھ کر پچھلی باتوں کے نام کو روئیں؟

نایک رام: تدبیر یہی ہے کہ آج سورداس آئے تو چل کر اس کے پیروں پر گرو۔ اسے دلاسا دو۔ جیسے راضی ہو راضی کرو۔ دادا بھیا کرو۔ مان جائے تو اچھا نہیں تو صاحب سے لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ ان کا قبضہ نہ ہونے دو۔ جو کوئی زمین کے پاس جائے اس کو مار کر بھگا دو۔ میں نے تو یہی سوچ رکھا ہے۔ آج سورداس کو اپنے ہاتھ سے بنا کر دودھیا پلاؤں گا اور مٹھوا کو پیٹ بھر مٹھائیاں کھلاؤں گا۔ جب نہ مانے گا تو دیکھا جائے گا۔

بجرنگی۔ ذرا میں صاحب کے پاس کیوں نہیں چلے چلتے؟ سورداس سے اس نے نہ جانے کیا کیا باتیں کی ہوں۔ کہیں لکھا پڑھی کرانے کو کہہ آیا ہو تو پھر چاہے کتنی ہی آرزو منت کرو گے، وہ اپنی بات نہ ٹالے گا۔

نایک رام: میں ان منشی کے دروازہ پر نہ جاؤں گا۔ اس کا مزاج اور بھی آسمان پر چڑھ جائے گا۔

بجرنگی: نہیں! پنڈا جی۔ میری خاطر سے ذرا چلے چلو۔

نایک رام آخر راضی ہو گئے۔ دونوں آدمی طاہر علی کے پاس پہنچے۔ وہاں اس وقت سناٹا تھا۔ خریداری کا کام ختم ہو چکا تھا۔ چمار چلے گئے تھے۔ طاہر علی تنہا بیٹھے ہوئے حساب کتاب لکھ رہے تھے۔ میزان میں کچھ فرق پڑتا تھا۔ بار بار جوڑتے تھے، پر غلطی پر نگاہ نہ پڑتی تھی۔ دفعتاً نایک رام نے کہا۔ ”کہیے منشی جی آج سورداس سے کیا بات چیت ہوئی؟“

طاہر: آہا۔ آئیے پنڈا جی! معاف کیجیے گا۔ میں ذرا میزان جوڑنے میں مصروف

تھا۔ اس مونڈھے پر بیٹھیے۔ سورداس سے کوئی بات طے نہ ہوگی۔ اس کی تو شامت آئی ہے۔ آج تو دھمکی دے کر گیا ہے کہ زمین کے ساتھ میری جان بھی جائے گی۔ غریب آدمی ہے مجھے اس پر ترس آتا ہے۔ آخر یہی ہوگا کہ صاحب کسی قانون کے رو سے زمین پر قابض ہو جائیں گے۔ کچھ معاوضہ ملا تو خیر۔ ورنہ اس کی بھی امید نہیں!

نایک رام: جب سورداس راضی نہیں ہے تو صاحب کیا کھا کر یہ زمین لے لیں گے؟ دیکھ بجرنگی! ہوئی نہ وہی بات۔ سورداس ایسا کچا آدمی نہیں ہے۔

طاہر: صاحب کو ابھی آپ جانتے نہیں ہیں۔

نایک رام: میں صاحب اور صاحب کے باپ دونوں کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ حاکموں کی خوشامد کی بدولت آج بڑے آدمی بنے پھرتے ہیں۔

طاہر: خوشامد ہی کا تو آج کل زمانہ ہے۔ وہ اب اس اراضی کو لیے بغیر نہ مانیں گے۔

نایک رام: تو ادھر بھی یہی طے ہے کہ زمین پر کسی کا قبضہ نہ ہونے دیں گے۔ چاہے جان رہے یا جائے۔ اس کے لیے مر مٹیں گے۔ ہمارے ہزاروں جاتری آتے ہیں۔ اسی کھیت میں سب کو ٹھہرا دیتا ہوں۔ زمین نکل گئی تو کیا جاتریوں کو اپنے سر پر ٹھہراؤں گا؟ آپ صاحب سے کہہ دیجیے گا۔ یہ ان کی دال نہ گلے گی۔ یہاں بھی کچھ دم رکھتے ہیں۔ بارہویں مہینے کھلے خزانے جوا کھیلتے ہیں۔ ایک ایک دن میں ہزاروں کے وارے نیارے ہو جاتے ہیں۔ تھانہ دار سے لے کر سپرنٹنڈنٹ تک سب جانتے ہیں۔ پر مجال کیا کہ کوئی دوڑ لے کر آئے خون تک چھپا ڈالے ہیں۔

طاہر: تو آپ یہ سب باتیں مجھ سے کیوں کہتے ہیں؟ کیا میں جانتا نہیں ہوں؟ آپ نے سید رضا علی تھانہ دار کا نام تو سنا ہی ہوگا۔ میں انہیں کا لڑکا ہوں۔ یہاں کون

پنڈا ہے جس کو میں نہیں جانتا؟

نایک رام: لیجیے گھر ہی بید تو مریے کیوں۔ پھر تو آپ اپنے گھر ہی کے آدمی ہیں۔ داروغہ جی کی طرح بھلا کیا کوئی افسر ہوگا۔ کہتے تھے۔ ''بیٹا! جو چاہے کرو لیکن میرے پنجے میں نہ آنا۔'' میرے دروازے پر بھیڑ جمتی تھی۔ وہ کرسی پر بیٹھے دیکھا کرتے تھے۔ بالکل گھر والا معاملہ ہو گیا تھا۔ کوئی بات بنی بگڑی۔ جا کر سب کی سب سنا دیتا تھا۔ پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر کہتے۔ ''بس جاؤ۔ اب ہم دیکھ لیں گے۔'' ایسے آدمی اب کہاں ست جگی لوگ تھے۔ آپ تو اپنے بھائی ہی ٹھہرے۔ صاحب کو دھتا کیوں نہیں بتاتے؟ آپ کو نارائن نے علم اور عقل دی ہے۔ بیسیوں بہانے نکال سکتے ہیں۔ برسات میں پانی رکتا ہے۔ دیمک بہت ہے۔ لونی لگے گی۔ ایسے ہی اور کتنے بہانے ہیں۔

طاہر: پنڈا جی! جب آپ سے بھائی چارا ہو گیا تو کیا پروا ہے۔ صاحب پلے درجہ کا گھاگ ہے۔ حاکموں سے اس کا بڑا میل جول ہے۔ مفت میں زمین لے لے گا۔ سورداس کو تو چاہے سو دو سو مل بھی رہیں۔ میرا انعام اکرام غائب ہو جائے گا۔ آپ سورداس سے معاملہ طے کر دیجیے تو اس کا بھی فائدہ ہو، میرا بھی اور آپ کا بھی۔

نایک رام: آپ کو جو یہاں سے انعام اکرام ملنے والا ہو وہ ہمیں لوگوں سے لے لیجیے۔ اسی بہانے کچھ آپ کی خدمت کریں گے۔ میں تو داروغہ جی کو سمجھتا ہوں۔ ویسا ہی آپ کو بھی سمجھتا ہوں۔

طاہر: معاذ اللہ! پنڈا جی! ایسی بات نہ کہیے۔ میں مالک کی نگاہ بچا کر ایک کوڑی لینا بھی حرام سمجھتا ہوں۔ وہ اپنی خوشی سے جو کچھ دے دیں گے میں ہاتھ پھیلا کر لے لوں گا۔ پر ان سے چھپا کر نہیں۔ خدا اس راستہ سے بچائے! والد نے اتنا کمایا، پر مرتے وقت گھر میں ایک کوڑی کفن کو بھی نہ تھی۔

نایک رام: ارے یار! میں تمہیں رشوت تھوڑا ہی دینے کہتا ہوں۔ جب ہمارا

آپ کا بھائی چارہ ہو گیا تو ہمارا کام آپ سے نکلے گا۔ آپ کا کام ہم سے۔ یہ کوئی رشوت نہیں ہے۔

طاہر: نہیں پنڈا جی! خدا میری نیت کو پاک رکھے۔ مجھ سے نمک حرامی نہ ہو گی۔ میں جس حال میں ہوں۔ اسی میں خوش ہوں۔ جب اس کے کرم کی نگاہ ہو گی تو میری بھلائی کی کوئی صورت نکل ہی آئے گی۔

نایک رام: سنتے ہو بجرنگی! داروغہ جی کی باتیں؟ چلو چپکے سے گھر بیٹھو۔ جو کچھ آگے آئے گا۔ دیکھا جائے گا۔ اب تو صاحب ہی سے نبٹنا ہے۔

بجرنگی کے خیال میں نایک رام نے اتنی منت سماجت نہ کی تھی، جتنی کرنی چاہیے تھی۔ آئے تھے اپنا کام نکالنے کہ ہیکڑی دکھانے۔ عاجزی سے جو کام نکل جاتا ہے وہ ڈینگ مارنے سے نہیں نکلتا۔ نایک رام نے تو لاٹھی کندھے پر رکھی اور چلے۔ بجرنگی نے کہا کہ میں ذرا جانوروں کو دیکھنے جاتا ہوں اور ادھر ہی سے ہوتا ہوا آؤں گا۔ وہ یوں بڑا اکھڑ آدمی تھا۔ ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیتا۔ سارا محلّہ اس کے غصہ سے کانپتا تھا، لیکن وہ قانونی کارروائیوں سے ڈرتا تھا۔ پولیس اور عدالت کے نام ہی سے اس کی جان سوکھ جاتی تھی۔ نایک رام کو روز ہی عدالت سے کام رہتا تھا۔ وہ ان باتوں میں مشاق تھے۔ بجرنگی کو اپنی زندگی میں کبھی گواہی دینے کی بھی نوبت نہ آئی تھی۔ نایک رام کے چلے آنے پر طاہر علی بھی گھر چلے گئے۔ پر بجرنگی وہیں آس پاس ٹہلتا رہا کہ وہ باہر نکلیں تو اپنا دکھڑا سناؤں۔

طاہر علی کے باپ محکمہ پولیس میں کانسٹیبل سے تھانہ داری کے درجہ تک پہنچے تھے۔ مرتے وقت کوئی جائیداد تو نہ چھوڑی۔ یہاں تک کہ ان کی تجہیز و تکفین بھی قرض لے کر کی گئی۔ لیکن طاہر علی کے سر پر دو بیواؤں اور ان کی اولاد کا بار چھوڑ گئے۔ انہوں نے تین شادیاں کی تھیں۔ پہلی بیوی سے طاہر علی تھے۔ دوسری سے ماہر علی اور ظاہر علی اور تیسری سے جابر علی۔ طاہر علی مستقل مزاج اور عقل مند تھے۔ باپ کی وفات

ہونے پر سال بھر تو وہ نوکری کی تلاش میں مارے مارے پھرے۔ پھر کہیں مویشی خانہ میں محرری مل گئی۔ کہیں کسی دوا فروش کے ایجنٹ ہو گئے۔ کہیں چنگی گھر کے منشی کا عہدہ مل گیا۔ ادھر کچھ عرصہ سے مسٹر جان سیوک کے یہاں مستقل ملازمت مل گئی تھی۔ ان کے عادات واطوار اپنے والد مرحوم سے بالکل نرالے تھے۔ صوم وصلوٰۃ کے پابند اور دل کے صاف تھے۔ حرام کی آمدنی سے کوسوں دور بھاگتے تھے۔ ان کی ماں تو وفات پا چکی تھیں مگر دونوں سوتیلی مائیں بقید حیات تھیں۔ طاہر کی شادی بھی ہو چکی تھی۔ بیوی کے علاوہ ایک لڑکا تھا۔ صابر علی اور ایک لڑکی نسیمہ۔ اتنا بڑا خاندان تھا اور صرف تیس روپیہ ماہوار آمدنی۔ اس گرانی کے زمانہ میں جن کہ اس سے پانچ گنا آمدنی میں بھی فراغت سے گزر بسر نہ ہوتی تھی، ان کو سخت تکلیف کرنی پڑتی۔ لیکن نیت فاسد نہ ہوتی تھی۔ خدا کا خوف ان کی خصلت کا خاص جزو تھا۔ گھر میں پہنچے تو ماہر علی بیٹھا پڑھ رہا تھا۔ ظاہر اور جابر مٹھائی کے لیے رو رہے تھے اور صابر آنگن میں اچھل اچھل کر باجرہ کی روٹیاں کھا رہا تھا۔ طاہر علی تخت پر بیٹھ گئے اور دونوں چھوٹے بھائیوں کو گود میں اٹھا کر چپ کرانے لگے۔ ان کی بڑی سوتیلی ماں نے جس کا نام زینب تھا، دروازہ پر کھڑی ہو کر نایک رام اور بجرنگی کی باتیں سنی تھیں۔ بجرنگی دس ہی پانچ قدم چلا تھا کہ ماہر علی نے پکارا۔ ''سنو جی! او آدمی! ذرا یہاں آنا۔ تمہیں اماں بلا رہی ہیں۔''

بجرنگی لوٹ پڑا۔ کچھ آس بندھی۔ آ کر پھر برآمدہ میں کھڑا ہو گیا۔ زینب ٹاٹ کے پردہ کی آڑ میں کھڑی تھیں۔ پوچھا۔ ''کیا بات تھی جی؟''

بجرنگی: وہی زمین کی بات چیت تھی۔ صاحب اسے لینے کو کہتے ہیں۔ ہمارا گزر بسر اسی زمین سے ہوتا ہے۔ منشی جی سے کہہ رہا ہوں کسی طرح اس جھگڑے کو مٹا دیجیے۔ نجر نیاج (نذر نیاز) دینے کو بھی تیار رہوں۔ پر منشی جی سنتے ہی نہیں۔

زینب: سنیں گے کیوں نہیں؟ سنہیں گے نا تو غریبوں کی ہائے کس پر پڑے گی؟ تم

بھی تو گنوار آدمی ہو۔ان سے کیا کہنے گئے؟ ایسی باتیں مردوں سے کہنے کی تھوڑے ہی ہوتی ہیں۔ہم سے کہتے۔ہم طے کرا دیتے۔

جابر کی ماں کا نام تھا رقیہ۔وہ بھی آ کر کھڑی ہوگئی۔دونوں عورتیں سایہ کی طرح ساتھ ساتھ رہتی تھیں۔دونوں کے دل و دماغ اور خیالات یکساں تھے۔ان میں سوکن کا جلاپا نام کو نہ تھا۔آپس میں بہنوں کی سی محبت تھی۔بولی۔''اور کیا بھلا ایسی باتیں مردوں سے کی جاتی ہیں؟''

بجرنگی: ماتا جی۔ میں گنوار آدمی اس کا حال کیا جانوں۔اب آپ ہی طے کرا دیجیے۔غریب آدمی ہوں۔بال بچے جئیں گے۔

زینب: سچ سچ کہنا۔یہ معاملہ دب جائے تو کہاں تک دو گے؟

بجرنگی: بیگم صاحب پچاس روپے تک دینے کو تیار ہوں۔

زینب: تم بھی تو غضب کرتے ہو۔پچاس ہی میں اتنا بڑا کام نکلنا چاہتے ہو۔

رقیہ: (آہستہ سے) بہن! کہیں بدک نہ جائے۔

بجرنگی: کیا کروں بیگم صاحب۔غریب آدمی ہوں۔لڑکوں کو جو کچھ حکم ہوگا، دودھ دہی کھلاتا رہوں گا۔لیکن نگد (نقد) تو اس سے زیادہ میرا کیا نہ ہوگا۔

رقیہ: اچھا تو روپیوں کا انتظام کرو۔خدا نے چاہا تو سب طے ہو جائے گا۔

زینب: (آہستہ سے) رقیہ! تمہاری جلد بازی سے تو میں عاجز آ گئی۔

بجرنگی: ماں جی! یہ کام ہو گیا تو سارا محلّہ آپ کا جس گائے گا۔

زینب: مگر تم تو پچاس سے آگے بڑھنے کا نام ہی نہیں لیتے۔اتنے تو صاحب ہی دے دیں گے۔پھر گناہ بےلذت کیوں کیا جائے۔

بجرنگی: ماں جی! آپ سے باہر تھوڑا ہی ہوں۔دس پانچ روپے اور چڑھا دوں گا۔

زینب: تو کب تک روپے آ جائیں گے؟

بجرنگی: بس دو دن کی مہلت مل جائے۔تب تک منشی جی سے کہہ دیجیے صاحب سے

کہیں سنیں۔

زینب: واہ مہتو! تم تو بڑے ہوشیار نکلے۔ مفت ہی میں کام نکالنا چاہتے ہو۔ پہلے روپے لاؤ پھر تمہارا کام نہ ہو تو ہمارا ذمہ۔

بجرنگی دوسرے دن آنے کا وعدہ کر کے خوش خوش چلا گیا، تو زینب نے رقیہ سے کہا۔ ''تم بے صبر ہو جاتی ہو۔ ابھی چماروں سے دو پیسے فی کھال لینے پر تیار ہو گئیں۔ میں دو آنے لیتی اور وہ خوشی سے دیتے۔ یہی اہیر پورے سو گن کر جاتا۔ بے صبری سے غرض مند چوکنا ہو جاتا ہے۔ سمجھتا ہے۔ شاید ہم کو بے وقوف بنا رہی ہیں۔ جتنی ہی دیر لگاؤ۔ جتنی ہی بے رخی سے کام لو اتنا ہی اعتبار بڑھتا ہے۔''

رقیہ: کیا کروں بہن! میں ڈرتی ہوں کہ کہیں بہت سختی سے نشانہ خطا نہ کر جائے۔

زینب: وہ اہیر روپے ضرور لائے گا۔ طاہر کو آج ہی سے بھرنا شروع کر دو۔ بس عذاب کا خوف دلانا چاہیے۔ انہیں ہتھے چڑھانے کا یہی ڈھنگ ہے۔

رقیہ: اور کہیں صاحب نہ مانیں تو؟

زینب: تو کون ہمارے اوپر کوئی نالش کرنے جاتا ہے؟

طاہر علی کھانا کھا کر لیٹے تھے کہ زینب نے جا کر کہا۔ ''صاحب دوسروں کی زمین کیوں لیے لیتے ہیں؟ بے چارے روتے پھرتے ہیں۔''

طاہر: مفت تھوڑا ہی لینا چاہتے ہیں۔ اس کا معقول معاوضہ دینے پر تیار ہیں۔

زینب: یہ تو غریبوں پر ظلم ہے۔

رقیہ: ظلم ہی نہیں ہے۔ عذاب ہے۔ بھیا تم صاحب سے صاف صاف کہہ دو۔ مجھے اس عذاب میں نہ ڈالیے۔ خدا نے میرے آگے بھی بال بچے دیئے ہیں۔ نہ جانے کیسی پڑے کیسی نہ پڑے۔ میں یہ عذاب سر پر نہ لوں گا۔

زینب: گنوار تو ہیں ہی۔ تمہارے ہی سر ہو جائیں۔ تمہیں صاف کہہ دینا چاہیے کہ میں محلہ والوں سے دشمنی نہ مول لوں گا۔ جان جوکھم کی بات ہے۔

رقیہ: جان جوکھم تو ہے ہی۔ یہ گنوار کسی کے نہیں ہوتے۔

طاہر: کیا آپ نے بھی کچھ افواہ سنی ہے؟

رقیہ: ہاں۔ یہ سب چمار آپس میں باتیں کرتے جا رہے تھے کہ صاحب نے زمین لی تو خون کی ندی بہہ جائے گی۔ میں نے تو جب سے سنا ہے، ہوش اڑے ہوئے ہیں۔

زینب: ہوش اڑنے کی بات ہی ہے۔

طاہر: مجھے وہ سب ناحق بدنام کر رہے ہیں۔ میں لینے میں نہ دینے میں۔ صاحب نے اس اندھے سے زمین کے بارے میں بات چیت کرنے کا حکم دیا تھا۔ میں نے حکم کی تعمیل کی جو میرا فرض تھا، لیکن یہ احمق یہی سمجھ رہے ہیں کہ میں نے ہی صاحب کو اس زمین کی خریداری پر آمادہ کیا ہے۔ حالانکہ خدا جانتا ہے۔ میں نے کبھی ان سے اس کا ذکر ہی نہیں کیا۔

زینب: مجھے بدنامی کا خوف تو نہیں ہے۔ ہاں خدا کے قہر سے ڈرتی ہوں۔ بے کسوں کی آہ کیوں سر پر لو؟

طاہر: میرے اوپر کیوں عذاب پڑنے لگا؟

زینب: اور کس کے اوپر پڑے گا۔ بیٹا! یہاں تو تمہیں ہو۔ صاحب تو نہیں بیٹھے ہیں۔ وہ تو بھس میں آگ لگا کر دور سے تماشا دیکھیں گے۔ آئی گئی تو تمہارے سر جائے گی۔ اس پر قبضہ تمہیں کرنا پڑے گا۔ مقدمے چلیں گے تو پیروی تمہیں کرنی پڑے گی۔ نا بھیا! میں اس آگ میں نہیں کودنا چاہتی۔

رقیہ: میرے میکے میں ایک کارندہ نے کسی کاشتکار کی زمین نکال لی تھی۔ دوسرے ہی دن جوان بیٹا اٹھ گیا۔ کیا اس نے زمینداری کے حکم سے، مگر بلا آئی اس غریب کے سر۔ دولت مندوں پر عذاب بھی نہیں پڑتا۔ اس کا وار بھی غریبوں ہی پر ہوتا ہے۔ ہمارے بچے روز ہی نظر اور آسیب کی جھپٹ میں آتے رہتے ہیں۔ پر آج

تک کبھی نہیں سنا کہ کسی انگریز کے بچہ کو نظر لگی ہو۔ ان پر بلاؤں کا اثر ہی نہیں ہوتا۔

یہ پتہ کی بات تھی۔ طاہر علی کو بھی اس کا تجربہ تھا۔ ان کے گھر کے سبھی بچے گنڈے اور تعویذوں سے مڑھے ہوئے تھے۔ اس پر بھی آئے دن جھاڑ پھونک اور رائی نمک کی ضرورت پڑا ہی کرتی تھی۔

مذہب بالخصوص خوف پر مبنی ہے۔ خوف کو دور کر دیجیے۔ پھر آپ کی تیرتھ جاترا۔ پوجا پاٹ۔ اشنان دھیان۔ روزہ نماز کسی کا نشان بھی نہ رہے گا۔ مسجدیں خالی نظر آئیں گی اور مندر ویران!

طاہر علی کو خوف نے مغلوب کر دیا۔ آقا کی خدمت گزاری یا فرض شناسی کا خیال قہر ایزدی کا مقابلہ نہ کر سکا۔

(5)

چتاری کے راجہ مہندر کمار سنگھ اپنے عین عالم شباب ہی میں اپنی کارگزاری اور خاندانی شرافت کے سبب میونسپلٹی کے صدر منتخب ہو گئے تھے۔ خوب سوچ سمجھ کر کام کرنا ان کے چال چلن کا خاصہ تھا۔ رئیسوں کی عیش پسندی اور نمود طلبی کا ان کے مزاج میں شائبہ بھی نہ تھا۔ بہت ہی سادہ لباس پہنتے تھے اور ٹھاٹ باٹ سے نفرت کرتے تھے۔ شوق تو ان کو چھو بھی نہیں گیا تھا۔ گھڑ دوڑ، بائیسکوپ، تھیٹر، رقص و سرود، سیر و شکار، شطرنج یا تاش سے ان کو ذرا بھی مس نہ تھا۔ ہاں اگر کچھ رغبت تھی تو باغبانی سے۔ وہ ہر روز گھنٹہ دو گھنٹہ اپنے باغیچہ میں کام کیا کرتے تھے۔ باقی وقت شہر کے معائنہ اور میونسپلٹی کے کاموں کی انجام دہی میں صرف کرتے تھے۔ حکام سے وہ بلا ضرورت بہت کم ملتے تھے۔ ان کے دور انتظام میں شہر کے محض انہیں حصوں کو زیادہ اہمیت نہ دی جاتی تھی جہاں حکام کے بنگلے تھے۔ شہر کی تاریک گلیوں اور تعفن خیز بدروؤں کی صفائی وسیع سڑکوں اور دلکش فضاؤں کی صفائی سے کم ضروری نہ سمجھی جاتی تھی۔ اسی وجہ سے اکثر حکام ان سے کشیدہ رہتے تھے۔ انہیں فریبی اور مغرور

خیال کرتے تھے لیکن شہر کے چھوٹے سے چھوٹے آدمی کو بھی ان سے غرور یا بے رخی کی شکایت نہ تھی۔ ہر وقت ہر شخص سے وہ خندہ پیشانی کے ساتھ ملتے۔ ضابطہ کی خلاف ورزی کے لیے انہیں عوام پر جرمانہ کرنے یا مقدمہ چلانے کی بہت ضرورت ہوا کرتی تھی۔ ان کا اثر و اخلاق سخت طریقہ عمل کو دبائے رکھتا تھا۔ وہ انتہا درجہ کے کم سخن تھے۔ کبر سنی کی خاموشی خیالات کی پختگی کی دلیل ہے اور عالم شباب کی خاموشی ان کی مسرت کی، لیکن راجہ صاحب کی کم گوئی اس بات کو غلط ثابت کرتی تھی۔ ان کے منہ سے جو بات نکلتی تھی، اس میں غور و خوض کی کافی جھلک ہوتی تھی۔ ایک با ثروت تعلقہ دار ہونے پر بھی ان کی طبیعت کا میلان جمہوریت کی جانب تھا۔ ممکن ہے یہ ان کے سیاسی اصولوں کا نتیجہ ہو کیونکہ ان کی تعلیم، ان کا اقتدار، ان کے گرد و پیش کے حالات، ان کا مفاد۔ سب اس میلان کے ناموافق تھے مگر ضبط اور مشق نے اب اس کو ان کے خیالی دائرہ سے نکال کر ان کی فطرت میں داخل کر دیا تھا۔ شہر کے انتخابی حلقوں کی درستی میں انہوں نے نمایاں حصہ لیا تھا۔ اس لیے شہر کے اکثر روساء ان سے بدظن رہا کرتے تھے۔ ان کے خیال میں راجہ صاحب کی جمہوریت پرستی صرف ان کے عہدہ کو قائم و برقرار رکھنے کا ذریعہ تھی۔ وہ عرصہ تک اپنی اس عزت کی جگہ پر متمکن رہنے کے لیے یہ خود نمائی کا طریقہ اختیار کیے ہوئے تھے۔ اخباروں میں بھی کبھی اس پر نوٹ شائع ہوتے رہتے تھے، لیکن راجہ صاحب اس کی تردید کے لیے عقل اور وقت کا بیجا تصرف نہ کرتے تھے۔ نیک نام بننا ان کی زندگی کا خاص مقصد تھا۔ پر وہ خوب جانتے تھے کہ اس اونچے درجہ پر پہنچنے کے لیے عوام کی بے غرضانہ خدمت کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔

صبح کا وقت تھا۔ راجہ صاحب اشنان دھیان سے فارغ ہو کر شہر کے معائنہ کے لیے جا رہے تھے کہ اتنے میں مسٹر جان سیوک کا ملاقاتی کارڈ ملا۔ جان سیوک کا حکام سے زیادہ ربط ضبط تھا۔ ان کے سگریٹ کمپنی کے حصہ دار بھی زیادہ تر حکام ہی تھے۔

راجہ صاحب نے کمپنی کا پراسپیکٹس دیکھا تھا مگر جان سیوک سے ان کی کبھی ملاقات نہ ہوئی تھی۔ دونوں کو ایک دوسرے سے وہ بدگمانی تھی جس کی بنیاد افواہوں پر ہوتی ہے۔ راجہ صاحب کل اندو سے ملنے کے لیے گئے تھے۔ وہاں صوفیہ سے ان کی ملاقات ہو گئی تھی۔ اسی وقت جان سیوک کا بھی کچھ ذکر آ گیا تھا۔ اس وقت سے مسٹر سیوک کے متعلق ان کے خیالات میں کچھ تغیر پیدا ہو گیا تھا۔ کارڈ پاتے ہی باہر نکل آئے اور جان سیوک سے ہاتھ ملا کر ان کو اپنے دیوان خانہ میں لے گئے۔ جان سیوک کو یہ کسی فقیر کی کٹی کی طرح معلوم ہوا جہاں سجاوٹ کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ چند کرسیوں اور ایک میز کے سوا کوئی سامان نہ تھا۔ ہاں کاغذات و اخبارات کا ایک ڈھیر میز پر بے ترتیبی کے ساتھ پڑا ہوا تھا۔

ہم کسی سے ملتے ہی اپنی قیاسی عقل سے معلوم کر لیتے ہیں کہ ہماری نسبت اس کا کیا خیال ہے۔ مسٹر سیوک کو ایک لمحہ تک زبان کھولنے کی جرأت نہ ہوئی۔ تمہید کا کوئی مناسب پہلو نہ سوجھتا تھا۔ اس بحر بے پایاں کو پار کرنے کے لیے ایک زمین سے اور دوسرا آسمان سے مدد مانگ رہا تھا۔ راجہ صاحب کو تمہید تو سوجھ گئی تھی۔ (صوفی کے اعلیٰ ایثار اور خدمت کے بیان سے بڑھ کر اور کون سی تمہید ہوتی؟) مگر بعض اشخاص کو اپنی تعریف سننے سے جس قدر گریز ہوتا ہے، اتنا ہی کسی دوسرے کی تعریف کرنے سے ہوتا ہے۔ جان سیوک میں یہ بات نہ تھی۔ وہ تعریف یا غیبت دونوں ہی کر سکتے تھے۔ یکساں کمال کے ساتھ بولے۔ ''آپ سے ملنے کا عرصہ سے اشتیاق تھا لیکن تعارف نہ ہونے کے سبب حاضر نہ ہو سکتا تھا اور صاف بات تو یہ ہے (مسکرا کر) آپ کے بارے میں حکام کے منہ سے ایسی ایسی باتیں سنتا تھا جو میری خواہش کو عمل میں منتقل نہ ہونے دیتی تھیں مگر آپ نے انتخابی طریقوں کو آسان بنا کر جس حب الوطنی کا ثبوت دیا ہے، ان سے حاکموں کے جھوٹے اعتراضات کی قلعی کھول دی ہے۔''

حکام کے بیجا اعتراضات کا تذکرہ کر کے جان سیوک نے اپنی زبان کی صفائی ثابت کر دی۔ راجہ صاحب کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے اس سے زیادہ آسان کوئی تدبیر نہ تھی۔ راجہ کو حکام سے یہی شکایت تھی۔ اسی سبب سے ان کے انتظامات میں مشکلیں آ پڑتی تھیں۔ تاخیر ہو جاتی تھی اور رکاوٹیں پیدا ہوتی تھیں۔ بولے۔ ''یہ میری بدقسمتی ہے کہ حکام مجھ سے اس قدر بدظن رہتے ہیں۔ میری اگر کوئی خطا ہے تو اتنی ہی کہ میں عوام کے لیے بھی صحت اور سہولت کی اتنی ہی ضرورت سمجھتا ہوں جتنی حکام اور روسا کے لیے۔''

مسٹر سیوک: جناب! ان لوگوں کے دماغ کی کچھ نہ پوچھیے۔ دنیا ان کی آسائش کے لیے ہے اور کسی کو اس میں زندہ رہنے کا بھی حق نہیں ہے۔ جو شخص ان کے آستانے پر جبین سائی نہ کرے، وہ نااہل، نامہذب اور باغی ہے اور جو شخص قومیت کا ذرا بھی احساس رکھتا ہو۔ بالخصوص جو جہاں کی صنعت و حرفت کو فروغ دینا چاہتا ہو، وہ بلاشبہ قابل تعزیز اور گردن زدنی ہے۔ حب الوطنی ان کی نگاہ میں بدترین گناہ ہے۔ آپ نے میرے سگریٹ کے کارخانہ کا دستورالعمل ملاحظہ فرمایا ہوگا۔

مہندر: جی ہاں دیکھا تھا۔

جان سیوک: پراسپکٹس کا نکلنا تھا کہ حکام کی نگاہیں مجھ سے یک دم پھر گئیں۔ مجھ پر ان کی نوازش تھی۔ اکثر حکام سے میری دوستی تھی مگر اسی روز سے میں ان کی برادری سے خارج کر دیا گیا۔ میرا حقہ پانی بند ہو گیا۔ ان کی دیکھا دیکھی ہندوستانی روساء اور حکام نے بھی آنا کانی شروع کر دی۔ اب میں ان لوگوں کی نگاہوں میں شیطان سے بھی زیادہ مکروہ ہوں۔

اتنی طولانی تمہید کے بعد جان سیوک اپنے مطلب پر آئے۔ بہت کچھ ہچکتے ہوئے اپنا مدعا ظاہر کیا۔ راجہ صاحب قیافہ شناس تھے۔ پیران پارسا کو خوب پہچانتے تھے۔ انہیں مغالطہ دینا آسان نہ تھا، لیکن موقع ایسا آ پڑا تھا کہ اپنے اصولوں کی حفاظت

کے لیے تجاہل سے کام لینا پڑا۔ کسی دوسرے موقع پر وہ اس تجویز کی طرف ذرا بھی دھیان نہ دیتے۔ ایک غریب بیکس اندھے کی زمین کو جو اس کی زندگی کا ایک ہی سہارا ہو، اس کے قبضہ سے نکال کر ایک سرمایہ دار کو دے دینا ان کے اصول کے منافی تھا، لیکن آج اول مرتبہ انہیں اپنے اصول کو طاق پر رکھ دینا پڑا۔ یہ جانتے ہوئے کہ مس صوفیہ نے ان کے ایک قریبی رشتہ دار کی جان بچائی ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ جان سیوک کے ساتھ عمدہ سلوک کرنا کنور بھرت سنگھ کو احسان کے بھاری بوجھ سے سبکدوش کر دینا ہوگا۔ وہ اس تجویز کی مخالفت نہ کر سکتے تھے۔ احسان مندی ہم سے وہ سب کچھ کرا لیتی ہے جو اصولی نقطۂ خیال سے مذموم وقابل تحقیر ہے۔ یہ وہ چکی ہے جو ہمارے اصولوں اور قاعدوں کو پیس ڈالتی ہے۔ آدمی جتناہ بے لوث ہوتا ہے، اس کے لیے احسان کا بار اتنا ہی ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔ راجہ صاحب نے اس معامہ کو جان سیوک کے حسب منشاء طے کر دینے کا وعدہ کیا اور مسٹر سیوک اپنی کامیابی پر پھولے ہوئے گھر آئے۔

بیوی نے پوچھا: ''کیا طے کر آئے؟''

جان سیوک: وہی جو طے کرنے گیا تھا۔

بیوی: شکر ہے۔ مجھے امید نہ تھی۔

جان سیوک: یہ سب صوفی کے احسان کی برکت ہے۔ یہ اسی کے ایثار کی طاقت ہے جس نے مہندر کمار جیسے مغرور اور بے مروت آدمی کو نیچا دکھا دیا۔ ایسے تپاک سے ملے گویا میں ان کا پرانا دوست تھا۔ یہ مسئلہ واقعی ناقابل حل تھا اور اس کے حل کے لیے میں صوفی کا مرہون منت ہوں۔

مسز سیوک: (ترشرو ہو کر) تو تم جا کر اسے بلوا لاؤ۔ میں نے منع تو نہیں کیا ہے۔ مجھے ایسی باتیں بار بار کیوں سناتے ہو؟ میں تو اگر پیاسی مرتی بھی ہوں گی تو اس سے پانی نہ مانگوں گی۔ مجھے للو چپو نہیں آتی۔ جو دل میں ہے وہی زبان پر بھی۔ اگر وہ خدا

سے منحرف ہو کر اپنی ضد پر قائم رہ سکتی ہے تو میں بھی اپنے ایمان پر قائم رہتے ہوئے کیوں اس کی خوشامد کروں؟

پربھوسیوک روزانہ ایک بار صوفیہ سے ملنے جایا کرتا تھا۔ کنور صاحب اور رونے دونوں کی منکسر مزاجی اور شرافت نے اس کو گرویدہ بنالیا تھا۔ کنور صاحب جوہر شناس تھے۔ انہوں نے اول ہی روز ایک ہی نگاہ میں تاڑ لیا تھا کہ یہ نوجوان معمولی دل و دماغ والا نہیں ہے۔ ان پر یہ بات بھی مخفی نہ رہی کہ اس کا فطرتی میلان ادب اور فلسفہ کی طرف ہے۔ تجارتی کاروبار سے اسے اتنی مناسبت ہے جتنی ونے کو زمینداری سے، اس لیے وہ پربھوسیوک سے بالعموم ادب اور فلسفہ پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ وہ اس کے فطرتی رجحان کو قومیت کے جذبات سے معمور کر دینا چاہتے تھے۔ پربھوسیوک کو بھی معلوم ہو گیا تھا کہ یہ شخص فن شاعری کا ماہر ہے۔ ان سے انہیں وہ انس ہو گیا تھا جو شعرا کو اصحاب ذوق سے ہوا کرتا ہے۔ اس نے انہیں اپنی نظمیں سنائی تھیں۔ ان کی فیاضانہ داد دہی سے اس پر ایک نشہ سا چڑھا رہتا تھا۔ وہ ہر وقت شاعری کے خیال میں محو رہتا۔ وہ شک اور مایوسی جو عموماً نومشق ادیبوں کو اپنے کلام کی اشاعت اور قبولیت کے بابت ہوا کرتی ہے، کنور صاحب کی ہمت افزائیوں کے باعث یقین اور حوصلہ کی صورت میں تبدیل ہو گئی تھی۔ وہی پربھوسیوک جو ہفتوں تک قلم نہ اٹھاتا تھا، اب ایک ایک دن میں کئی کئی نظمیں لکھ ڈالتا۔ اس کے خیالات میں دریا کی سی روانی اور فراوانی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اس وقت بیٹھا ہوا کچھ لکھ رہا تھا۔ جان سیوک کو آتے دیکھ کر وہاں گیا کہ دیکھوں کیا خبر لائے ہیں؟ زمین کے ملنے پر جو رکاوٹیں پیدا ہو گئی تھیں، ان سے اسے امید ہو گئی تھی کہ غالباً کچھ دنوں تک اس بندش میں نہ پڑوں۔ جان سیوک کی کامیابی نے اس امید کو منقطع کر دیا۔ دل کی اس حالت میں ماں کے آخری الفاظ اسے نہایت ناگوار معلوم ہوئے، بولا۔ ''ماما۔ اگر آپ کا خیال ہے کہ صوفی وہاں کس مپرسی کی حالت میں پڑی ہوئی ہے اور اکتا کر خود

بخود چلی آئے گی تو آپ غلطی پر ہیں۔صوفی وہاں اگر برسوں رہے تو بھی وہ لوگ اس کا گلا نہ چھوڑیں گے۔میں نے ایسے سیر چشم اور خلیق آدمی نہیں دیکھے۔ہاں صوفی کی ہمت یہ گوارا نہ کرے گی کہ وہ عرصہ تک ان کی مہمان نوازی سے مستفیض ہوتی رہے۔ان دو ہفتوں میں وہ جتنی کمزور ہوگئی ہے، اتنی مہینوں بیمار رہ کر بھی نہ ہوسکتی تھی۔اسے تمام دنیا کی نعمتیں حاصل ہیں لیکن جس طرح کسی سرد ملک کا پودا گرم ملک میں آ کر ہزاروں کوششوں کے باوجود بھی روز بروز سوکھتا ہی جاتا ہے، وہی حالت اس کی بھی ہوگئی ہے۔اس کو ہر وقت یہی فکر دامن گیر رہتی ہے کہ کہاں جاؤں، کیا کروں۔اگر آپ نے اس کو وہاں سے جلد ہی نہ بلالیا تو آپ کو پچھتانا پڑے گا۔وہ آج کل بدھ اور جین مذہب کی کتابیں دیکھا کرتی ہے اور مجھے تعجب نہ ہوگا اگر وہ ہم سے ہمیشہ کے لیے چھوٹ جائے۔"

جان سیوک: تم تو روز وہاں جاتے ہو۔کیوں اپنے ساتھ نہیں لاتے؟

مسز سیوک: مجھے اس کا اندیشہ نہیں ہے۔یسوع کا دشمن میرے یہاں جگہ نہیں پا سکتا۔

پربھو سیوک: گرجا نہ جانا ہی اگر یسوع کا دشمن ہونا ہے تو لیجیے آج سے میں بھی گرجا نہ جاؤں گا۔نکال دیجیے مجھے بھی گھر سے۔

مسز سیوک: (رو کر) تو یہاں میرا ہی کیا رکھا ہے؟ اگر میں ہی بس کی گانٹھ ہوں تو میں ہی منہ پر سیاہی لگا کر کیوں نہ نکل جاؤں؟ تم اور صوفی آرام سے رہو۔میرا بھی خدا مالک ہے۔

جان سیوک: پربھو! تم میرے سامنے اپنی ماں کی تحقیر نہیں کر سکتے۔

پربھو سیوک: خدا نہ کرے میں اپنی ماں کی تحقیر کروں، لیکن میں دکھاوا والے مذہب کے لیے اپنی روح پر یہ جبر نہ ہونے دوں گا۔آپ لوگوں کی ناراضی کے خوف سے اب تک میں نے اس بارے میں کبھی زبان نہیں ہلائی، لیکن جب یہ دیکھتا

ہوں کہ اور کسی بات میں تو مذہب کی پروا نہیں کی جاتی اور سارا مذہبی محبت کے دکھاوے کے طریقہ پر ہی اظہار کیا جا رہا ہے تو مجھے شک ہوتا ہے کہ اس کا مطلب کچھ اور تو نہیں۔

جان سیوک: تم نے کس بات میں مجھے مذہب کے خلاف عمل کرتے دیکھا؟

پربھو سیوک: سینکڑوں ہی باتیں ہیں۔ ایک ہو تو کہوں۔

جان سیوک: نہیں ایک ہی بتلاؤ۔

پربھو سیوک: اس بے کس اندھے کی زمین پر قبضہ کرنے کے لیے آپ جن ذرائع سے کام لے رہے ہیں کیا وہ مذہب کے مطابق ہیں؟ مذہب کا خاتمہ وہیں ہو گیا جب اس نے کہہ دیا کہ میں اپنی زمین کو کسی طرح بھی نہ دوں گا۔ اب قانون حکمت اور دھمکیوں سے اپنا مطلب نکالنا آپ کو مذہب کے موافق معلوم ہوتا ہو تو ہو۔ مجھے تو وہ سراسر لا مذہبی اور نا منصفی پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔

جان سیوک: تم اس وقت اپنے ہوش میں نہیں ہو۔ میں تم سے حجت نہیں کرنا چاہتا۔ پہلے جا کر ٹھنڈے ہو آؤ۔ پھر میں تمہیں اس کا جواب دوں گا۔

پربھو سیوک غصہ سے بھرا ہوا اپنے کمرہ میں آیا اور سوچنے لگا کہ کیا کروں۔ یہاں تک تو اس کا ستیا گرہ محض لفظی تھا، اب اس کے عملی ہونے کا موقع آ گیا، لیکن عمل کی طاقت اس کے دل میں بالکل نہ تھی۔ اس جھنجھلاہٹ کی حالت میں وہ کبھی ایک کوٹ پہنتا، کبھی اس کو اتار کر دوسرا پہنتا۔ کبھی کمرہ کے باہر چلا جاتا۔ کبھی اندر آ جاتا۔ اسی اثنا میں مسٹر سیوک آ کر بیٹھ گئے اور متانت آمیز لہجے میں بولے ''پربھو! آج تمہارا جوش دیکھ کر مجھ کو جس قدر رنج ہوا ہے، اس سے کہیں زیادہ اندیشہ لاحق ہو گیا ہے۔ مجھے اب تک تمہاری دانائی پر اعتماد تھا۔ لیکن اب وہ اعتماد جاتا رہا۔ مجھے یقین تھا کہ تم زندگی اور مذہب کے تعلق کو خوب سمجھتے ہو، لیکن اب معلوم ہوا کہ صوفی اور اپنی ماں کی طرح تم بھی وہم میں مبتلا ہو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں اور مجھ سے اور ہزاروں اشخاص

جو روز گرجا جاتے ہیں، بھجن گاتے ہیں اور آنکھیں بند کر کے خدا کی عبادت کرتے ہیں، کیا وہ واقعی مذہبی محبت میں ڈوبے ہوتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ اگر اب تک تمہیں نہیں معلوم ہے تو اب معلوم ہو جانا چاہیے کہ مذہب صرف خود غرضی کا نام ہے۔ ممکن ہے تمہیں یسوع پر اعتقاد ہو۔ شاید تم انہیں خدا کا بیٹا یا کم از کم مہاتما سمجھتے ہو۔ پر مجھے تو اس قدر یقین نہیں۔ میرے دل میں ان کے لیے خوشیوں کا راگ الاپتا پھرتا ہے۔ وہ بھی اتنا ہی بے لوث، اتنا ہی منکسر مزاج اور اتنا ہی مذہب کا دلدادہ ہے، لیکن اس قدر بدظنی ہونے پر بھی میں اتوار کو سو کام چھوڑ کر گرجا ضرور جاتا ہوں۔ نہ جانے سے اپنی جماعت میں بے وقعتی ہوگی۔ اس کا میرے کاروبار پر برا اثر پڑے گا۔ پھر اپنے ہی گھر میں بے اطمینانی پیدا ہو جائے گی۔ میں صرف تمہاری ماں کی خاطر سے اپنے اوپر یہ ظلم کرتا ہوں اور تم سے بھی میرا یہی کہنا ہے کہ بے جا ضد سے کام نہ لو۔ تمہاری ماں غصہ کے نہیں بلکہ رحم کے قابل ہے۔ بولو تمہیں کچھ کہنا ہے؟''

پربھو سیوک: جی نہیں۔

جان سیوک: اب تو پھر اتنی شرارت نہ کرو گے؟

پربھو سیوک نے مسکرا کر کہا۔ ''جی نہیں۔''

(6)

مذہبی خوف میں جہاں بہت سی بھلائیاں ہیں، وہاں ایک برائی بھی ہے۔ اس میں سادگی ہوتی ہے۔ فریبیوں کا داؤں اس پر آسانی سے چل جاتا ہے۔ مذہب سے ڈرنے والا آدمی منطقی نہیں ہوتا۔ اس کی بحثی طاقت سست پڑ جاتی ہے۔ طاہر علی نے جب سے اپنی دونوں سوتیلی ماؤں کی باتیں سنی تھیں، ان کا دل بہت زیادہ بے چین ہو رہا تھا۔ بار بار خدا سے دعا مانگتے تھے۔ آئینی کتب سے اپنے شکوک رفع کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ دن تو کسی طرح گزرا۔ شام ہوتے ہی وہ مسٹر جان سیوک کے پاس پہنچے اور نہایت عاجزانہ لہجہ میں بولے۔ ''حضور کی خدمت میں اس وقت ایک

خاص عرض کرنے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ ارشاد ہو تو کہوں۔‘‘

جان سیوک: ہاں ہاں کہیے۔ کوئی نئی بات ہے کیا؟

طاہر: حضور اس اندھے کی زمین لینے کا خیال ترک کر دیں تو عین مناسب ہے۔ ہزاروں دقتیں ہیں۔ تنہا سورداس ہی نہیں۔ سارا محلّہ مخالفت پر آمادہ ہے۔ خصوصاً نایک رام پنڈا بہت ہی بگڑا ہوا ہے۔ وہ بڑا خوف ناک آدمی ہے۔ جانے کتنی بار فوجداریاں کر چکا ہے۔ اگر یہ سب دقتیں کسی طرح دور ہو جائیں تو بھی آپ سے یہی استدعا کروں گا کہ اس کے بجائے کسی دوسری زمین کی فکر کیجیے۔

جان سیوک: یہ کیوں؟

طاہر: حضور! یہ کار عذاب ہے۔ صدہا آدمیوں کا کام اس زمین سے نکلتا ہے۔ سب کی گائیں وہیں چرتی ہیں۔ براتیں ٹھہرتی ہیں۔ پلیگ کے ایام میں لوگ وہیں جھونپڑے ڈالتے ہیں۔ وہ زمین نکل گئی تو سارے محلّہ کو تکلیف ہوگی اور لوگ دل میں ہمیں سینکڑوں بددعائیں دیں گے۔ اس کا عذاب ضرور پڑے گا۔

جان سیوک: (ہنس کر) عذاب تو میری گردن پر پڑے گا نا؟ میں اس کا بوجھ اٹھا سکتا ہوں۔

طاہر: حضور! میں بھی تو آپ ہی کے دامن سے وابستہ ہوں۔ میں اس عذاب سے کب بچ سکتا ہوں۔ بلکہ محلّہ والے تو مجھی کو باغی سمجھتے ہیں۔ حضور تو یہاں تشریف رکھتے ہیں۔ میں تو آٹھوں پہر ان کی آنکھوں کے سامنے رہوں گا۔ ہر وقت ان کی نظروں میں کھٹکتا رہوں گا۔ عورتیں بھی راہ چلتے دو چار کھری کھوٹی سنا دیا کریں گی۔ عیال دار آدمی ہوں۔ خدا جانے کیا پڑے کیا نہ پڑے۔ آخر شہر کے مضافات میں اور زمینیں تو مل سکتی ہیں۔

مذہبی خوف مادہ پرستوں کی نظر میں مضحکہ خیز بن جاتا ہے۔ خصوصاً ایک جوان شخص میں اس کا ہونا تو ناقابل عفو سمجھا جاتا ہے۔ جان سیوک نے بناوٹی غصہ دکھلاتے

ہوئے کہا۔ ’’میرے بھی تو بال بچے ہیں۔ جب میں نہیں ڈرتا تو آپ کیوں ڈرتے ہیں؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ مجھے اپنے بال بچے پیارے نہیں یا میں خدا سے نہیں ڈرتا؟ ‘‘

طاہر: آپ صاحب اقبال ہیں۔ آپ کو عذاب کا خوف نہیں۔ اقبال مندوں سے عذاب بھی ڈرتا ہے۔ خدا کا قہر غریبوں ہی پر نازل ہوتا ہے۔

جان سیوک: اس نئے مذہبی اصول کے بانی شاید آپ ہی ہوں گے، کیونکہ میں نے آج تک کبھی نہیں سنا کہ اقبال مندی سے قہر ایزدی بھی ڈرتا ہے بلکہ ہماری مذہبی کتب میں تو اہل ثروت کے لیے بہشت کا دروازہ ہی بند کر دیا گیا ہے۔

طاہر: حضور مجھے اس جھگڑے سے دور ہی رکھیں تو بہتر۔

جان سیوک: آج آپ کو اس جھگڑے سے دور رکھوں۔ کل آپ کو یہ خبط ہو کہ جانوروں کو ہلاک کرنے سے خدا ناراض ہوتا ہے۔ آپ مجھے کھالوں کی خریداری سے دور رکھیں تو میں آپ کو کن کن باتوں سے دور رکھوں گا اور کہاں کہاں قہر ایزدی سے آپ کی حفاظت کروں گا۔ اس سے تو یہی بہتر ہے کہ آپ کو اپنے ہی سے دور رکھوں۔ میرے یہاں رہ کر آپ کو قہر ایزدی کا مقابلہ کرنا ہوگا۔

مسز سیوک: جب آپ کو قہر ایزدی کا اتنا خوف ہے تو آپ سے ہمارا کام نہیں ہو سکتا۔

طاہر: مجھے حضور کی خدمت سے انکار تھوڑا ہی ہے۔ میں تو صرف............

مسز سیوک: آپ کو ہمارے ہر حکم کی تعمیل کرنی ہوگی۔ خواہ اس سے آپ کا خدا خوش ہو یا ناخوش۔ ہم اپنے کاموں میں آپ کے خدا کو دست اندازی نہ کرنے دیں گے۔

طاہر علی مایوس ہو گئے۔ دل کو سمجھانے لگے۔ خدا رحیم ہے۔ کیا وہ دیکھتا نہیں ہے کہ میں کیسی بیڑیوں میں جکڑا ہوا ہوں۔ میرا اس میں کیا بس ہے۔ اگر مالک کے

احکام کی تعمیل نہ کروں تو کنبہ کی پرورش کیسے ہو۔ برسوں تک خاک چھاننے کے بعد تو یہ مستقل ملازمت ملی ہے۔ اسے چھوڑوں تو پھر اسی طرح کوچہ گردی اختیار کرنی ہو گی۔ ابھی کچھ اور نہیں ہے تو روٹی دال کا سہارا تو ہے۔ خانہ داری وفکر ضمیر کی آزادی کے لیے مہلک ہے۔

طاہر علی کو لاجواب ہو جانا پڑا۔ بے چارے اپنی بیوی کے سارے گہنے بیچ کر کھا چکے تھے۔ اب ایک چھلا بھی نہ تھا۔ ماہر علی انگریزی پڑھتا تھا۔ اس کے لیے اچھے کپڑے بنوانے پڑتے۔ ماہ بماہ فیس دینی پڑتی۔ ظاہر علی اور جابر علی اردو مدرسہ میں پڑھتے تھے، لیکن ان کی والدہ روز ہی جان کھایا کرتی تھی کہ انہیں بھی انگریزی مدرسہ میں بھرتی کرا بھائیوں کی نازبرداری پر ان کی ساری ضرورتیں قربان تھیں۔ پاجامہ میں اتنے پیوند لگا جاتے کہ کپڑے کی اصل شکل ہی چھپ جاتی تھی۔ نئے جوتے پہننا تو شاید ان پانچ برسوں میں انہیں نصیب ہی نہیں ہوا۔ ماہر علی کے پرانے جوتوں پر قناعت کرنی پڑتی تھی۔ خوش نصیبی سے ماہر علی کے پیر بڑے تھے۔ حتی الامکان وہ اپنے بھائیوں کو ذرا بھی تکلیف نہ ہونے دیتے تھے، لیکن کبھی ہاتھ تنگ رہنے کے سبب ان کے لیے نئے کپڑے نہ بنوا سکتے یا فیس دینے میں دیر ہو جاتی۔ یا ناشتہ نہ مل سکتا۔ یا مدرسہ میں کچھ کھانے کے لیے پیسے نہ ملتے تو دونوں مائیں تلخ اور طعن آمیز باتوں سے ان کو چھید ڈالتی تھیں۔ بیکاری کے ایام میں وہ اکثر اپنا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے بیوی اور بچوں کو اپنی سسرال پہنادیا کرتے تھے۔ غیرت کے سبب سے ایک آدھ مہینہ کے لیے بلا لیتے اور پھر کسی نہ کسی حیلہ سے رخصت کر دیتے۔ جب سے مسٹر جان سیوک کے یہاں پناہ گزین ہوئے تھے۔ جبھی سے گویا ان کے دن پھر گئے تھے۔ کل کی فکر سر پر سوار نہ رہتی تھی۔ ماہر علی کی عمر پندرہ سال سے تجاوز کر گئی تھی۔ اب ان کی ساری امیدیں اسی کی ذات سے وابستہ تھیں۔ سوچتے تھے "جب ماہر علی میٹرک ہو جائے گا تو صاحب سے سفارش کر کے پولیس میں بھرتی کرا دوں گا۔ تنخواہ

پچاس روپے ماہوار سے کیا کم ہوگی۔ ہم دونوں بھائیوں کی آمدنی مل کر اسی روپے ہو جائے گی۔ جبھی زندگی کا کچھ لطف ملے گا۔ اس وقت تک ظاہر علی بھی ہاتھ پیر سنبھال لے گا۔ پھر تو چین ہی چین ہے۔ بس تین چار برس کی تکلیف اور ہے۔'' بیوی سے اکثر جھگڑا ہو جاتا۔ وہ کہا کرتی۔ ''یہ بھائی بند ایک بھی تمہارے کام نہ آئیں گے۔ جوں ہی وقت آیا پر جھاڑ کر نکل جائیں گے۔ تم کھڑے تاکتے رہ جاؤ گے۔'' طاہر علی ان باتوں پر بیوی سے روٹھ جاتے۔ اسے گھر میں آگ لگانے والی بس کی گانٹھ کہہ کر رلاتے۔

امیدوں اور فکروں سے اتنا دبا ہوا شخص مسز سیوک کی تلخ کلامی کا کیا جواب دیتا۔ آقا کے قہر نے خدا کے قہر کو مغلوب کر دیا۔ دکھ بھری آواز میں بولے۔ ''حضور کا نمک خوار ہوں۔ آپ کا حکم میرے لیے خدا کے حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ کتابوں میں آقا کو خوش رکھنے کا وہی ثواب لکھا ہے جو خدا کو خوش رکھنے کا ہے۔ حضور کی نمک حرامی کر کے خدا کو کیا منہ دکھلاؤں گا؟''

جان سیوک: ہاں۔ اب آپ آئے راہ راست پر۔ جائیے اپنا کام کیجیے۔ مذہب اور تجارت کو ایک ترازو میں تولنا ایک بیوقوفی ہے۔ مذہب مذہب ہے اور تجارت تجارت۔ ان میں کوئی باہمی تعلق نہیں۔ دنیا میں زندہ رہنے کے لیے تجارت کی ضرورت ہے۔ مذہب کی نہیں۔ مذہب تو تجارت کا سنگار ہے۔ وہ دولت مندوں کے لیے ہی زیبا ہے۔ خدا آپ کو مقدرت دے۔ موقع ملے۔ گھر میں فاضل روپے ہوں تو نماز پڑھیے۔ حج کیجیے۔ مسجد بنوائیے۔ کنواں کھدوائیے۔ جبھی مذہب ہے۔ خالی پیٹ خدا کا نام لینا گناہ ہے۔

طاہر علی نے جھک کر سلام کیا اور گھر واپس گئے۔

(7)

شام ہو گئی تھی، لیکن پھاگن شروع ہو جانے پر بھی سردی سے ہاتھ پاؤں اکڑتے

تھے۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے بدن کی ہڈیوں میں چبھے جاتے تھے۔ جاڑا، بارش کی مدد پا کر پھر اپنی بکھری ہوئی طاقتوں کو مجتمع کر رہا تھا اور دل سے کوشاں تھا کہ موجودہ موسم کو پلٹ دے۔ بادل بھی تھے۔ بوندیں بھی تھیں۔ ٹھنڈی ہوا بھی تھی۔ کہرا بھی تھا۔ ان مختلف طاقتوں کے مقابلہ میں موسم بہار کی ایک نہ چلتی تھی۔ لوگ لحاف میں اس طرح منہ چھپائے ہوئے تھے جیسے چوہے بلوں میں سے جھانکتے ہوں۔ دکان دار انگیٹھیوں کے سامنے بیٹھے ہاتھ سینکتے تھے۔ پیسوں کے سودے نہیں، مروت کے سودے بیچتے تھے۔ راہ چلتے لوگ الاؤ پر یوں گرتے تھے جیسے شمع پر پروانے۔ بڑے گھروں کی عورتیں مناتی تھیں۔ مصرانی آئے، تو آج کھانا پکائیں۔ چولہے کے سامنے بیٹھنے کا موقع ملے۔ چائے کی دکانوں پر جمگھٹ رہتا تھا۔ ٹھاکر دین کے پاس چھبڑی میں پڑے سڑ رہے تھے۔ پر اس کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ ان کو پھیرے۔ سورداس اپنی جگہ پر تو آ بیٹھا تھا۔ پر ادھر ادھر سے سوکھی ٹہنیاں اکٹھی کر کے جلا لی تھیں اور ہاتھ سینک رہا تھا۔ سواریاں آج کہاں۔ ہاں کوئی اکا دکا مسافر نکل جاتا تھا تو بیٹھے بیٹھے اس کا کلیان منا لیتا تھا۔ جب سے سید طاہر علی نے اسے دھمکیاں دی تھیں، زمین کے نکل جانے کا خوف اس پر سوار رہتا تھا۔ سوچتا۔ کیا اسی دن کے لیے میں نے اس زمین کی اتنی حفاظت کی تھی، میرے دن سدا ایسے ہی تھوڑے رہیں گے۔ کبھی تو لچھمی خوش ہوں گی۔ اندھوں کی آنکھیں نہ کھلیں مگر نصیب تو کھل سکتے ہیں۔ کون جانے۔ کوئی دانی داتا مل جائے یا میرے ہی پاس ڈھیرے ڈھیرے کچھ روپے اکٹھے ہو جائیں۔ بنتے دیر نہیں لگتی۔ یہی خواہش تھی کہ یہاں ایک کنواں اور چھوٹا سا مندر بنوا دیتا تو مرنے کے پیچھے اپنی کچھ نشانی رہتی۔ نہیں تو کون جانے گا کہ اندھا کون تھا۔ پسنہاری نے کنواں کھدوایا تھا۔ آج تک اس کا نام چلا جاتا ہے۔ جھکڑ سائیں نے باؤلی بنوائی تھی، آج تک جھکڑ کی باؤلی مشہور ہے۔ زمین نکل گئی تو نام ڈوب جائے گا۔ کچھ روپے ملے بھی تو کس کام کے۔ نایک رام اسے ڈھارس

دیتا تھا۔ ''تم کچھ مت کرو۔کون مائی کا لال ہے جو میرے رہتے تمہاری زمین نکال لے۔لہو کی ندی بہا دوں گا۔اس کرنٹے کی کیا مجال ۔گودام میں آگ لگا دوں گا۔ ادھر کا راستہ چھڑا دوں گا۔وہ ہے کس گمان میں۔بس تم حامی نہ بھرنا۔'' مگر ان الفاظ سے جو تشفی ہوتی تھی وہ بھیرو اور جگدھر کی حاسدانہ بحث سے مٹ جاتی تھی۔اور وہ ایک لمبی سانس کھینچ کر رہ جاتا تھا۔

وہ انہی خیالات میں محو تھا کہ نایک رام کندھے پر لٹھ رکھے اور ایک انگوچھا کندھے پر ڈالے پان کے بیڑے منہ میں بھرے وہاں آ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ''سورداس! بیٹھے ہی رہو گے۔سانجھ ہو گئی۔ہوا کھانے والے اب اس ٹھنڈ میں نہ نکلیں گے۔کھانے بھر کو مل گیا کہ نہیں؟''

سورداس: کہاں مہاراج۔آج تو ایک بھاگوان سے بھی بھینٹ نہ ہوئی۔

نایک رام: جو بھاگ میں تھا مل گیا۔چلو گھر چلیں۔بہت ٹھنڈ لگتی ہو تو میرا یہ انگوچھا کندھے پر ڈال لو۔میں تو ادھر آیا تھا کہ کہیں صاحب مل جائیں تو دو دو باتیں کرلوں۔پھر ایک بار اس کی اور ہماری بھی ہو جائے۔

سورداس چلنے کو اٹھا ہی تھا کہ دفعتاً ایک گاڑی کی آہٹ سنائی دی۔رک گیا۔آس بندھی۔ایک لمحہ میں فٹن آ پہنچی۔سورداس نے آگے بڑھ کر کہا۔'' داتا بھگوان تمہارا کلیان کریں اندھے کی کھبر (خبر) لیجیے۔''

فٹن رک گئی اور چتاری کے راجہ صاحب اتر پڑے۔نایک رام ان کا پنڈا تھا۔ سال میں دو چار سو روپے ان کی ریاست سے پاتا تھا۔ان کو آشیرواد دے کر بولا۔'' سرکار کا ادھر کیسے آنا ہوا؟ آج تو بڑی ٹھنڈ ہے۔''

راجہ صاحب: یہی سورداس ہے جس کی زمین آگے پڑتی ہے؟ آؤ تم دونوں آدمی میرے ساتھ بیٹھ جاؤ۔میں ذرا اس زمین کو دیکھنا چاہتا ہوں۔

نایک رام: سرکار چلیں۔ہم دونوں پیچھے پیچھے آتے ہیں۔

راجہ صاحب: اجی آ کر بیٹھ جاؤ۔ تمہیں آنے میں دیر ہو گی اور میں نے ابھی سندھیا نہیں کی ہے۔

سورداس: پنڈا جی! تم بیٹھ جاؤ۔ میں دوڑتا ہوا چلوں گا۔ گاڑی کے ساتھ ہی ساتھ پہنچوں گا۔

راجہ صاحب: نہیں نہیں۔ تمہارے بیٹھنے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ تم اس وقت بھکاری سورداس نہیں، زمیندار سورداس ہو۔

نایک رام: بیٹھو سور بیٹھو۔ ہمارے سرکار ساکشات دیوتا سروپ ہیں۔

سورداس: پنڈا جی! میں.................

راجہ صاحب: پنڈا جی! تم ان کا ہاتھ پکڑ بٹھا دو۔ یوں نہ بیٹھیں گے۔

نایک رام نے سورداس کو گود میں اٹھا کر گدی پر بٹھا دیا۔ آپ بھی بیٹھے اور فٹن روانہ ہوئی۔ سورداس کو اپنی زندگی میں فٹن پر سوار ہونے کا یہ پہلا موقع تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں اڑا جا رہا ہوں۔ تین چار منٹ میں جب گودام پر گاڑی رک گئی اور راجہ صاحب اتر پڑے تو سورداس کو تعجب ہوا کہ اتنی جلد کیونکر آ گئے۔

راجہ صاحب: زمین تو بڑے موقع کی ہے۔

سورداس: سرکار! باپ دادوں کی نشانی ہے۔

سورداس کے دل میں طرح طرح کی بدگمانیاں پیدا ہو رہی تھیں۔ ''کیا صاحب نے ان کو یہ زمین دیکھنے کے لیے بھیجا ہے؟ سنا ہے یہ بڑے دھرماتما آدمی ہیں۔ تو انہوں نے صاحب کو سمجھا کیوں نہ دیا؟ بڑے آدمی سب ایک ہوتے ہیں۔ چاہے ہندو یا مسلمان۔ تبھی تو میرا اتنا آدر کر رہے ہیں۔ جیسے بکرے کی گردن کاٹنے سے پہلے اسے پیٹ بھر دانہ کھلا دیتے ہیں۔ لیکن میں ان کی باتوں میں آنے والا نہیں ہوں۔''

راجہ صاحب: اسامیوں کے ساتھ بندوبست ہے؟

نایک رام: نہیں سرکار۔ ایسی ہی پرتی پڑی رہتی ہے۔ سارے محلّہ کی گائیں یہیں چرنے آتی ہیں۔ اٹھا دی جائے تو دوسو سے کم نفع نہ ہو، پر یہ کہتا ہے۔ اب بھگوان مجھے یونہی کھانے بھر کو دے دیتے ہیں تو اسے کیوں اٹھاؤں؟

راجہ صاحب: اچھا تو سورداس دان لیتا ہی نہیں۔ دیتا بھی ہے۔ ایسے لوگوں کے درشن ہی سے پن ہوتا ہے۔

نایک رام کی نگاہ میں سورداس کی اتنی عزت کبھی نہ ہوئی تھی۔ بولے۔ ''حضور! اس جنم میں کوئی بڑا بھاری مہاتما ہے۔''

راجہ صاحب: اس جنم کا نہیں، اس جنم کا مہاتما ہے۔

سچا سخی شہرت کا خواہش مند نہیں ہوتا۔ سورداس کو اپنی قربانی اور سخاوت کی اہمیت کا علم ہی نہ تھا۔ شاید ہوتا تو مزاج میں اتنی سادگی اور عاجزی نہ رہتی بلکہ اپنی تعریف کانوں کو اچھی لگتی۔ مہذب نگاہوں میں سخاوت کا یہی بہترین انعام ہے۔ سورداس کا دان زمین یا آسمان کا دان تھا۔ جسے تعریف یا شہرت کی فکر نہیں ہوتی۔ اس کو راجہ صاحب کی فیاضی میں فریب کا شائبہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ یہ جاننے کے لیے بے قرار ہو رہا تھا کہ راجہ صاحب کا ان باتوں سے مطلب کیا ہے؟

نایک رام، راجہ صاحب کو خوش کرنے کے لیے سورداس کی تعریف کرنے لگے۔ ''دھرم اوتار! اتنے پر بھی انہیں چین نہیں ہے۔ یہاں دھرم شالا، مندر اور کنواں بنوانے کا ارادہ کر رہے ہیں۔''

راجہ صاحب: واہ پھر تو بات ہی بن گئی۔ کیوں سورداس! تم اس زمین سے نو بیگھے مسٹر جان سیوک کو دے دو۔ ان سے جو روپے ملیں۔ انہیں دھرم کاج میں لگا دو۔ اس طرح تمہاری خواہش بھی پوری ہو جائے گی اور صاحب کا کام بھی نکل جائے گا۔ دوسروں سے اتنے اچھے دام نہ ملیں گے۔ بولو کتنے روپے دلا دوں۔

نایک رام سورداس کو خاموش دیکھ کر ڈر گئے کہ کہیں یہ انکار کر بیٹھا تو میری بات

گئی۔ بولے۔ ''سورداس! ہمارے مالک کو جانتے ہونا؟ چتاری کے مہاراجہ ہیں۔ اسی دربار سے ہماری پرورش ہوتی ہے۔ میونسپلٹی کے سب سے بڑے حاکم ہیں۔ آپ کے حکم بنا کوئی اپنے دروازے پر کھونٹا بھی نہیں گاڑ سکتا۔ چاہیں تو سب یکہ بانوں کو پکڑ ڈالیں۔ سارے شہر کا پانی بند کر دیں۔''

سورداس: جب آپ کو اتنا بڑا اختیار ہے تو صاحب کو کوئی دوسری زمین کیوں نہیں دلا دیتے؟

راجہ صاحب: ایسے اچھے موقع پر شہر میں دوسری زمین ملنی مشکل ہے، لیکن تمہیں اس کے دینے میں کیا قباحت ہے۔ اس طرح تو نہ جانے کتنے دنوں میں تمہاری آرزوئیں پوری ہوں گی۔ یہ تو بہت اچھا موقع ہاتھ آیا ہے۔ روپے لے کر دھرم کاج میں لگا دو۔

سورداس: مہاراج! میں خوشی سے اپنے زمین نہ بیچوں گا۔

نایک رام: سورداس! کچھ بھنگ تو نہیں کھا گئے ہو؟ کچھ خیال ہے۔ کس سے باتیں کر رہے ہو؟

سورداس: پنڈا جی! سب خیال ہے۔ انکھیں نہیں ہیں تو کیا بدھی (عقل) بھی نہیں ہے؟ پر جب میری چیز ہے ہی نہیں تو میں اس کا بیچنے والا کون ہوں۔

راجہ صاحب: یہ زمین تو تمہاری ہی ہے؟

سورداس: نہیں سرکار! میری نہیں۔ میری باپ دادوں کی ہے۔ میری چیز وہی ہے جو میں نے اپنے بانہہ بل (ہاتھوں کی مشقت) سے پیدا کی ہو۔ یہ زمین مجھے میرے دھروہر (امانت) ملی ہے۔ میں اس کا مالک نہیں ہوں۔

راجہ صاحب: سورداس! تمہاری یہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی۔ اگر اور زمینداروں کے دل میں ایسے ہی خیالات ہوتے تو آج سینکڑوں گھر اس طرح تباہ نہ ہوتے۔ صرف عیش وعشرت کے لیے لوگ بڑی بڑی ریاستیں برباد کر دیتے ہیں۔

پنڈا جی! میں نے کونسل میں یہ تجویز پیش کی ہے کہ زمینداروں کو اپنی جائداد بیچنے کا اختیار نہیں ہے، لیکن جو جائیداد دھرم کاج کے لیے بیچی جائے اس کو میں بیچنا نہیں کہتا۔

سورداس: دھرم اوتار! میرا تو اس زمین کے ساتھ اتنا ہی ناتا ہے کہ جب تک جیوں، اس کی حفاظت کروں اور مروں تو اسے جوں کا توں چھوڑ جاؤں۔

راجہ صاحب: لیکن یہ تو سوچو کہ تم اپنی زمین کا ایک حصہ صرف اس لیے دوسرے کو دے رہے ہو کہ مندر وغیرہ بنوانے کے لیے روپے مل جائیں۔

نایک رام: بولو۔ سورداس۔ مہاراج کی اس بات کا کیا جواب دیتے ہو؟

سورداس: میں سرکار کی باتوں کا جواب دینے جوگ (لائق) ہوں کہ جواب دوں۔ مگر اتنا تو سرکار جانتے ہی ہیں کہ لوگ انگلی پکڑتے ہی پہنچا پکڑ لیتے ہیں۔ صاحب پہلے تو نہ بولیں گے۔ پھر دھیرے دھیرے احاطہ بنالیں گے۔ کوئی مندر میں جانے نہ پائے گا۔ ان سے کون روز روز لڑائی کرے گا؟

نایک رام: مہاراج! سورداس نے یہ بات پکی کہی۔ بڑے آدمیوں سے کون لڑتا پھرے گا۔

راجہ صاحب: صاحب کیا کریں گے؟ کیا تمہارا مندر کھود کر پھینک دیں گے؟

نایک رام: بولو سورداس اب کیا کہتے ہو؟

سورداس: سرکار! غریب کی گھر والی گاؤں کی بھاوج ہوتی ہے۔ صاحب کرستان ہیں۔ دھرم شالہ میں تمباکو کا گودام بنائیں گے۔ مندر میں ان کے مجور (مزدور) سوئیں گے۔ کنوئیں پر ان کے مجوروں کا اڈا ہوگا۔ بہو بیٹیاں پانی بھرنے نہ جاسکیں گی۔ صاحب نہ کریں گے تو صاحب کے لڑکے کریں گے۔ میرے باپ دادوں کا نام ڈوب جائے گا۔ نا سرکار! مجھے اس دلدل میں نہ پھنسایئے۔

نایک رام: دھرم اوتار! سورداس کی بات میرے من میں بھی بیٹھی ہے۔ تھوڑے

دنوں میں مندر، دھرم شالا، کنواں سب صاحب کا ہو جائے گا۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں۔

راجہ صاحب: اچھا۔ یہ بھی مانا، لیکن ذرا یہ بھی سوچو کہ اس کارخانہ سے لوگوں کو کیا فائدہ ہوگا۔ ہزاروں مزدور، مستری، بابو، منشی، لوہار، بڑھئی آ کر آباد ہو جائیں گے۔ ایک اچھی بستی ہو جائے گی۔ بنیوں کی نئی نئی دکانیں کھل جائیں گی۔ آس پاس کے کسانوں کو اپنی ساگ بھاجی لے کر شہر نہ جانا پڑے گا۔ یہیں کھڑے دام مل جائیں گے۔ کنجڑے، گوالے، دھوبی، درزی، سبھی کو فائدہ ہوگا۔ کیا اس کا ثواب تم کو نہ ہوگا؟

نا یک رام: اب بولو۔ سورداس! اب تو کچھ نہیں کہنا ہے۔ ہمارے سرکار کی بھل منسی ہے کہ تم سے اتنی دلیلیں کر رہے ہیں۔ دوسرا حاکم ہوتا تو ایک حکم نامہ میں ساری زمین تمہارے ہاتھ سے نکل جاتی۔

سورداس: اس لیے تو لوگ چاہتے ہیں کہ حاکم دھرماتما ہوں۔ نہیں تو کیا دیکھتے نہیں ہیں کہ حاکم لوگ بنا ڈام فول، سور کے بات نہیں کرتے۔ ان کے سامنے کھڑے نہ ہونے کا توہیاؤ ہی نہیں ہوتا۔ باتیں کون کرتا؟ اس لیے تو مناتے ہیں کہ ہمارے راجوں مہاراجوں کا راج ہوتا جو ہمارا دکھ درد سنتے۔ سرکار بہت ٹھیک کہتے ہیں۔ محلّہ کی رونق ضرور بڑھے گی۔ روزگاری سے لوگوں کو فائدہ بھی خوب ہوگا، لیکن جہاں یہ رونق ہوگی وہاں تاڑی شراب کا بھی تو پرچار بڑھ جائے گا۔ کسبیاں بھی تو آ کر بس جائیں گی۔ پردیسی آدمی ہماری بہو بیٹیوں کو گھوریں گے۔ کتنا ادھرم ہوگا؟ دیہات کے کسان اپنا کام چھوڑ کر مجوری کی لالچ سے دوڑیں گے۔ یہاں بری بری باتیں سیکھیں گے اور اپنے برے اچرن (چال چلن) اپنے گاؤں میں پھیلائیں گے۔ دیہاتوں کی بیٹیاں بہوئیں مجوری کرنے آئیں گی۔ اور یہاں پیسے کے لوبھ میں اپنا دھرم بگاڑیں گی۔ جو رونق شہروں میں ہے، وہی رونق یہاں ہو جائے گی۔ بھگوان نہ کریں یہاں وہ بات ہو۔ سرکار مجھے اس کو کرم اور ادھرم سے

بچائیں۔ یہ سارا پاپ میرے سر پڑے گا۔

نا یک رام: دین بندھو! سورداس بہت سچی بات کہتا ہے۔کلکتہ، بمبئی، احمد آباد، کان پور آپ کے اکبال (اقبال) سے سبھی جگہ گھوم آیا ہوں۔ جمان لوگ بلاتے رہتے ہیں۔ جہاں جہاں کل کارخانے ہیں، وہاں وہاں یہی حال دیکھا ہے۔

راجہ صاحب: کیا یہ برائیاں تیرتھ کے مقاموں میں نہیں ہیں؟

سورداس: سرکار! ان کا سدھار بھی تو بڑے آدمیوں ہی کے ہاتھ میں ہے۔ جہاں بری باتیں پہلے ہی سے ہیں، وہاں سے ہٹانے کے بدلے انہیں اور پھیلانا تو مناسب نہیں۔

راجہ صاحب: ٹھیک کہتے ہو۔ سورداس! بہت ٹھیک کہتے ہو۔تم جیتے۔ میں ہار گیا۔ تمہاری باتوں سے طبیعت خوش ہوگئی۔ کبھی شہر آنا تو میرے یہاں ضرور آنا۔ جس وقت میں نے صاحب سے اس زمین کے طے کرا دینے کا وعدہ کیا تھا، یہ باتیں میرے دھیان میں نہ آئی تھیں۔ اب تم خاطر جمع رکھو۔ میں صاحب سے کہہ دوں گا کہ سورداس زمین نہیں دیتا۔ نا یک رام! دیکھو۔ سورداس کو کسی بات کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ اب میں چلتا ہوں ۔ یہ لو سورداس! یہ تمہارے اتنے دور آنے کی مزدوری ہے۔

یہ کہہ کر انہوں نے ایک روپیہ سورداس کے ہاتھ پر رکھا اور چل دیئے۔ نا یک رام نے کہا: ''سورداس! اب راجہ صاحب بھی تمہاری کھوپڑی کو مان گئے۔''

(8)

صوفیہ کو اندو کے ساتھ رہتے چار مہینے گزر گئے۔ اپنے گھر اور گھر والوں کی یاد آتے ہی اس کے دل میں ایک آگ سی جل اٹھتی تھی۔ پربھوسیوک روزانہ ایک بار اس سے ملنے آیا کرتا، پر کبھی اس سے گھر کے حالات نہ پوچھتی۔ وہ کبھی ہوا کھانے بھی نہ جاتی کہ کہیں ماما سے سامنا نہ ہو جائے۔ اگر چہ اندو نے اس کے ذاتی حالات

کو سب سے مخفی رکھا تھا لیکن قیاس سے بھی اس کے حالات سے واقف ہو گئے تھے۔ اس لیے ہر شخص کو یہ خیال رہتا تھا کہ کوئی ایسی بات نہ ہونے پائے جو اس کو ناگوار ہو۔ اندو کو تو اس سے اتنی محبت ہو گئی تھی کہ زیادہ تر اسی کے پاس بیٹھی رہتی۔ اس کی صحبت سے اندو کو بھی مذہب اور فلسفہ کی کتابوں سے رغبت ہونے لگی تھی۔

گھر ٹپکتا ہو تو اس کی مرمت کی جاتی ہے۔ گر جائے، اسے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ صوفی کو جب معلوم ہوا کہ یہ لوگ میری ساری باتیں جان گئے، تو اس نے پردہ رکھنے کا خیال ترک کر دیا۔ مذہبی کتب کے مطالعہ میں مصروف ہو گئی۔ پرانی کدورتیں دل سے مٹنے لگیں۔ ماں کی دل خراش باتوں کا زخم مندمل ہونے لگا۔ وہ تنگ خیالی جو ذاتی جذبات اور خیالات کو نامناسب اہمیت دے دیتی ہے، اس کو اشاعت اور اخلاق کے دائرہ میں آ کر ہیچ معلوم ہونے لگی۔ دل نے کہا یہ ماما کا قصور نہیں بلکہ ان کی مذہبی تنگ خیالی کا قصور ہے۔ ان کے خیال کا دائرہ محدود ہے۔ ان میں آزاد خیالی کا احترام کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ ان سے میں ناحق ناراض ہو رہی ہوں۔ یہی ایک کانٹا تھا جو اس کے دل میں ہمیشہ کھٹکتا رہتا تھا۔ جب وہ نکل گیا تو دل کو سکون ہو گیا۔ اس کا وقت مذہبی کتب کے مطالعہ اور مذہبی اصولوں کی تحقیقات میں گزرنے لگا۔ انہاک، درد دل کا بہترین علاج ہے۔

لیکن اس مطالعہ اور تحقیقات سے اس کے دل کو قرار آ جاتا ہو، یہ بات نہ تھی۔ طرح طرح کے شکوک ہر روز پیدا ہوتے رہتے تھے۔ زندگی کا مقصد کیا ہے؟ ہر مذہب میں اس کا جدا جدا جواب ملتا تھا، لیکن ایک بھی ایسا نہیں ملا جس کو دل قبول کرے۔ معجزات کیا ہیں؟ کیا صرف عقیدت مندوں کی فرضی باتیں ہیں۔ سب سے مشکل مسئلہ یہ تھا کہ عبادت کا مقصد کیا ہے؟ خدا کیوں انسانوں سے اپنی عبادت کے لیے کہتا ہے؟ اس سے اس کی منشا کیا ہے؟ کیا وہ اپنی ہی خلقت سے اپنی تعریف سن کر خوش ہوتا ہے۔ وہ ان سوالوں پر غور کرنے میں اس قدر محو رہتی کہ کئی کئی روز مرہ

سے باہر نہ نکلتی۔ کھانے پینے کی بھی سدھ نہ رہتی۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی اندو کا آنا اسے برا معلوم ہوتا۔

ایک روز صبح کے وقت وہ کوئی مذہبی کتاب پڑھ رہی تھی کہ اندو آ کر بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ اداس تھا۔ صوفیہ اس کی جانب متوجہ نہ ہوئی۔ حسب سابق مطالعہ میں مصروف رہی۔ اندو بولی۔ ''صوفی! اب یہاں دو چار دن کی اور مہمان ہوں۔ مجھے بھول تو نہ جاؤ گی؟''

صوفی نے سر اٹھائے بغیر ہی کہا۔ ''ہاں!''۔

اندو: تمہارا دل تو اپنی کتابوں میں بہل جائے گا۔ میری یاد بھی نہ آئے گی۔ پر مجھ سے تمہارے بغیر ایک دن بھی نہ رہا جائے گا۔

صوفی نے کتاب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہاں۔''

اندو: پھر نہ جانے کب ملاقات ہو۔ سارا دن پڑے پڑے سوچا کروں گی۔

صوفی نے کتاب کا ورق الٹتے ہوئے کہا۔ ''ہاں''۔

اب اندو، صوفیہ کی اس سرد مہری کو برداشت نہ کر سکی۔ کسی دوسرے وقت وہ ناراض ہو کر چلی جاتی یا اس کو مطالعہ میں محو دیکھ کر کمرہ میں قدم ہی نہ رکھتی لیکن اس وقت اس کا ملائم دل جدائی کے درد سے بھرا ہوا تھا۔ اس میں روٹھنے کے خیال کی گنجائش نہ تھی۔ رو کر بولی۔ ''بہن! ایشور کے لیے ذرا کتاب بند کر دو۔ میں چلی جاؤں گی تو پھر خوب پڑھ لینا۔ وہاں سے تمہیں چھیڑنے نہ آؤں گی۔''

صوفی نے اندو کی طرف دیکھا۔ گویا مراقبہ سے بیدار ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ چہرہ اداس تھا اور سر کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ بولی ''ارے اندو! کیا بات ہے؟ روتی کیوں ہو؟''

اندو: تم اپنی کتاب پڑھو۔ تمہیں کسی کے رونے دھونے کی کیا پروا ہے؟ ایشور نے نہ جانے کیوں تمہارے جیسا دل مجھ کو نہیں دیا۔

صوفیہ: بہن! معاف کرنا! میں ایک بڑی الجھن میں پڑی ہوئی تھی۔ ابھی تک وہ گتھی نہیں سلجھی۔ میں بت پرستی کو بالکل لغو خیال کرتی تھی۔ میں سمجھتی کہ رشیوں نے صرف جہلاء کی روحانی تسکین کے لیے یہ طریقہ ایجاد کیا ہے، لیکن اس کتاب میں بت پرستی کا جواز ایسے عالمانہ دلائل کے ذریعہ ثابت کیا گیا ہے کہ آج میں مورتی پوجا کی قائل ہوگئی۔ مصنف نے اس کو سائنٹیفک طریقہ پر ثابت کیا ہے۔ یہاں تک کہ مورتوں کی بناوٹ اور دکھاوٹ کو بھی انہیں طریقوں پر مبنی قرار دیا گیا ہے۔

اندو: میرے لیے بلاوا آ گیا۔ آج کے تیسرے دن چلی جاؤں گی۔

صوفیہ: یہ تو تم نے بری خبر سنائی۔ پھر میں یہاں کیسے رہوں گی؟

اس جملہ میں ہمدردی نہیں بلکہ خود غرضی تھی لیکن اندو نے اس کا مطلب یہ سمجھا کہ صوفی کے لیے میری جدائی نا قابل برداشت ہوگی۔ بولی۔ ''تمہارا جی تو کتابوں میں بہل جائے گا۔ میں البتہ تمہاری یاد میں تڑپا کروں گی۔ سچ جانو تمہاری صورت ایک لمحہ کے لیے بھی خیال سے نہ ہٹے گی۔ یہ موہنی صورت آنکھوں کے سامنے پھرا کرے گی۔ بہن اگر تمہیں برا نہ لگے تو ایک استدعا کروں۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ تم بھی کچھ دن میرے ساتھ رہو؟ تمہاری صحبت سے میری زندگی بھی سدھر جائے گی۔ میں اس کے لیے ہمیشہ تمہاری ممنون رہوں گی۔''

صوفیہ: تمہاری محبت کی اسیر ہوں۔ جہاں چاہو لے چلو۔ چاہوں تو جاؤں گی۔ نہ چاہوں تو نہ جاؤں گی۔ مگر یہ تو بتاؤ تم نے راجہ صاحب سے بھی پوچھ لیا ہے۔

اندو: یہ ایسی کون سی بات ہے جس کے لیے ان کی صلاح لینی پڑے۔ مجھ سے برابر کہتے رہتے ہیں کہ تمہارے لیے ایک لیڈی کی ضرورت ہے۔ اکیلے تمہارا جی گھبراتا ہوگا۔ یہ تجویز سن کر خوشی سے پھولے نہ سائیں گے۔

رانی جانہوی تو اندو کے رخصت کی تیاریاں کر رہی تھیں اور اندو صوفیہ کے لیے لیس اور کپڑے لا لا کر رکھتی تھی۔ انواع و اقسام کی پوششوں سے کئی صندوق بھر

دیئے۔ وہ اسے ایسے ٹھاٹ سے لے جانا چاہتی تھی کہ گھر کی لونڈیاں باندیاں اس کی مناسب احترام کریں۔ پربھو سیوک کو صوفیہ کا اندو کے ساتھ جانا اچھا نہ لگتا تھا۔ اس کو اب بھی امید تھی کہ ماما کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا اور وہ صوفی کو گلے لگائیں گی۔ صوفی کے چلے جانے سے مغائرت کا بڑھنا یقینی امر تھا۔ اس نے صوفیہ کو سمجھایا، لیکن وہ اندو کی تجویز کو نامنظور نہ کرنا چاہتی تھی۔ اس نے عہد کر لیا کہ اب گھر نہ جاؤں گی۔

تیسرے روز راجہ مہیندر رکمار، اندو کو رخصت کرانے آئے، تو اندو نے اور باتوں کے ساتھ صوفی کو ساتھ لے چلنے کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ بولی۔ ''میرا جی وہاں اکیلے گھبرایا کرتا ہے۔ مس صوفیہ کے رہنے سے میرا جی بہل جائے گا۔''

مہیندر: کیا مس سیوک ابھی تک یہیں ہیں؟

اندو: بات یہ ہے کہ وہ مذہبی معاملات میں آزادخیالی چاہتی ہیں اور ان کے گھر والے اس آزادخیالی کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اسی وجہ سے وہ اپنے گھر نہیں جانا چاہتیں۔

مہیندر: لیکن یہ تو سوچو کہ ان کے میری یہاں رہنے سے میری کتنی بدنامی ہوگی۔ مسٹر سیوک کو یہ بات بری لگے گی اور یہ بالکل غیر مناسب ہے کہ میں ان کی لڑکی کو ان کی مرضی کے بغیر اپنے گھر میں رکھوں۔ اس میں سراسر بدنامی ہوگی۔

اندو: مجھے تو اس میں بدنامی کی کوئی بات نظر نہیں آتی۔ کیا سہیلی اپنی سہیلی کے یہاں مہمان نہیں ہوتی۔ صوفی کا مزاج بھی ایسا نہیں ہے کہ وہ ادھر ادھر گھومنے لگے گی۔

مہیندر: وہ دیوی سہی لیکن ایسے کتنے ہی وجوہ ہیں کہ میں ان کا تمہارے ساتھ جانا نامناسب سمجھتا ہوں۔ تم میں یہ بڑا عیب ہے کہ تم کسی کام کو کرنے سے پہلے اس پر غور کر لینا ٹھیک نہیں سمجھتیں۔ کیا تمہاری رائے میں خاندانی رواج کی مخالفت کرنے میں کوئی برائی نہیں؟ ان کے گھر والے یہی تو چاہتے ہیں کہ وہ ظاہراً طریقہ پر اپنے

مذہبی احکام کی پابندی کریں۔ اگر وہ اتنا بھی نہیں کر سکتیں تو میں یہی کہوں گا کہ ان کی آزادخیالی موزونیت کی حد سے بہت زیادہ تجاوز کر گئی ہے۔

اندو: لیکن میں ان سے وعدہ کر چکی ہوں۔ میں کئی دن سے انہیں تیاریوں میں مصروف ہوں۔ یہاں اماں جی سے اجازت لے چکی ہوں۔ گھر کے سبھی لوگ نوکر چاکر جانتے ہیں کہ وہ میرے ساتھ جا رہی ہیں۔ ایسی حالت میں اگر میں ان کو نہ لے گئی تو لوگ اپنے دل میں کیا کہیں گے؟ سوچیے اس میں میری کتنی رسوائی ہو گی۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گی۔

مہیندر: بدنامی سے بچنے کے لیے سب کچھ کیا جا سکتا ہے۔ تمہیں مس سیوک سے کہتے شرم آتی ہو تو میں کہہ دوں۔ وہ اتنی نادان نہیں ہیں کہ اتنی موٹی سی بات نہ سمجھیں۔

اندو: مجھے ان کے ساتھ رہتے رہتے ان سے اس قدر محبت ہو گئی ہے کہ ان سے ایک دن بھی علیحدہ رہنا مجھے دشوار معلوم ہوتا ہے۔ اس کی تو خیر پروا نہیں۔ جانتی ہوں۔ کبھی نہ کبھی ان سے جدائی ہو گی ہی۔ اس وقت سب سے زیادہ فکر مجھے اپنی سبکی کی ہے۔ لوگ کہیں گے۔ بات کہہ کر پلٹ گئی۔ صوفی نے پہلے صاف انکار کر دیا تھا۔ میرے بہت کہنے سننے پر راضی ہوئی تھی۔ آپ میری خاطر سے اب کے میری یہ استدعا قبول کیجیے۔ پھر میں آپ سے پوچھے بغیر کوئی کام نہ کروں گی۔

مہیندر کمار کسی طرح راضی نہ ہوئے۔ اندو روئی۔ اس نے منت سماجت کی۔ وہ پیروں پڑی۔ اس نے وہ سبھی منتر پھونکے جو کبھی بے اثر نہیں ہوتے لیکن شوہر کا پتھر کا دل نہ پسیجا۔ ان کو اپنا نام دنیا کی سب چیزوں سے زیادہ عزیز تھا۔

جب مہیندر کمار باہر چلے گئے تو اندو بہت دیر تک حالت غم میں بیٹھی رہی۔ بار بار یہی خیال آتا۔ صوفی اپنے دل میں کیا کہے گی۔ میں نے اس سے کہہ رکھا تھا کہ میرے سوامی میری کوئی بات نہیں ٹالتے۔ اب وہ سمجھے گی کہ وہ اس کی بات بھی نہیں

پوچھتے۔بات بھی ایسی ہی ہے۔انہیں میری کیا پروا ہے؟باتیں ایسی کریں گے گویا ان سے زیادہ فیاض طبع دنیا میں کوئی شخص نہیں ہے۔ پر وہ سب کوری بکواس ہے۔ انہیں تو یہی منظور ہے کہ یہ دن بھر تنہا بیٹھی اپنے نام کورویا کرے۔دل میں جلتے ہوں گے کہ صوفی کے ساتھ اس کے دن بھی آرام سے کٹیں گے۔ مجھے قیدیوں کی طرح رکھنا چاہتے ہیں۔انہیں ضد کرنا آتا ہے تو میں کیا ضد نہیں کرسکتی۔ میں بھی کہے دیتی ہوں۔آپ صوفی کو نہ چلنے دیں گے تو میں بھی نہ جاؤں گی۔میرا کرہی کیا سکتے ہیں! کچھ نہیں۔دل میں ڈرتے ہیں کہ صوفی کے جانے سے گھر کا خرچ بڑھ جائے گا۔ خسیس تو ہیں ہی۔اس خست کو چھپانے کے لیے بدنامی کا بہانہ نکالا ہے۔دل غمگین ہوکر دوسروں کی نیک نیتی پر شک کرنے لگتا ہے۔

شام کے وقت جانہوی سیر کرنے چلی تو اندو نے اس سے یہ باتیں کہیں اور اصرار کیا کہ تم مہیندر کو سمجھا کر صوفی کو لے جانے پر راضی کردو۔جانہوی نے کہا ”تمہیں کیوں نہیں مان جاتیں؟“

اندو: اماں! میں سچے دل سے کہہ رہی ہوں۔میں ضد نہیں کرتی۔اگر میں نے پہلے ہی صوفیہ سے نہ کہہ دیا ہوتا تو مجھے ذرا بھی ملال نہ ہوتا۔پر ساری تیاریاں کر کے اب اس کو نہ لے جاؤں تو وہ اپنے دل میں کیا کہے گی۔میں اس کو منہ نہیں دکھا سکتی۔ یہ اتنی چھوٹی سی بات ہے کہ اگر میرا ذرا بھی خیال ہوتا تو وہ انکار نہ کرتے۔ایسی حالت میں آپ کیونکر امید کرسکتی ہیں کہ میں ان کے ہر حکم کی تعمیل کروں؟

جانہوی: وہ تمہارے سوامی ہیں۔ان کی سبھی باتیں تمہیں ماننی پڑیں گی۔

اندو: خواہ وہ میری ذرا ذرا سی باتیں بھی نہ مانیں؟

جانہوی: ہاں انہیں اس کا اختیار ہے۔ مجھے شرم آتی ہے کہ میری نصیحتوں کا تمہارے اوپر کچھ بھی اثر نہ ہوا۔میں تم کو شوہر پرستی دیکھنا چاہتی ہوں جسے اپنے شوہر کے حکم یا مرضی کے سامنے اپنی عزت یا ذلت کا ذرا بھی خیال نہیں ہوتا۔اگر وہ

تمہیں سر کے بل چلنے کو کہیں تو تمہارا فرض ہے کہ سر کے بل چلو۔ تم اتنے ہی میں گھبرا گئیں۔

اندو: آپ مجھ سے وہ کرنے کے لیے کہتی ہیں جو میرے لیے ناممکن ہے۔

جانہوی: چپ رہو۔ میں تمہارے منہ سے ایسی باتیں نہیں سن سکتی۔ مجھے اندیشہ ہو رہا ہے کہ کہیں صوفی کی آزاد خیالی کا جادو تمہارے اوپر بھی تو نہیں چل گیا؟

اندو نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ خوف تھا کہ میرے منہ سے کوئی ایسا لفظ نہ نکل پڑے جس سے اماں کے دل میں یہ شک اور بھی جگہ پکڑ لے تو بے چاری صوفی کا یہاں رہنا ہی مشکل ہو جائے۔ وہ راستہ بھر یک دم خاموش بیٹھی رہی۔ جب گاڑی پھر مکان پر پہنچی اور وہ اتر کر اپنے کمرہ کی طرف جانے لگی تو جانہوی نے کہا۔ ''بیٹی! تم سے ہاتھ جوڑ کر کہتی ہوں۔ مہیندر سے اس بارے میں اب ایک لفظ بھی نہ کہنا۔ نہیں تو مجھے بہت رنج ہوگا۔''

اندو نے ماں کو کچھ اس انداز سے دیکھا جس سے اس کی خستہ دلی کا اظہار ہوتا تھا۔ پھر اپنے کمرہ میں چلی گئی۔ خوش قسمتی سے مہیندر کمار کھانا کھا کر سیدھے باہر چلے گئے ورنہ اندو کے لیے اپنے خیالات کا روکنا بہت مشکل ہو جاتا۔ اس کے دل میں رہ رہ کر اس امر کی تحریک ہوتی تھی کہ چل کر صوفیہ سے معافی مانگوں۔ صاف صاف کہہ دوں۔ ''بہن میرا کچھ بس نہیں ہے۔ میں کہنے کو رانی ہوں مگر دراصل مجھے اس قدر آزادی بھی نصیب نہیں جس قدر کہ میرے گھر کے مہریوں کو ہے۔'' لیکن یہ سوچ کر رہ جاتی کہ شوہر کی غیبت کرنا میرے مذہبی فرض کے خلاف ہے۔ میں صوفی کی نگاہوں میں گر جاؤں گی۔ وہ سمجھے گی اس میں ذرا بھی خودداری نہیں ہے۔

نو بجے ونے سنگھ اس سے ملنے آئے۔ وہ دماغی ہیجان کی حالت میں بیٹھی ہوئی اپنے صندوق میں سے صوفی کے لیے خریدے ہوئے کپڑے نکال رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ انہیں اس کے پاس کیسے بھیجوں۔ خود جانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ ونے

سنگھ کو دیکھ کر بولی۔ ’’کیوں ونے! اگر تمہاری استری اپنی کسی سہیلی کو چند دنوں کے لیے اپنے ساتھ رکھنا چاہے تو تم اسے منع کر دو گے یا خوش ہو گے؟‘‘

ونے: میرے سامنے یہ سوال کبھی پیدا ہی نہ ہوگا۔ اس لیے میں اس خیال سے اپنے دماغ کو تکلیف نہیں دینا چاہتا۔

اندو: یہ سوال تو پہلے ہی پیدا ہو چکا ہے۔

ونے: بہن! مجھے تمہاری باتوں سے خوف معلوم ہوتا ہے۔

اندو: اس لیے کہ تم اپنے کو دھوکا دے رہے ہو لیکن دراصل تم اس سے بہت گہرے پانی میں ہو جتنا تم سمجھتے ہو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ تمہارا کئی کئی روز تک گھر میں نہ آنا۔ ہر وقت سیوا سمتی کے کاموں میں مشغول رہنا۔ مس صوفیہ کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھنا۔ اس کے سایہ سے بھاگنا۔ اس ہل چل کو چھپا سکتا ہے جو تمہارے دل میں تیزی کے ساتھ مچی ہوئی ہے؟ لیکن یاد رکھنا کہ اس ہل چل کی آواز ذرا بھی سنائی دے ورنہ اچھا نہ ہوگا۔ صوفیہ تمہارا اس قدر احترام کرتی ہے جتنا کوئی ستی اپنے شوہر کا بھی نہ کرتی ہوگی۔ وہ تم پر عقیدت رکھتی ہے۔ تمہارے ضبط، ایثار اور خدمت کے جذبات نے اس کو فریفتہ بنا دیا ہے، لیکن اگر میں ٹھیک سمجھتی ہوں تو اس کی عقیدت میں عشق کا ذرا بھی شائبہ نہیں۔ اگرچہ تمہیں صلاح دینا بے سود ہے کیونکہ تم اس راستہ کی مشکلات سے خوب واقف ہو، پھر بھی میں تم سے باصرار کہتی ہوں کہ تم کچھ دن کے لیے کہیں چلے جاؤ۔ تب تک شاید صوفی بھی اپنے لیے کوئی نہ کوئی راستہ ڈھونڈ نکالے گی۔ ممکن ہے اس وقت کی ہوشیاری سے دو جانوں کا ستیاناس ہونے سے بچ جائے۔

ونے: بہن! جب تم سب کچھ جانتی ہی ہو تو تم سے کیا چھپاؤں۔ اب میں ہوشیار نہیں بن سکتا۔ ان چار پانچ مہینوں میں میں نے جو روحانی تکلیف برداشت کی ہے، اسے میرا دل ہی جانتا ہے۔ میری عقل بگڑ گئی ہے۔ میں آنکھیں کھلی ہونے پر بھی

گڈھے میں گر رہا ہوں۔ جان بوجھ کر زہر کا پیالہ پی رہا ہوں۔ کوئی رکاوٹ، کوئی دقت، کوئی خوف، اب مجھ کو تباہی سے نہیں بچا سکتا۔ البتہ میں تمہیں اس کا یقین دلاتا ہوں کہ اس آگ کی ایک چنگاری یا ایک لپٹ بھی صوفی تک نہ پہنچے گی۔ میرا سارا بدن جل جائے۔ ہڈیاں تک خاک ہو جائیں، لیکن صوفی کو اس شعلہ کی چمک تک نہ دکھائی دے گی۔ میں نے بھی تہیہ کر لیا ہے کہ جتنی جلد ہو سکے میں یہاں سے چلا جاؤں۔ اپنی حفاظت کے لیے نہیں بلکہ صوفی کی حفاظت کے لیے۔ آہ اس سے تو یہ کہیں بہتر تھا کہ صوفی نے مجھے اسی آگ میں جل جانے دیا ہوتا۔ میرا پردہ ڈھکا رہ جاتا۔ اگر والدہ کو یہ بات معلوم ہوگئی تو ان کی کیا حالت ہوگی۔ اس کے تصور ہی سے میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بس اب میرے لیے منہ پر سیاہی لگا کر کہیں ڈوب مرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔

یہ کہہ کر ونے سنگھ ایک دم باہر چلے گئے۔ اندو "بیٹھو بیٹھو" کہتی ہی رہ گئی۔ وہ اس وقت جوش میں اس سے بہت زیادہ کہہ گئے تھے۔ اتنا وہ کہنا چاہتے تھے اور دیر تک بیٹھتے تو نہ جانے اور کیا کیا کہہ جاتے۔ اندو کی حالت اس جاندار کی سی تھی جس کے پیر بندھے ہوں اور سامنے اس کا گھر جل رہا ہو۔ وہ دیکھ رہی تھی یہ آگ سارے گھر کو جلا دے گی۔ ونے کے اونچے اونچے منصوبے، ماں کی بڑی بڑی خواہشیں، باپ کے بڑے بڑے حوصلے سب ملیامیٹ ہو جائیں گے۔ وہ اسی قسم کے رنجیدہ خیالات میں پڑی ہوئی ساری رات کروٹیں بدلتی رہی۔ صبح اٹھی تو دروازہ پر اس کے لیے پالکی کھڑی تھی۔ وہ ماں کے گلے سے لپٹ کر روئی۔ باپ کے قدموں کو آنسوؤں سے دھویا اور گھر سے رخصت ہوئی۔ راستہ میں صوفیہ کا کمرہ پڑتا تھا۔ اندو نے اس کمرہ کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ صوفیہ اٹھ کر دروازہ پر آئی اور آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے اس نے ہاتھ ملایا۔ اندو نے بعجلت ہاتھ چھڑا لیا اور آگے بڑھ گئی۔

صوفیہ اس وقت اس حالت میں تھی جب ایک معمولی ہنسی کی بات، ایک معمولی آنکھوں کا اشارہ، کسی کا اس کو دیکھ کر مسکرا دینا، کسی مہری کا اس کے حکم کی تعمیل میں ایک لمحہ توقف کرنا، ایسی ہزاروں باتیں جو روز ہی گھروں میں ہوتی رہتی ہیں اور جن کی کوئی پروا بھی نہیں کرتا، اس کا دل دکھانے کے لیے کافی ہو سکتی تھیں۔ چوٹ کھایا ہوا عضو معمولی سی ٹھیس بھی نہیں سہہ سکتا۔ پھر اندو کا اسے کچھ کہے بغیر ہی چلا جانا کیوں نہ رنجیدہ ہوتا۔ اندو تو چلی گئی مگر وہ بہت دیر تک اپنے کمرے کے دروازہ پر بت بنی کھڑی سوچتی رہی۔ یہ تحقیر کیوں؟ میں نے ایسا کون سا قصور کیا ہے جس کی مجھے یہ سزا ملی ہے؟ اگر اس کو یہ منظور نہ تھا کہ مجھے ساتھ لے جاتی تو صاف صاف کہہ دینے میں کیا ہرج تھا۔ میں نے اس کے ساتھ جانے کے لیے اصرار تو کیا نہ تھا! کیا میں اتنا بھی نہیں جانتی کہ مصیبت میں کوئی کسی کا ساتھی نہیں ہوتا۔ وہ رانی ہے، اس کی اتنی نوازش کیا کم تھی کہ وہ میرے ساتھ ہنس بول لیا کرتی تھی؟ میں اس کی سہیلی بننے لائق کب تھی؟ کیا مجھے اتنی سمجھ بھی نہ تھی؟ لیکن اس طرح آنکھیں پھیر لینا کون سی شرافت ہے؟ راجہ صاحب نے نہ مانا ہو گا۔ یہ صرف ایک بہانہ ہے۔ راجہ صاحب اتنی سی بات کو کبھی نامنظور نہ کر سکتے۔ اندو نے خود ہی کچھ سوچا ہو گا۔ وہاں بڑے بڑے آدمی آویں گے۔ ان سے اس کا تعارف کیونکر کراؤں گی؟ شاید یہ خیال ہوا ہو کہ کہیں اس کے سامنے میرا رنگ پھیکا نہ پڑ جائے۔ بس یہی بات ہے اگر میں جاہل اور صورت سیرت سے بے بہرہ ہوتی تو وہ مجھے ضرور ساتھ لے جاتی۔ میری بدرنگی سے اس کا رنگ اور چمک اٹھتا میری بدنصیبی!

یہ ابھی دروازہ پر کھڑی ہی تھی کہ جانہوی بیٹی کو رخصت کر کے لوٹیں اور صوفی کے کمرہ میں آ کر بولیں۔ "بیٹی! میرا قصور معاف کرو۔ میں نے ہی تم کو روک لیا۔ اندو کو برا معلوم ہوا پر کروں کیا؟ وہ تو گئی ہی تم بھی چلی جاتیں تو میرا دن کیسا کٹتا؟ ونے بھی راجپوتانہ جانے کو تیار بیٹھے ہیں۔ میری تو موت ہو جاتی۔ تمہارے رہنے سے میرا دل بہلتا رہے گا۔

سچ کہتی ہوں بیٹی! تم نے میرے اوپر کوئی موہنی منتر پھونک دیا ہے۔''

صوفیہ: آپ کی شرافت ہے جو ایسا کہتی ہیں۔ مجھے رنج یہی ہے کہ اندو نے جاتے وقت مجھ سے ہاتھ بھی نہ ملایا۔

جانہوی: ایسا اس نے کیا تو محض ندامت کی وجہ سے۔ میں تم سے سچ کہتی ہوں ایسی سیدھی سادی لڑکی دنیا میں نہ ہوگی۔ تجھے روک کر میں نے اس کے ساتھ سخت نا اتفاقی کی ہے۔ میری بچی کا وہاں ذرا بھی جی نہیں لگتا۔ مہینہ بھر رہ جاتی ہے تو صحت بگڑ جاتی ہے۔ اتنی بڑی ریاست ہے۔ مہیندر سارا بوجھ اسی کے سر ڈال دیتے ہیں۔ انہیں تو میونسپلٹی ہی سے فرصت نہیں ملتی۔ بیچاری آمدنی اور خرچ کا حساب لکھتے لکھتے گھبرا جاتی ہے۔ پھر حساب کیسا، ایک ایک پیسہ کا۔ مہیندر کو حساب رکھنے کا خبط ہے۔ ذرا سا بھی فرق پڑا تو اس کے سر ہو جاتے ہیں۔ اندو کو اختیار ہے جتنا چاہے خرچ کرے، حساب ضرور رکھے۔ راجہ صاحب کسی کی رو رعایت نہیں کرتے۔ کوئی نوکر ایک پیسہ بھی کھا جائے تو اس کو برطرف کر دیتے ہیں۔ خواہ اس نے ساری عمر ان کی خدمت کی ہو۔ یہاں میں اندو کو کبھی کڑی نگاہ سے بھی نہیں دیکھتی، چاہے وہ گھی کا گھڑا کیوں نہ لڑھکا دے۔ وہاں ذرا ذرا سی بات پر راجہ صاحب کی جھڑکیاں سننی پڑتی ہیں۔ بچی سے بات نہیں برداشت ہو سکتی۔ جواب تو دیتی نہیں (اور یہی ہندو عورت کا دھرم ہے) پر رونے لگتی ہے۔ وہ دیا کی مورت ہے۔ کوئی اس کا سب کچھ کھا جائے لیکن وہ جوں ہی اس کے سامنے آ کر رویا، اس کا دل پگھل گیا۔ صوفی! مجھے بھگوان نے دو بچے دیئے اور دونوں ہی کو دیکھ کر کلیجہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ اندو جتنی نرم دل اور سادہ مزاج ہے۔ ونے اتنا ہی مستقل مزاج اور ہمتی ہے۔ تھکنا تو جانتا ہی نہیں معلوم ہوتا ہے دوسروں کی خدمت کرنے کے لیے ہی اس کا جنم ہوا ہے۔ گھر میں کسی ٹہنی کو بھی کوئی شکایت ہوئی وہ سب کام چھوڑ کر اس کی دوا دارو کرنے لگا۔ ایک بار مجھ کو بخار آنے لگا تھا۔ اس لڑکے نے تین ماہ تک دروازہ کا منہ نہیں دیکھا۔ ہر

وقت میرے ہی پاس بیٹھا رہتا۔ کبھی پنکھا جھلتا، کبھی پاؤں سہلاتا، کبھی رامائن اور مہا بھارت پڑھ کر سناتا۔ کتنا ہی کہتی بیٹا! جاؤ گھومو، پھرو۔ آخر یہ لونڈیاں باندیاں کس دن کام آئیں گی۔ ڈاکٹر روز آتے ہیں تم کیوں میرے ساتھ ستی ہوتے ہو، لیکن وہ کسی طرح بھی نہ جاتا۔ اب کچھ دنوں سے سیوا سمتی کا انتظام کر رہا ہے۔ کنور صاحب کو جو سیوا سمتی سے اتنی دلچسپی ہے، وہ وِنے ہی کی صحبت کی برکت ہے۔ ورنہ آج سے تین سال بیشتر ان کا سا عیش پسند سارے شہر میں نہ تھا۔ دن میں دو بار حجامت بنتی تھی۔ درجنوں دھوبی اور درزی کپڑے دھونے اور سینے کے لیے نوکر تھے۔ پیرس سے ایک ہوشیار دھوبی کپڑے سنوارنے کے لیے آیا تھا۔ کشمیر اور اٹلی کے باورچی کھانا پکاتے تھے۔ تصویروں کا اتنا شوق تھا کہ کئی بار عمدہ تصاویر خریدنے کے لیے اٹلی تک کا سفر کیا۔ سیر کرنے نکلتے تو مسلح سواروں کی ایک جماعت ساتھ چلتی۔ شکار کھیلنے کی مت تھی۔ مہینوں شکار ہی کھیلتے رہتے۔ کبھی کشمیر، کبھی بیکانیر، کبھی نیپال صرف شکار کھیلنے کی غرض سے جاتے۔ وِنے نے ان کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ جنم کا بیراگی ہے۔ پہلے جنم میں ضرور کوئی رشی رہا ہوگا۔

صوفی: آپ کے دل میں خدمت اور اعتقاد کے ایسے بلند جذبات کس طرح پیدا ہوئے؟ یہاں تو عموماً رانیاں عیش پرستی ہی میں محو رہتی ہیں۔

جانہوی: بیٹی! یہ ڈاکٹر گنگولی کی نصیحتوں کے سبب ہوا۔ جب اندو دو سال کی تھی تب میں بیمار پڑی۔ ڈاکٹر گنگولی میرے معالجہ کی غرض سے آئے۔ ضعف قلب کی شکایت تھی۔ طبیعت گھبرایا کرتی۔ گویا کسی نے جادو کر دیا ہو۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے مہا بھارت پڑھ کر سنانا شروع کیا۔ اس میں میرا جی اس قدر لگا کہ کبھی کبھی آدھی رات تک بیٹھی پڑھا کرتی۔ تھک جاتی تو ڈاکٹر صاحب سے پڑھوا کر سنتی۔ پھر تو بہادری کی داستانوں کے پڑھنے کا مجھے ایسا چسکا لگا کہ راجپوتوں کی ایسی کوئی داستان نہیں جو میں نے نہ پڑھی ہو۔ اسی وقت سے میرے دل میں قومی محبت کا جذبہ پیدا ہوا۔

ایک نئی خواہش پیدا ہوئی۔ کاش میرے بطن سے بھی کوئی ایسا لڑکا جنم لیتا جو بھمن، درگاداس، اور پرتاب کی طرح قوم کا سر اونچا کرتا۔ میں نے عہد کیا کہ لڑکا ہوا تو اس کو ملک وقوم کی فلاح کے لیے وقف کر دوں گی۔ میں ان دنوں تپسیا کرتی ہوئی زمین پر سوتی۔ صرف ایک بار روکھا کھانا کھاتی۔ اپنے برتن تک اپنے ہاتھ سے دھوتی تھی۔ ایک وہ دیویاں تھیں جو قوم کی لاج رکھنے کے لیے جان تک دے دیتی تھیں۔ ایک میں بدنصیب ہوں کہ دنیا و عافیت کے سارے تفکرات سے کنارہ کرتے ہوئے صرف عیش وعشرت میں مبتلا ہوں۔ مجھے اس قومی زوال کو دیکھ کر اپنی عیش پسندی پر شرم آتی تھی۔ خیر ایشور نے میری سن لی۔ تیسرے سال ونے کا جنم ہوا۔ میں نے بچپن سے ہی اس کو سختیاں اٹھانے کا عادی بنانا شروع کیا۔ نہ کبھی گدوں پر سلاتی، نہ کبھی لہریوں اور دائیوں کی گود میں جانے دیتی، نہ کبھی میوے کھانے کو دیتی۔ دس برس کی عمر تک صرف مذہبی داستانوں کے ذریعہ اس کو تعلیم دی گئی۔ اس کے بعد میں نے اس کو ڈاکٹر گنگولی کے سپرد کر دیا۔ مجھے ان پر پورا اعتماد تھا اور مجھ کو فخر ہے کہ ونے نے تعلیم وتربیت کا بار جس شخص پر رکھا، وہ اس کام کے لیے ہر طرح سے اہل تھا۔ ونے روئے زمین کے بیشتر ملکوں کا سفر کر چکا ہے۔ سنسکرت اور ہندوستانی زبانوں کے علاوہ یورپ کی خاص زبانوں سے بھی وہ بخوبی واقف ہے۔ گانے میں اس کو اس قدر مشق ہے کہ اچھے اچھے استاد اس کے سامنے منہ کھولنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ ہمیشہ کمبل بچھا کر زمین پر سوتا ہے اور کمبل ہی اوڑھتا ہے۔ پیدل چلنے میں کئی بار انعام پا چکا ہے۔ ناشتے کے لیے مٹھی بھر چنے، کھانے کے لیے روٹی اور ساگ بس ان کے سوا دنیا کے اور سارے کھانے اس کے لیے ممنوع ہیں۔ بیٹی! میں تجھ سے کہاں تک کہوں، پورا تیاگی ہے۔ اس کے تیاگ کا سب سے عمدہ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے باپ کو بھی تیاگی بننا پڑا۔ جواب بیٹے کے سامنے بوڑھا باپ نفس پرستی کا غلام بنا رہ سکتا ہے؟ میں سمجھتی ہوں کہ عیش وعشرت سے ان کا دل آسودہ ہو گیا اور یہ بہت

اچھا ہوا۔ تیاگی لڑکے کا بھوگی باپ یہ واقعی مضحکہ خیز بات ہوتی۔ وہ کھلے دل سے ونے کے نیک کاموں میں حصہ لیتے ہیں اور میں کہہ سکتی ہوں کہ ان کی اس رغبت و مصروفیت کے بغیر ونے کو کبھی اس قدر کامیابی نہ حاصل ہوتی۔ سیوا سمتی میں اس وقت ایک سو نوجوان ہیں جن میں امیر گھرانوں کے ہیں۔ کنور صاحب کی تمنا ہے کہ سمتی کے ممبران کی پوری تعداد پانچ سو تک بڑھا دی جاوے۔ ڈاکٹر گنگولی اس پیرانہ سالی کے باوجود بھی بڑے حوصلہ اور خوشی کے ساتھ سمتی کا کام کرتے ہیں۔ وہی اس کے منتظم ہیں۔ جب کونسل کے کاموں سے فراغت ملتی ہے تو ہر روز دو ڈھائی گھنٹے نوجوانوں کے سامنے جسمانی علم پر لکچر دیتے ہیں۔ یہاں کی تعلیم پورے تین سالوں میں ختم ہوتی ہے۔ تب خدمتی کام شروع کیا جاتا ہے۔ اب کے بیس نوجوان پاس ہوں گے اور یہ تجویز کیا گیا ہے کہ وہ دو سال تک ہندوستان کا سفر کریں۔ مگر شرط یہ ہے کہ ان کے ساتھ لوٹا، ڈور، دھوتی اور کمبل کے سوا اور کسی قسم کا رخت سفر نہ ہو۔ یہاں تک کہ خرچ کے لیے روپے بھی نہ رکھے جائیں۔ اس سے کئی فائدے ہوں گے۔ نوجوانوں کو مشکلات کا سامنا کرنے کی عادت پڑے گی۔ انہیں ملک کی واقعی حالت کا علم ہوگا۔ نظری زاویہ وسیع ہو جائے گا اور سب سے بڑی بات یہ کہ چال چلن درست اور مضبوط ہوگا۔ استقلال، جرأت، تدبیر اور ارادہ وغیرہ اوصاف کی افزونی ہوگی۔ ونے ان لڑکوں کے ساتھ جا رہا ہے اور میں غرور سے پھولی نہیں سماتی کہ میرا لڑکا قومی فلاح و بہبود کے لیے یہ کام کر رہا ہے اور تم سے سچ کہتی ہوں کہ اگر کوئی ایسا موقع آ پڑے کہ قوم کی بھلائی کے لیے اس کو جان دینا پڑی تو مجھے ذرا بھی رنج نہ ہوگا، رنج تب ہوگا جب میں اس کو دولت و ثروت کے سامنے سر جھکاتے یا حد فرض کے پیچھے قدم رکھتے دیکھوں گی۔ ایشور نہ کرے میں وہ دن دیکھنے کے لیے زندہ رہوں۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ کہ اس وقت میرے دل کی کیا حالت ہوگی؟ شاید میں ونے کے خون کی پیاسی ہو جاؤں، شاید میرے ان کمزور ہاتھوں میں اتنی سکت آ

جائے کہ میں اس کا گلا گھونٹ دوں!

یہ کہتے کہتے رانی کے چہرہ پر ایک عجیب رونق نظر آنے لگی۔ اشک آلود آنکھوں میں خودداری کی سرخی جھلکنے لگی۔ صوفیہ حیرت سے رانی کا منہ تاکنے لگی۔ اس نازک جسم میں اس قدر محبت آ گئیں اور بلند حوصلہ دل میں چھپا ہوا ہے، اس کا اسے خیال بھی نہ تھا۔

ذرا دیر بعد رانی نے پھر کہا۔ ''بیٹی! میں جوش میں تم سے اپنے دل کی کتنی ہی باتیں کہہ گئی، پر کیا کروں۔ تمہارے چہرہ پر ایسی دلکش سادگی ہے جو میرے دل کو اپنی طرف بے اختیار کھینچتی ہے۔ اتنے دنوں میں میں نے تم کو خوب پہچان لیا۔ تم اندو نہیں، تم عورت کی شکل و نے ہو۔ کنور صاحب تم پر فریفتہ ہو گئے ہیں۔ گھر آتے ہیں تو تمہاری چرچا ضرور کرتے ہیں۔ اگر مذہبی رکاوٹ نہ ہوتی تو (مسکرا کر) انہوں نے مسٹر سیوک کے پاس ونے کی شادی کا پیغام کبھی کا بھیج دیا ہوتا۔''

صوفیہ کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ بڑی بڑی پلکیں نیچے کو جھک گئیں اور لبوں پر ایک نہایت خفیف سکون بخش اور دلکش تبسم کی جھلک دکھائی دی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا اور بولی۔ ''آپ مجھے گالیاں دے رہی ہیں۔ میں بھاگ جاؤں گی۔''

رانی: اچھا شرماؤ مت۔ میں یہ ذکر ہی نہ کروں گی۔ میرا تم سے یہی کہنا ہے کہ اب تمہیں یہاں کسی بات میں پس و پیش نہ کرنا چاہیے۔ اندو تمہاری سہیلی تھی۔ تمہارے مزاج سے واقف تھی۔ تمہاری ضروریات کو سمجھتی تھی۔ مجھ میں اتنی تمیز نہیں ہے۔ تم اس گھر کو اپنا گھر سمجھو۔ جس چیز کی ضرورت ہو بلا تامل کہہ دو۔ اپنی مرضی کے موافق کھانا بنوا لو۔ جب سیر کرنے کو جی چاہے گاڑی تیار کرا لو۔ کسی نوکر کو کہیں بھیجنا چاہو بھیج دو۔ مجھے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ مجھ سے کچھ کہنا ہو تو فوراً چلی آؤ۔ پیشتر سے اطلاع دینے کی ضرورت نہیں۔ یہ کمرہ اگر پسند نہ ہو تو میرے بغل والے کمرے میں چلو جس میں اندو رہتی تھی۔ وہاں جب میرا جی چاہے گا تم سے باتیں کر لیا کروں گی۔ جب فرصت ملے مجھے ادھر ادھر کی خبریں سنا دینا۔ بس یہ سمجھو کہ تم میری پرائیویٹ سیکرٹری ہو۔

یہ کہہ کر جانہوی چلی گئی۔صوفی کا دل ہلکا ہو گیا۔اس کو بڑی فکر تھی کہ اندو کے چلے جانے پر یہاں میں کیسے رہوں گی۔کون میری بات پوچھے گا، ناخواندہ مہمان کی طرح پڑی رہوں گی۔یہ اندیشہ جاتا رہا۔

اس دن سے اس کی اور خاطر مدارت ہونے لگی۔لونڈیاں اس کا منہ دیکھتی رہتیں۔بار بار آ کر پوچھ جاتیں۔"مس صاحبہ! کوئی کام تو نہیں ہے۔" کوچوان دونوں وقت دریافت کرتا۔"حکم ہو تو گاڑی تیار کروں۔" رانی جی بھی دن میں ایک بار ضرور آ کر بیٹھ جاتیں۔صوفی کو اب معلوم ہوا کہ ان کا دل استری جاتی کے ساتھ بھلائی کرنے والے جذبات سے کس قدر معمور تھا۔انہیں ہندوستان کی دیویوں کو اینٹ اور پتھر کے سامنے سر جھکاتے دیکھ کر دلی رنج ہوتا تھا۔وہ ان کی مادہ پرستی، وہم پرستی اور خود پرستی کو ملکی زوال کا خاص سبب سمجھتی تھیں۔ان امور پر صوفی سے گھنٹوں گفتگو کیا کرتیں۔ اس مہربانی و محبت نے آہستہ آہستہ صوفی کے دل سے مغائرت کے خیالات کو مٹانا شروع کیا۔اس کے خیالات و اطوار میں تغیر ہونے لگا۔لونڈیوں سے کچھ کہتے ہوئے اب ہچک نہ ہوتی۔مکان کے کسی حصہ میں جاتے ہوئے اب تامل نہ ہوتا، لیکن تفکرات میں جوں جوں کمی ہوتی تھی عیش پسندی میں اضافہ ہو رہا تھا۔اس کی فراغت کے اوقات میں ترقی ہونے لگی۔تفریح سے رغبت پیدا ہوئی۔کبھی مصوران قدیم کی تصاویر دیکھتی۔کبھی باغ کی سیر کرنے چلی جاتی۔کبھی پیانو پر جا بیٹھی۔یہاں تک کہ کبھی کبھی رانی کے ساتھ شطرنج بھی کھیلنے لگی۔زیورات اور کپڑوں کی طرف سے اب بے پروائی نہ رہی۔گاؤن کے بدلے ریشمی ساڑھیاں پہننے لگی۔رانی جی کے اصرار سے کبھی کبھی پان بھی کھا لیتی۔کنگھی چوٹی سے انس ہوا۔فکر بے تعلقی پیدا کرتی ہے۔بےفکری کا کھیل تماشے سے میل ہے۔

ایک روز تیسرے پہر وہ اپنے کمرہ میں بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھی۔گرمی اتنی سخت تھی کہ برقی پنکھوں اور خس کی ٹٹیوں کے ہوتے ہوئے بھی بدن سے پسینہ نکل رہا تھا۔

باہر لو سے جسم جھلسا جاتا تھا۔ دفعتاً پربھو سیوک آ کر بولے۔ ’’صوفی! ذرا چل کر ایک جھگڑے کا تصفیہ کر دو۔ میں نے ایک نظم لکھی ہے۔ ونے سنگھ کو اس کے متعلق کئی شکوک ہیں۔ میں کچھ کہتا ہوں۔ وہ کچھ کہتے ہیں۔ فیصلہ تمہارے اوپر چھوڑا گیا ہے ذرا چلو۔‘‘

صوفی: میں شاعری نزع کا کیا فیصلہ کروں گی۔ عروض سے ذرا بھی واقفیت نہیں اور نہ استعارات کا کوئی علم ہے۔ مجھے بے فائدے لے جاتے ہو۔

پربھو سیوک: اس نزع کا فیصلہ کرنے کے لیے عروض جاننے کی ضرورت نہیں۔ میرے اور ان کے معیار میں اختلاف ہے۔ چلو تو۔

صوفی صحن میں آئی تو بدن میں لپٹ سی لگی۔ تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے ونے کے کمرہ میں گئی جو محل کے دوسرے حصہ میں تھا۔ آج تک وہ یہاں کبھی نہ آئی تھی۔ کمرہ میں کوئی سامان نہ تھا۔ صرف ایک کمبل بچھا ہوا تھا اور زمین ہی پر دس پانچ کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ نہ پنکھا، نہ خس کی ٹٹی، نہ پردے، نہ تصویریں، پچھوا ہوا سیدھی کمرہ میں آتی تھی۔ کمرہ کی دیواریں جلتے توے کی طرح تپ رہی تھیں۔ وہیں ونے سر جھکائے کمبل پر بیٹھے ہوئے تھے۔ صوفی کو دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور کرسی لانے دوڑے۔

صوفی: کہاں جا رہے ہیں؟

پربھو سیوک: (مسکرا کر) تمہارے لیے کرسی لانے۔

صوفی: وہ کرسی لائیں گے اور میں بیٹھوں گی۔ کتنی بھدی بات ہے۔

پربھو سیوک: میں روکتا بھی تو وہ نہ مانتے۔

صوفی: اس کمرہ میں ان سے کیسے رہا جاتا ہے؟

پربھو سیوک: پورے جوگی ہیں۔ میں تو دلی محبت کے سبب آ جایا کرتا ہوں۔

اتنے میں ونے نے گدے دار کرسی لا کر صوفی کے لیے رکھ دی۔ صوفی شرم اور

تامل سے گڑی جاتی تھی۔ ونے کی ایسی حالت تھی گویا پانی میں بھیگ رہے ہیں۔ صوفی دل میں کہتی تھی۔ ''کیسی اعلیٰ زندگی ہے۔'' ونے دل میں کہتے تھے۔ ''کیسا بے مثال حسن ہے۔'' دونوں اپنی اپنی جگہ کھڑے رہے۔ آخر ونے کو ایک بات سوجھی۔ پربھوسیوک کی طرف دیکھ کر بولے۔ ''ہم اور تم فریق مقدمہ ہیں۔ پس کھڑے رہ سکتے ہیں، لیکن حاکم کو اونچے مقام پر بیٹھنا ہی مناسب ہے۔''

صوفی نے پربھوسیوک کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''کھیل میں لڑکا اپنے کو بھول نہیں جاتا۔''

بالآخر ہر سہ اشخاص کمبل ہی پر بیٹھے۔ پربھوسیوک نے اپنی نظم پڑھ کر سنائی۔ نظم حلاوت میں ڈوبی ہوئی، پاکیزہ اور بلند جذبات سے مملو تھی۔ شاعر نے نظم میں شعریت کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی۔ عنوان تھا۔ ''ایک ماں کا اپنی بیٹی کو دعا دینا۔'' بیٹی سسرال جا رہی ہے۔ ماں اس کو گلے لگا کر دعا دیتی ہے۔ بیٹی تو شوہر پرست ہو۔ تیری گود پھلے۔ اس میں پھول جیسے نازک بچے کھیلیں۔ ان کے شیریں قہقہوں سے تیرا گھر اور صحن گونجے۔ تجھ پر لچھمی کا کرم ہو، تو پتھر بھی چھوئے تو سونا ہو جائے۔ تیرا شوہر تجھ پر اسی طرح محبت کا سایہ رکھے جس طرح چھپر دیوار کو اپنے سایہ میں رکھتا ہے۔''

شاعر نے انہیں خیالات میں شادی شدہ زندگی کی ایسی دل کش تصویر کھینچی تھی کہ اس میں پھولوں کی روشنی اور محبت کی کثرت تھی۔ کہیں بھی وہ تاریک گھاٹیاں نہ تھیں، جن میں ہم گر پڑتے ہیں۔ کہیں بھی وہ کانٹے نہ تھے جو ہمارے پیروں میں چبھتے ہیں۔ کہیں بھی وہ نقص نہ تھا جو ہم کو راستہ سے ہٹا دیتا ہے۔ نظم ختم کر کے پربھوسیوک نے ونے سنگھ سے کہا ''اب آپ کو اس کے بارے میں جو کچھ کہنا ہو کہیے۔''

ونے سنگھ نے تامل کے ساتھ جواب دیا۔ ''مجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا۔''

پربھوسیوک: پھر سے کہیے۔

ونے سنگھ: بار بار وہی باتیں کیا کہوں۔

پربھوسیوک: میں آپ کے کہنے کا خلاصہ بیان کردوں۔

ونے سنگھ: میرے دل میں ایک بات آئی کہہ دی۔ آپ بے فائدہ اسے اتنا طول دے رہے ہیں۔

پربھوسیوک: آخر آپ ان جذبات کو صوفی کے سامنے ظاہر کرتے ہوئے کیوں شرماتے ہیں؟

ونے سنگھ: شرماتا نہیں ہوں لیکن میرا آپ کے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ آپ کو انسانی زندگی کا یہ معیار بہترین معلوم ہوتا ہے۔ مجھے وہ اپنی موجودہ حالت کے خلاف جچتا ہے۔ اس میں جھگڑے کی کوئی بات نہیں ہے۔

پربھوسیوک: (ہنس کر) ہاں یہی تو میں آپ سے کہلانا چاہتا ہوں کہ آپ اس کو موجودہ حالت کے خلاف کیوں سمجھتے ہیں؟ کیا آپ کے خیال میں شادی شدہ زندگی بالکل حقیر ہے اور کیا دنیا کے کل آدمیوں کو سنیاس لے لینا چاہیے؟

ونے سنگھ: میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دنیا کے کل آدمیوں کو سنیاس لے لینا چاہیے۔ میرا مطلب صرف یہ تھا کہ ایسی زندگی خودغرضی کے بڑھانے والی ہے۔ اس کے ثبوت کی ضرورت نہیں اور اس کے انحطاط کی حالت میں جب کہ خودغرضی ہماری رگوں میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے، جب کہ ہم اپنی غرض کے بغیر کوئی بات یا کوئی کام نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ ماں بیٹے کے تعلق میں، استاد شاگرد کے تعلق میں، زن شوہر کے تعلق میں خودغرضی کا خاص جزو ہے۔ تو ایسا ہوتے ہوئے کسی بلند پایہ شاعر کے لیے اس کی زندگی کی سراہنا کرنا، اس کی تعریفوں کے پل باندھنا، زیب نہیں دیتا۔ ہم اس کی زندگی سے پیدا ہونے والے سکھوں کے غلام ہو رہے ہیں۔ ہم نے اسی کو اپنی زندگی کا معیار سمجھ رکھا ہے! اس وقت ہم کو ایسے وفا شعار، ایثار نفس اور بے غرض کام کرنے والوں کی ضرورت ہے جو قومی اصلاح کے لیے اپنی

جان تک قربان کر دیں۔ ہمارے شعرا کو ایسے ہی پاک اور بلند جذبات کو متحرک کرنا چاہیے۔ ہمارے ملک کی آبادی ضرورت سے زیادہ ہو گئی ہے۔ ہماری بھارت ماتا افزونی نسل کے بار کو اب نہیں سنبھال سکتی۔ اسکولوں میں، سڑکوں پر، گلیوں میں اب اتنے لڑکے نظر آتے ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کریں گے۔ ہمارے ملک میں اتنی پیداوار بھی نہیں ہوتی کہ سب کو ایک بار بھی حسب مرضی خوراک مل سکے۔ خوراک کا ملنا ہی ہمارے اخلاقی اور اقتصادی انحطاط کا خاص سبب ہے۔ آپ کی نظم بالکل بے موقع ہے۔ میرے خیال میں اس سے سوسائٹی کا بھلا نہیں ہو سکتا۔ اس وقت ہمارے شعرا کا فرض ہے ایثار کی اہمیت دکھلانا، تجرد کی لگن پیدا کرنا، دل پر قابو رکھنے کی تلقین کرنا، شادی شدہ زندگی تو غلامی کی جڑ ہے اور یہ وقت اس کی ثنا خوانی کے لیے موزوں نہیں ہے۔

پربھوسیوک: آپ کو جو کچھ کہنا تھا کہہ چکے؟

ونے سنگھ: ابھی بہت کچھ کہا جا سکتا ہے، لیکن اس وقت اتنا ہی کافی ہے۔

پربھوسیوک: میں آپ سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ ایثار اور قربانی کے معیار کی میں برائی نہیں کرتا۔ وہ انسانوں کے لیے سب سے اونچا درجہ ہے اور وہ شخص بلاشبہ قابل تحسین ہے جو اس کو حاصل کر لے لیکن جس طرح کچھ برت کرنے والوں کے بلا کھائے پیے رہنے سے کھانے اور پانی کی فائدہ رسانی میں کوئی نقص نہیں آتا۔ اسی طرح دو چار جوگیوں کے تارک الدنیا ہو جانے سے شادی شدہ زندگی قابل ترک نہیں ہو جاتی۔ یہ زندگی انسان کی جماعتی زندگی کی جڑ ہے۔ اس کو ترک کر دیجیے بس ہمارے جماعتی اتحاد کا شیرازہ منتشر ہو جائے گا اور ہماری حالت جانوروں کی سی ہو جائے گی۔ رشیوں نے گرہستی کو بہترین دھرم کہا ہے اور اگر ٹھنڈے دل سے غور کیجیے تو ظاہر ہو جائے گا کہ رشیوں کا یہ کہنا ذرا بھی مبالغہ آمیز نہیں ہے۔ رحم، ہمدردی، تحمل، فیاضی، ایثار وغیرہ اعلیٰ اوصاف کی ترقیوں کے جیسے موقعے آشرم میں ملتے ہیں۔ وہ

اور کسی آشرم میں نہیں مل سکتے۔ مجھے تو یہاں تک کہنے میں تامل نہں ہے کہ انسان کے لیے یہی ایک ایسا دھرم ہے جو فطرتی کہا جا سکتا ہے۔ جن کارناموں نے انسانی قومیت کے چہرہ کو جلا بخشی ہے، ان کا سہرا جوگیوں کے نہیں بلکہ گرہست زندگی کا سکھ بھوگنے والوں کے سر ہے۔ ہری چندر جوگی نہیں تھا۔ رام چندر جوگی نہیں تھے۔ کرشن تارک الدنیا نہیں تھے۔ نپولین تارک الدنیا نہیں تھا۔ نیوٹن جوگی نہیں تھا۔ مذہب اور علم کے میدان عمل بھوگیوں نے ضرور شہرت حاصل کی ہے لیکن میدان عمل میں شہرت کا سہرا بھوگیوں کے سر بندھا ہے۔ تاریخ میں ایسا ایک بھی ثبوت نہں ملتا کہ کسی قوم کی نجات تیاگیوں کے ذریعہ ہوئی ہو۔ آج بھی ہندوستان میں دس لاکھ سے زیادہ تیاگی بستے ہیں، پر کون کہہ سکتا ہے کہ ان سے سوسائٹی کو کچھ فائدہ پہنچ رہا ہے۔ ممکن ہے پوشیدہ طریقہ پر ایسا ہوتا ہو، لیکن ظاہرا تو نہیں دکھائی دیتا۔ پھر یہ امید کیوں کر کی جا سکتی ہے کہ گرہستی سے بچنے میں قوم کا کوئی خاص فائدہ ہوگا۔ ہاں اگر کم فہمی کو آپ فائدہ سمجھتے ہو تو ضرور ہوگا۔

یہ گفتگو ختم کر کے پربھو سیوک نے صوفیہ سے کہا۔ ”تم نے فریقین کی باتیں سن لیں۔ تم اس عدل گستری کی جگہ پر ہو، سچ جھوٹ کا فیصلہ کرو۔“

صوفی: اس کا فیصلہ تو تم آپ ہی کر سکتے ہو۔ تمہاری سمجھ میں گانا تو بہت اچھی چیز لگتی ہے؟

پربھوسیوک: ضرور۔

صوفی: لیکن اگر کسی گھر میں آگ لگی ہوئی ہو تو وہاں رہنے والوں کو گاتے بجاتے دیکھ کر تم کیا کہو گے؟

پربھوسیوک: بیوقوف کہوں گا اور کیا۔

صوفی: کیوں؟ گانا تو کوئی بری چیز نہیں؟

پربھوسیوک: تو یہ صاف صاف کیوں نہیں کہتیں کہ تم نے انہیں ڈگری دے دی۔

میں پہلے ہی سمجھ رہا تھا کہ تم انہیں کی طرف جھکو گی۔

صوفی: اگر یہ اندیشہ تھا، پھر تم نے مجھے پنچ کیوں بنایا تھا۔ تمہاری نظم نہایت اعلیٰ پایہ کی ہے۔ میں اس کو سراپا دل کش کہنے کے لیے تیار ہوں لیکن تمہارا یہ فرض ہے کہ اپنی اس روحانی طاقت سے برادران وطن کو فائدہ پہنچاؤ۔ زوال کے حسن و عشق کا راگ الاپنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اسے تم بھی قبول کرو گے۔ معمولی شعرا کے لیے کوئی قید نہیں ہے۔ ان پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے، لیکن تم کو ایشور نے جتنی ہی خاص قدرت عطا کی ہے، تمہارے اوپر ذمہ داری بھی اتنی ہی زیادہ ہے۔

جب صوفیہ چلی گئی تو ونے نے پربھوسیوک سے کہا: ''میں اس فیصلہ کو پہلے ہی معلوم کر چکا تھا۔ تم نادم تو نہ ہوئے ہو گے؟''

پربھوسیوک: اس نے تمہاری مروت کی ہے۔

ونے: بھائی! تم بڑے بے انصاف ہو۔ اس قدر مدلل فیصلہ پر بھی ان کے سر الزام ہی عاید کر دیا۔ میں تو ان کی پختہ خیالی کا پیشتر ہی سے قائل تھا۔ آج سے معتقد ہو گیا۔ اس فیصلہ نے میری قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ پربھو! مجھے خواب مین بھی یہ امید نہ تھی کہ میں اتنی آسانی سے خواہشات کا غلام بن جاؤں گا۔ میں راستہ سے ہٹ گیا۔ میرا ضبط کسی بنے ہوئے دوست کی طرح امتحان کے اول ہی موقع پر میرا ساتھ چھوڑ گیا۔ میں خوب جانتا ہوں کہ میں آسمان کے تارے توڑنے جا رہا ہوں۔ وہ پھل کھانے جا رہا ہوں جو میرے لیے ممنوع ہے۔ خوب جانتا ہوں پربھو! کہ میں اپنی زندگی کو مایوسی کی بیدی پر قربان کر رہا ہوں۔ اپنی والدہ محترمہ کے دل پر کلہاڑے چلا رہا ہوں۔ اپنی عزت و آبرو کی کشتی کو ذلت اور رسوائی کے سمندر میں ڈبو رہا ہوں۔ اپنی عظمت کی خواہشات کا خاتمہ کر رہا ہوں لیکن میرا دل اس کے لیے مجھے ملامت نہیں کرتا۔ صوفیہ کسی طرح میری نہیں ہو سکتی لیکن میں اس کا ہو چکا اور تمام عمر اسی کا رہوں گا۔

پربھو: ونے! اگر صوفی کو یہ بات معلوم ہوگئی تو وہ یہاں ایک منٹ بھی نہ رہے گی۔
کہیں وہ خودکشی نہ کرلے۔ خدا کے لیے ایسا کام نہ کرو۔

ونے سنگھ: نہیں پربھو! میں بہت جلد یہاں سے جاؤں گا اور پھر کبھی نہ آؤں گا۔ میرا دل جل کر خاک سیاہ ہو جائے مگر صوفی کو آنچ بھی نہ لگنے پائے گی۔ میں کسی دور مقام میں بیٹھا ہوا اس علم، دانائی اور پاکیزگی کی دیوی کی پرستش کیا کروں گا۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرے عشق میں نفسانیت کا شائبہ بھی نہیں۔ میری زندگی کو بامعنی بنانے کے لیے یہ محبت ہی کافی ہے۔ یہ مت سمجھو کہ میں اپنی ملکی خدمت کے کام کو ترک کر رہا ہوں۔ نہیں ایسا نہ ہوگا۔ میں اب بھی اسی راستہ پر چلتا رہوں گا۔ فرق صرف اتنا ہوگا کہ غیر مجسم کی جگہ، مجسم کی نہ دکھائی دینے والے کی جگہ، دکھائی دینے والے کی پوجا اور بھگتی کروں گا۔

اسی وقت جانہوی نے دفعتاً آکر کہا۔ ''ونے! ذرا اندو کے پاس چلے جاؤ۔ کئی روز سے اس کا کچھ حال نہیں ملا۔ مجھے اندیشہ ہو رہا ہے کہ کہیں بیمار تو نہیں ہوگئی۔ خط بھیجنے میں اتنی دیر تو کبھی نہ کرتی تھی۔''

ونے تیار ہوگئے۔ کرتہ پہنا۔ ہاتھ میں سونٹا لیا اور چل دیئے........ پربھو سیوک صوفی کے پاس جا کر بیٹھ گئے اور سوچنے لگے۔ ونے سنگھ کی باتیں اس سے کہوں یا نہ کہوں۔ صوفی نے انہیں متفکر دیکھ کر پوچھا: ''کنور صاحب کچھ کہتے تھے؟''

پربھو سیوک: اس بارے میں تو کچھ نہیں کہتے تھے، مگر تمہارے بارے میں ایسے خیالات کا اظہار کیا جن کا مجھے وہم و گمان بھی نہ تھا۔

صوفی نے لمحہ بھر زمین تاکنے کے بعد کہا۔ ''میں سمجھتی ہوں۔ پہلے ہی سمجھ جانا چاہیے تھا، مگر میں اس سے پریشان نہیں ہوں۔ یہ جذبہ میرے دل میں اس وقت پیدا ہوا جب یہاں آنے کے چوتھے روز میں نے آنکھیں کھولیں اور نیم بیہوشی کی حالت میں ایک فرشتہ صورت انسان کو سامنے کھڑا ہوا اور اپنی طرف محبت آمیز

نگاہوں سے دیکھتا ہوا پایا۔ وہ صورت اور وہ نگاہ آج تک میرے دل پر منقوش ہے اور ہمیشہ منقوش رہے گی۔

پربھوسیوک: صوفی! تمہیں یہ کہتے شرم نہیں آتی؟

صوفی: نہیں۔ شرم نہیں آتی۔ شرم کی بات ہی نہیں ہے۔ وہ مجھے اپنے عشق کے قابل سمجھتے ہیں۔ یہ میرے لیے فخر کی بات ہے۔ ایسے درویش سیرت، ایسے ایثار مجسم، ایسے حوصلہ مند شخص کی معشوقہ بننے میں کوئی شرم نہیں ہے۔ اگر عشق کا تحفہ پا کر کسی نوجوان دوشیزہ کو فخر ہو سکتا ہے تو وہ دوشیزہ میں ہوں۔ یہی برکت تھی جس کے حصول کے لیے میں اتنے دنوں تک صبر و استقلال کی تپسیا کر رہی تھی۔ آج اسی برکت کا مجھ پر نزول ہوا ہے تو یہ میرے لیے شرم کی بات نہیں بلکہ خوشی کی بات ہے۔

پربھوسیوک: مذہبی تضاد ہوتے ہوئے بھی؟

صوفیہ: اس کا خیال وہ لوگ کرتے ہیں جن کا عشق خواہشات نفسانی پر مشتمل ہے۔ عشق اور خواہش میں اتنا ہی فرق ہے، جتنا کہ سونا اور کانچ (شیشہ) میں۔ عشق اعتقاد کے مشابہ ہے۔ دونوں میں صرف کمی بیشی کا فرق ہے۔ اعتقاد میں عزت اور عشق میں خدمت والے جذبات کی فراوانی ہوتی ہے۔ عشق کے لیے مذہبی تضاد کوئی رکاوٹ نہیں پیدا کرتا ہے، ایسی رکاوٹ اس ارادہ کے لیے جس کا نتیجہ شادی ہے نہ کہ اس عشق کے لیے جس کا نتیجہ قربانی ہے۔

پربھوسیوک: میں نے تمہیں جتا دیا۔ یہاں سے چلنے کے لیے تیار رہو۔

صوفیہ: مگر گھر پر کسی سے اس کا چرچا کرنے کی ضرورت نہیں۔

پربھوسیوک: اس سے بے فکر رہو۔

صوفیہ: کچھ طے ہوا۔ یہاں سے ان کے جانے کا کب قصد ہے؟

پربھوسیوک: تیاریاں ہو رہی ہیں۔ رانی جی کو یہ بات معلوم ہوئی تو ونے کی خیر نہیں۔ مجھے تعجب نہ ہوگا اگر ماما سے اس کی شکایت کریں۔

صوفیہ نے غرور سے سر اٹھا کر کہا۔ ''پربھو! کیسی بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ عشق بے خوفی کا منتر ہے۔ عشق کی پرستش کرنے والا دنیا کے سبھی تفکرات اور بندشوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔''

پربھو سیوک چلے گئے تو صوفیہ نے کتاب بند کر دی اور باغ میں جا کر ہری گھاس پر لیٹ گئی۔ اس کو آج کھلے ہوئے پھولوں میں، آہستہ آہستہ چلنے والی ہوا میں، درختوں پر چہکنے والی چڑیوں کی آواز میں، آسمان کی سرخی میں، ایک عجیب رونق، ایک ناقابل بیان خوبصورتی، ایک روحانی جلوہ کا سماں نظر آتا تھا۔ وہ عشق کا انمول موتی پا گئی۔

ایک ہفتہ ہو گیا مگر ونے سنگھ نے راجپوتانہ کا سفر نہ کیا۔ وہ کسی نہ کسی بہانہ سے دن ٹالتے جاتے تھے۔ کوئی تیاری نہ کرنی تھی۔ پھر بھی تیاریاں پوری نہ ہوتی تھیں۔ اب ونے اور صوفیہ دونوں ہی کو معلوم ہونے لگا کہ عشق کو جب کہ وہ عورت اور مرد دونوں ہی میں ہو، خواہشات نفسانی سے مبرا رکھنا اتنا آسان نہیں ہے، جتنا انہوں نے سمجھا تھا۔ صوفی ایک کتاب بغل میں دبا کر علی الصبح باغ میں جا بیٹھتی۔ شام کو بھی کہیں اور جگہ سیر کرنے نہ جا کر وہیں چلی جاتی۔ ونے بھی اس سے کچھ فاصلہ پر لکھتے پڑھتے کتے سے کھیلتے یا کسی دوست سے باتیں کرتے ضرور دکھائی دیتے۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف دزدیدہ نگاہوں سے دیکھ لیتے تھے، پر شرم کے سبب کوئی بات چیت کرنے میں پیش قدمی نہ کرتا تھا۔ دونوں ہی حیادار تھے۔ پر دونوں ہی اس خاموش بیانی کا مطلب سمجھتے تھے۔ پہلے اس زبان کا علم نہ تھا۔ دونوں کے دل میں ایک ہی خواہش، ایک ہی بے قراری، ایک ہی تڑپ، ایک ہی آگ تھی۔ خاموش بیانی سے انہیں تسکین نہ ہوتی، لیکن کسی کو گفتگو کرنے کی کچھ جرأت نہ ہوتی۔ دونوں اپنے اپنے دلوں میں عشقیہ گفتگو کی نئی نئی باتیں سوچ کر آتے اور وہاں جا کر سب بھول جاتے۔ دونوں ہی عہد کے پکے اور معیار کے پجاری تھے، لیکن ایک کا مذہبی

کتابوں کی طرف دیکھنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ دوسرا سمتی کو اپنے مجوزہ مضامین پر تقریر سنانے کا موقع بھی نہ پاتا تھا۔ دونوں ہی کے لیے عشق کا موتی عشق کا نشہ ثابت ہو رہا تھا۔

ایک روز رات کو کھانا کھانے کے بعد صوفیہ رانی جی کے پاس بیٹھی ہوئی کوئی اخبار پڑھ کر سنا رہی تھی کہ ونے سنگھ آ کر بیٹھ گئے۔ صوفی کی عجیب حالت ہو گئی۔ پڑھتے پڑھتے بھول جاتی کہ کہاں تک پڑھ گئی ہوں اور پڑھی ہوئی سطروں کو دوبارہ پڑھنے لگتی۔ وہ بھی اٹک اٹک کر الفاظ پر نظر نہ جمتی۔ وہ بھول جانا چاہتی تھی کہ کمرہ میں رانی کے علاوہ کوئی اور شخص بیٹھا ہوا ہے مگر ونے کی طرف دیکھے بغیر ہی اس کو غائبانہ علم سا ہو جاتا تھا کہ اب وہ میری طرف دیکھ رہے ہیں اور فوراً ہی اس کا دل بے قابو ہو جاتا تھا۔ جانہوی نے کئی بار ٹوکا۔ ''سوتی تو نہیں ہو؟ کیا بات ہے؟ رک کیوں جاتی ہو؟ آج تمہیں کیا ہو گیا ہے بیٹی؟'' دفعتاً ان کی نگاہ ونے سنگھ پر پڑی۔ اسی وقت جب وہ عاشقانہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جانہوی کا شگفتہ اور مطمئن چہرہ تمتما اٹھا۔ گویا باغ میں آگ لگ گئی۔ تیز نگاہی سے ونے سنگھ کی طرف دیکھ کر بولی۔ ''تم کب جا رہے ہو؟''

ونے: بہت جلد۔

جانہوی: میں بہت جلد کا مطلب یہ سمجھتی ہوں کہ تم کل ہی علی الصبح روانہ ہو جاؤ گے۔

ونے: ابھی ساتھ جانے والے چند آدمی باہر گئے ہوئے ہیں۔

جانہوی: کوئی ہرج نہیں۔ وہ پیچھے سے چلے جائیں گے۔ تمہیں کل ہی جانا ہو گا۔

ونے: جو ارشاد۔

جانہوی: ابھی جا کر سب آدمیوں کو اطلاع دے دو۔ میں چاہتی ہوں کہ تم لوگ طلوع آفتاب کے وقت اسٹیشن پر پہنچ جاؤ۔

ونے: اندو سے ملنے جانا ہے۔

جانہوی: کوئی ضرورت نہیں۔ ملنے کا رواج عورتوں کے لیے ہے۔ مردوں کے لیے نہیں۔ جاؤ۔

ونے کو پھر کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔ آہستہ سے اٹھے اور چلے گئے۔

صوفی نے ہمت کر کے کہا۔ ''آج کل تو راجپوتانہ میں آگ برستی ہوگی۔''

جانہوی نے طے شدہ انداز سے کہا: ''فرض کو کبھی آگ اور پانی کی پروا نہیں ہوتی۔ جاؤ۔ تم بھی سو رہو۔ سویرے اٹھنا ہے۔''

صوفی ساری رات بیٹھی رہی۔ ونے سے ایک بار ملنے کے لیے اس کا دل چھٹ پٹا رہا تھا۔ آہ وہ کل چلے جائیں گے اور میں ان سے الوداعی ملاقات بھی نہ کر سکوں گی! وہ بار بار کھڑکی سے جھانکتی کہ کہیں ونے کی آہٹ مل جائے۔ چھت پر چڑھ کر دیکھا۔ تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ستارے اس کی بے قراری پر ہنس رہے تھے۔ اس کے دل میں کئی بار زبردست تحریک ہوئی کہ چھت پر سے نیچے باغ میں کود پڑوں۔ ان کے کمرہ میں جاؤں اور کہوں میں تمہاری ہوں! آہ اگر مذہب نے میرے اور ان کے درمیان میں رکاوٹ نہ کھڑی کر دی ہوتی تو وہ اتنے متفکر کیوں ہوتے؟ مجھ کو اتنا پس و پیش کیوں ہوتا؟ رانی مجھ سے بے رخی کیوں کرتیں؟ اگر میں راجپوتنی ہوتی تو رانی خوشی سے مجھ کو قبول کرتیں۔ مگر میں یسوع کی مقلد ہونے کی وجہ سے قابل ترک ہوں۔ یسوع اور کرشن میں کتنی یکسانیت ہے، لیکن ان کے مقلدوں میں کتنا اختلاف! کیسی زبردستی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ مذہبی اختلافات نے ہمارے دلوں پر کتنا ظلم کیا ہے۔

جوں جوں رات گزرتی تھی۔ صوفی کا دل فرط یاس سے بیٹھا جاتا تھا۔ ہائے! میں یونہی بیٹھی رہوں گی اور سویرا ہو جائے گا۔ ونے چلے جائیں گے۔ کوئی ایسا بھی تو نہیں جس کے ہاتھوں ایک خط لکھ کر بھیج دوں۔ میرے ہی سبب سے تو ان کو یہ سزا مل رہی ہے۔ ماں کا دل بھی بے رحم ہوتا ہے۔ میں سمجھتی تھی میں ہی بدنصیب ہوں، پر

اب معلوم ہوا ایسی مائیں اور بھی ہیں۔

وہ چھت پر سے اتری اور اپنے کمرہ میں جا کر لیٹ رہی۔ مایوسی نے نیند کی گود میں پناہ لی، لیکن فکر کی نیند حالت گرسنگی کا کھیل ہے۔ سکون سے بری اور لذت سے خالی۔ ذرا سی دیر سوئی تھی کہ چونک کر اٹھ بیٹھی۔ سورج کا اجالا کمرہ میں پھیل گیا تھا اور رونے سنگھ اپنے بیسیوں ہمراہیوں کے ساتھ اسٹیشن جانے کو تیار کھڑے تھے۔ باغ میں ہزاروں آدمیوں کا ہجوم تھا۔

وہ فوراً باغ میں جا پہنچی اور مجمع کو ہٹاتی ہوئی مسافروں کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ قومی گیت گایا جا رہا تھا۔ مسافر ننگے سر، ننگے پیر۔ ایک ایک کرتہ پہنے۔ ہاتھ میں لاٹھی لیے۔ گردنوں میں ایک ایک جھولی لٹکائے۔ سفر کو جانے کے لیے تیار تھے۔ سب کے سب خوشی اور جوش سے بھرے ہوئے قومیت کے غرور سے بے خود ہو رہے تھے، جن کو دیکھ کر تماشائیوں کے دل جذبۂ افتخار سے معمور تھے۔ ایک لمحہ بعد رانی جاہنوی آئیں اور مسافروں کی پیشانیوں پر زعفران کے قشقے لگائے۔ پھر کنور بھرت سنگھ نے آ کر ان کے گلوں میں ہار پہنائے۔ ازاں بعد ڈاکٹر گنگولی نے نہایت منتخب الفاظ میں ان کو اپنا وعظ سنایا۔ وعظ سن کر جانے والے روانہ ہو گئے۔ جے جے کا نعرہ ہزار ہزار گلوں سے نکل کر فضا میں گونجنے لگا۔ عورتوں، مردوں کا ایک مجمع ان کے پیچھے چلا۔ صوفیہ بت بنی ہوئی یہ نظارہ دیکھ رہی تھی۔ اس کے دل میں رہ رہ کر امنگ اٹھتی تھی کہ میں بھی انہیں کے ساتھ چلی جاؤں اور اپنے دکھی بھائیوں کی خدمت کروں۔ اس کی آنکھیں ونے سنگھ پر لگی ہوئی تھیں۔ دفعتاً ونے کی آنکھیں بھی اس کی جانب پھریں۔ انہیں کتنی مایوسی تھی۔ کتنی باطنی تکلیف۔ کتنی مجبوری۔ کتنی عاجزی۔ وہ سب جانے والوں کے پیچھے جا رہا تھا۔ بہت آہستہ آہستہ جیسے پیروں میں بیڑیاں پڑی ہوئی ہوں۔ صوفیہ ہوش اور بے ہوشی کی حالت میں مسافروں کے پیچھے پیچھے چلی اور اسی طرح سڑک پر جا پہنچی۔ پھر چوراہا ملا۔ اس کے بعد کسی راجہ کا عظیم الشان محل۔ پر ابھی تک صوفی کو خبر نہ ہوئی کہ میں ان کے ساتھ چلی جا

رہی ہوں۔ اس کو اس وقت و نے سنگھ کے سوا اور کوئی نظر ہی نہ آتا تھا۔ کوئی زبردست کشش اسے کھینچے لیے جا رہے تھی۔ یہاں تک کہ وہ اسٹیشن کے سامنے والے چوراہے پر پہنچ گئی۔ دفعتاً اس کے کانوں میں پربھوسیوک کی آواز پڑی جو بڑی تیزی سے فٹن دوڑائے چلے آ رہے تھے۔

پربھوسیوک نے پوچھا۔ ''صوفی! تم کہاں جا رہی ہو؟ جوتے تک نہیں۔ صرف زیر پائیاں پہنے ہوئے ہو۔''

صوفیہ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ آہ۔ میں اس بھیس میں کہاں چلی آئی۔ مجھے سدھ ہی نہ رہی۔ لجاتی ہوئی بولی۔ ''کہیں تو نہیں۔''

پربھوسیوک: کیا ان لوگوں کے ساتھ اسٹیشن تک جاؤ گی؟ آؤ! گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ میں بھی وہیں چلتا ہوں۔ مجھے تو ابھی ابھی معلوم ہوا کہ یہ لوگ جا رہے ہیں۔ جلد ہی گاڑی تیار کرا کے آ پہنچا، ورنہ ملاقات بھی نہ ہوتی۔

صوفی: میں اتنی دور نکل آئی اور ذرا بھی خیال نہ آیا کہ کہاں جا رہی ہوں۔

پربھوسیوک: آ کر بیٹھ نہ جاؤ۔ اتنی دور آئی ہو تو اسٹیشن تک اور چلی چلو۔

صوفی: میں اسٹیشن نہ جاؤں گی۔ یہیں سے واپس ہوں گی۔

پربھوسیوک: میں اسٹیشن سے واپسی پر آؤں گا۔ آج تمہیں میرے ساتھ گھر چلنا ہوگا۔

صوفی: میں وہاں نہ جاؤں گی۔

پربھوسیوک: بڑے پاپا بہت ناراض ہوں گے۔ آج تم کو انہوں نے بہت اصرار کے ساتھ طلب کیا ہے۔

صوفی: جب تک ماما خود آ کر مجھے نہ لے جائیں گی، اس وقت تک میں قدم نہ رکھوں گی۔

یہ کہہ کر صوفیہ لوٹ پڑی اور پربھوسیوک اسٹیشن کو چل دیئے۔

اسٹیشن پر پہنچ کر و نے نے چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ صوفی نہ تھی۔

پربھوسیوک نے ان کے کان میں کہا۔ ''دھرم سالہ تک یوں ہی رات کے کپڑے پہنے چلی آئی تھی۔ وہاں سے لوٹ گئی۔ جا کر خط ضرور لکھیے گا ورنہ وہ راجپوتانہ جا پہنچے گی۔''

ونے نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''صرف جسم لے کر جا رہا ہوں۔ دل یہیں چھوڑے جاتا ہوں!''

(10)

لڑکوں پر محبت کی طرح نفرت کا اثر بھی زیادہ ہوتا ہے۔ جب سے مٹھو اور گھیسو کو معلوم ہوا تھا کہ طاہر علی ہمارا امیدان زبردستی لے رہے ہیں۔ اس وقت سے دونوں ان کو اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ چتاری کے راجہ صاحب اور سورداس میں جو باتیں ہوئی تھیں، ان کا انہیں علم نہ تھا۔ سورداس کو خود بھی دغدغا لگا ہوا تھا کہ اگرچہ راجہ صاحب نے اطمینان دلایا ہے مگر جلد ہی یہ مسئلہ پھر چھڑے گا۔ جان سیوک صاحب اتنی آسانی سے گلا چھوڑنے والے نہیں ہیں۔ بجرنگی، نایک رام وغیرہ بھی اسی قسم کی باتیں کرتے رہتے تھے۔ مٹھو اور گھیسو یہ باتیں بڑی چاہ سے سنتے اور ان کی آتش غضب اور بھی مشتعل ہوتی۔ گھیسو جب بھینسیں لے کر میدان کی طرف جاتا تو زور زور سے پکارتا۔ ''دیکھیں کون ہماری جمین (زمین) لیتا ہے۔ اٹھا کر ایسا پٹکوں کہ وہ بھی یاد کرے۔ دونوں ٹانگیں توڑ دوں گا۔ کچھ کھیل سمجھ لیا ہے۔'' وہ ذرا تھا بھی کڑے دم کا۔ کشتی لڑتا تھا۔ بجرنگی خود بھی جوانی میں اچھا پہلوان تھا۔ گھیسو کو وہ شہر کے پہلوانوں کی ناک بنا دینا چاہتا تھا جس کے سامنے پنجابی پہلوانوں کو بھی خم ٹھونکنے کی ہمت نہ پڑے۔ دور دور جا کر دنگل مارے لوگ کہیں۔ ''یہ بجرنگی کا بیٹا ہے!'' وہ ابھی سے گھیسو کو اکھاڑے بھیجتا تھا۔ گھیسو اپنے زعم میں سمجھتا تھا کہ مجھے جو پیچ معلوم ہیں، ان سے جس کو چاہوں گرا دوں۔ مٹھو کشتی تو نہ لڑتا پر کبھی اکھاڑے میں جا بیٹھتا تھا۔ اس کو اپنی پہلوانی کی ڈینگ مارنے کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ یہ دونوں جب طاہر علی کو کہیں دیکھتے تو سنا سنا کر کہتے۔ ''دشمن جاتا ہے۔ اس کا منہ کالا'' مٹھو کہتا ہے۔''

بے فکر۔ کانٹا لگے نہ کنکر۔'' دشمن کو تنگ کر۔ گھیسو کہتا۔ ''بم بھولا۔ بیری کے پیٹ میں گولا۔ اس سے کچھ نہ جانے بولا۔''

طاہر علی ان چھوکروں کی چھچھورپن کی باتیں سنتے اوران سنی کر جاتے۔ لڑکوں کے منہ کیا لگیں۔ سوچتے۔ کہیں یہ سب گالیاں دے بیٹھیں تو ان کا کیا بنا لوں گا۔ وہ دونوں سمجھتے ڈر کے مارے نہیں بولتے اور بھی شیر ہو جاتے۔ گھیسو مٹھوا پر ان پیچوں کی آزمائش کرتا جن سے وہ طاہر علی کو پٹکے گا۔ پہلے یہ ہاتھ پکڑا پھر اپنی طرف کھینچا۔ تب وہ ہاتھ گردن میں ڈال دیا اور اڑنگی لگائی۔ بس چاروں شانے چت مٹھوا فوراً گر پڑتا تھا اوراس کو اس پیچ کے عجیب اثر کا یقین ہو جاتا تھا۔

ایک روز دونوں نے صلاح کی کہ چل کرمیاں جی کے لڑکوں کی خبر لینی چاہیے۔ میدان میں جا کر ظاہر اور جابر کو کھیلنے کے لیے بلایا اور خوب چپتیں لگائیں۔ جابر چھوٹا تھا۔ اسے مٹھوا نے دبایا۔ ظاہر اور گھیسو کا جوڑ تھا، لیکن گھیسو اکھاڑہ دیکھے ہوئے تھا۔ کچھ داؤ پیچ جانتا ہی تھا۔ آن کی آن میں ظاہر کو دبا بیٹھا۔ مٹھوا نے جابر کے چٹکیاں لینی شروع کیں۔ بیچارہ رونے لگا۔ گھیسو نے ظاہر کو کئی رگڑے دیئے۔ وہ بھی چوندھیا گیا۔ جب دیکھا کہ یہ تو مار ہی ڈالے گا تو اس نے بھی پکار مچائی۔ ان دونوں کا رونا سن کرننھا سا صابر ایک پتلی سی قمچی لیے اکڑتا ہوا غم زدوں کی مدد کرنے آیا اور گھیسو کو قمچی سے مارنے لگا۔ جب اس مار کا گھیسو پر کچھ اثر نہ ہوا تو اس نے اس سے زیادہ چوٹ پہنچانے والا ہتھیار نکالا۔ وہ گھیسو پر تھوکنے لگا۔ گھیسو نے ظاہر کو چھوڑ دیا اور صابر کے دو تین طمانچے لگائے۔ ظاہر موقع پا کر پھر اٹھا اور اب کے زیادہ ہوشیار ہو کر گھیسو سے لپٹ گیا۔ دونوں میں کشتی ہونے لگی۔ آخر گھیسو نے اسے پھر پٹکا اور مشکیں چڑھا دیں۔ ظاہر کو اب رونے کے سوا اور تدبیر نہ سوجھی۔ یہ کمزوروں کا آخری ہتھیار ہے۔ تینوں کے رونے کی آواز ماہر علی کے کانوں میں پہنچی۔ وہ اس وقت مدرسہ جانے کو تیار تھے۔ فوراً کتابیں پٹک دیں اور میدان کی طرف دوڑے۔

دیکھا تو طاہر اور جابر نیچے پڑے ہائے ہائے کر رہے ہیں اور صابر الگ رو رہا ہے۔ شرافت کا خون جوش میں آ گیا۔ میں سید پولیس کے افسر کا بیٹا۔ چنگی کے محرر کا بھائی۔ انگریزی کے آٹھویں درجہ کا متعلم! یہ جاہل، گنوار، اہیر کا لونڈا، اس کی اتنی مجال کہ میرے بھائیوں کو نیچا دکھائے۔ اس نے گھیسو کو ایک ٹھوکر لگائی اور مٹھوا کو کئی طمانچے، مٹھوا تو رونے لگا مگر گھیسو دل کا مضبوط تھا۔ طاہر کو چھوڑ کر اٹھا۔ حوصلے بڑھے ہوئے تھے۔ دو مورچے سر کر چکا تھا۔ خم ٹھونک کر ماہر علی سے بھی لپٹ گیا۔ ماہر کا سفید پاجامہ میلا ہو گیا۔ آج ہی جوتے میں روغن لگایا تھا۔ اس پر گرد پڑ گئی۔ سنوارے ہوئے بال بکھر گئے۔ غضب ناک ہو کر گھیسو کو ایسی گردنی دی کہ دو قدم پر جا گرا۔ صابر طاہر سب ہنسنے لگے۔ لڑکوں کی چوٹ بدلہ لینے کے ساتھ ہی غائب ہو جاتی ہے۔ گھیسو ان کو ہنستے دیکھ کر اور بھی جھنجلایا۔ پھر اٹھا اور ماہر سے لپٹ گیا۔ ماہر نے اس کا گلا پکڑا اور زور سے دبانے لگا۔ گھیسو نے سمجھا اب مرا۔ یہ مارے بغیر نہ چھوڑے گا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ ماہر کے ہاتھ میں دانت جما دیئے۔ تین دانت گڑ گئے۔ خون بہنے لگا۔ ماہر چیخ اٹھا۔ اس کا گلا چھوڑ کر اپنا ہاتھ چھڑانے لگا۔ مگر گھیسو کسی طرح نہ چھوڑتا تھا۔ خون بہتا دیکھ کر تینوں بھائیوں نے پھر رونا شروع کیا۔ زینب اور رقیہ یہ شور و غوغا سن کر دروازہ پر آ گئیں۔ دیکھا تو میدان جنگ خون سے سرخ ہو رہا ہے۔ گالیاں دیتی ہوئی طاہر علی کے پاس گئیں۔ زینب نے حقارت آمیز آواز میں کہا۔ ''تم یہاں بیٹھے کھالیں نوچ رہے ہو۔ کچھ دین دنیا کی بھی خبر ہے؟ وہاں وہ اہیر کا لونڈا ہمارے بچوں کا خون کیے ڈالتا ہے۔ موئے کو پکڑ پاتی تو خون ہی پی لیتی۔''

رقیہ: موا آدمی کا بچہ ہے کہ دیو بچہ۔ ماہر کے ہاتھ میں اتنے زور سے دانت سے کاٹا ہے کہ خون کے فوارے نکل رہے ہیں۔ کوئی دوسرا مرد ہوتا تو اسی بات پر جیتا گاڑ دیتا۔

زینب: کوئی اپنا ہوتا تو اسی بات پر مونڈی کاٹے کو کچا ہی چبا جاتا۔

طاہر علی گھبرا کر میدان کی طرف دوڑے۔ ماہر کے کپڑے خون سے تر دیکھے تو جامہ سے باہر ہو گئے۔ گھیسو کے دونوں کان پکڑ کر زور سے ملے اور طمانچے پر طمانچے لگانے شروع کیے۔ مٹھوا نے دیکھا اب پٹنے کی باری آئی۔ میدان ہمارے ہاتھ سے گیا۔ گالیاں دیتا ہوا بھاگا۔ ادھر گھیسو نے بھی گالیاں دینا شروع کیا۔ شہر کے لونڈے گالی دینے میں مشاق ہوتے ہیں۔ گھیسو نئی گالیاں اختراع کر رہا تھا اور طاہر علی گالیوں کا جواب طمانچوں سے دے رہے تھے۔ مٹھوا نے جا کر اس معرکہ کی خبر بجرنگی کو دی۔ ''سب لوگ مل کر گھیسو کو مار رہے ہیں۔ اس کے منہ سے لہو نکل رہا ہے۔ وہ بھینسیں چرا رہا تھا کہ تینوں لڑکے آ کر بھینسوں کو بھگانے لگے۔ گھیسو نے منع کیا تو سب نے مل کر مارا اور بڑے میاں بھی نکل کر مار رہے ہیں۔'' بجرنگی یہ خبر سنتے ہی آگ ہو گیا۔ اس نے طاہر علی کی ماں کو پچاس روپے دیئے تھے اور اس زمین کو اپنی سمجھے بیٹھا تھا۔ لاٹھی اٹھائی اور دوڑا۔ دیکھا تو طاہر علی گھیسو کے ہاتھ پاؤں بندھوا رہے ہیں۔ پاگل ہو گیا۔ بولا ''بس منشی جی! بھلا چاہتے تو ہٹ جاؤ۔ نہیں تو ساری سیکھی (شیخی) بھلا دوں گا۔ یہاں جیل خانہ کا ڈر نہیں ہے۔ سال دو سال وہیں کاٹ آؤں گا۔ مگر تم کو کسی کام کا نہ رکھوں گا۔ زمین تمہارے باپ کی نہیں ہے۔ اس لیے تمہیں پچاس روپے دیئے ہیں۔ کیا وہ حرام کے روپے تھے؟ بس ہٹ ہی جاؤ۔ نہیں تو کچا چبا جاؤں گا۔ میرا نام بجرنگی ہے۔''

طاہر علی نے ابھی کچھ جواب نہ دیا تھا کہ گھیسو نے باپ کو دیکھتے ہی زور سے چھلانگ ماری اور ایک پتھر اٹھا کر طاہر علی کی طرف پھینکا۔ وہ سر نیچا نہ کر لیں تو ماتھا پھٹ جائے۔ جب تک گھیسو دوسرا پتھر اٹھائے۔ انہوں نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑا اور اتنے زور سے اینٹھا کہ وہ ''آہ مرا آہ مرا'' کہتا ہوا زمین پر گر پڑا۔ اب بجرنگی آپے سے باہر ہو گیا۔ جھپٹ کر ایسی لاٹھی ماری کہ طاہر علی تیورا کر گر پڑے۔ کئی چمار

جواب تک اسے لڑکوں کا جھگڑا سمجھ کر چپ چاپ بیٹھے ہوئے تھے۔ طاہر علی کو گرتے دیکھ کر دوڑے اور بجرنگی کو پکڑ لیا۔ میدان کارزار میں سناٹا چھا گیا۔ ہاں زینب اور رقیہ دروازہ پر کھڑی ہوئیں لفظی تیروں سے برابر کام لے رہی تھیں۔ ''مونڈی کاٹے نے غضب کر دیا۔ اس پر خدا کا قہر نازل ہو۔ اگلا دن دیکھنا نصیب نہ ہو۔ اس کی میت اٹھے۔ کوئی دوڑتے ہوئے صاحب کے پاس جا کر کیوں اطلاع نہیں دیتا۔ ارے او چمارو! بیٹھے منہ کیا تاکتے ہو؟ جا کر صاحب کو خبر کیوں نہیں دیتے؟ کہنا ابھی چلیے۔ ساتھ لانا۔ کہنا پولیس لیتے چلیے۔ یہاں جان دینے نہیں آئے ہیں۔''

بجرنگی نے طاہر علی کو گرتے دیکھا تو سنبھل گیا۔ دوسرا ہاتھ نہ چھوڑا۔ گھیسو کا ہاتھ پکڑا اور گھر چلا گیا۔ یہاں گھر میں کہرام مچ گیا۔ دو چمار جان سیوک کے بنگلہ کی طرف گئے۔ طاہر علی کو لوگوں نے اٹھایا اور چارپائی پر لاد کر کمرہ میں لائے۔ کندھے پر لاٹھی لگی تھی۔ شاید ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ ابھی تک بے ہوش تھے۔ چماروں نے فوراً ہلدی پیسی اور اسے گڑ چونے میں ملا کر ان کے کندھے پر لگایا۔ ایک آدمی لپک کر ارنڈ کے پتے توڑ لایا۔ دو آدمی بیٹھ کر چوٹ سینکنے لگے۔ زینب اور رقیہ تو ماہر علی کی مرہم پٹی کرنے لگیں۔ بیچاری کلثوم دروازہ پر کھڑی رو رہی تھی۔ شوہر کی طرف اس سے دیکھا بھی نہ جاتا تھا۔ گرنے سے ان کے سر پر چوٹ آ گئی تھی۔ خون بہہ کر ماتھے پر جم گیا تھا۔ بالوں پر لٹیں پڑ گئی تھیں۔ گویا کسی مصور کے برش پر رنگ خشک ہو گیا۔ دل میں درد ہو رہا تھا، لیکن شوہر کو دیکھتے ہی اس کو بے ہوشی سی ہونے لگتی تھی۔ یہ خیال بھی آ رہا تھا کہ یہ سب لوگ اپنے دل میں کیا کہتے ہوں گے۔ اس کو شوہر سے ذرا بھی محبت نہیں۔ کھڑی تماشا دیکھ رہی ہے۔ کیا کروں؟ ان کا چہرہ نہ جانے کیسا ہو گیا ہے۔ وہی چہرہ جس کی کبھی بلائیں لی جاتی تھیں۔ مرنے کے بعد خوف ناک ہو جاتا ہے۔ اس کی طرف نگاہ کرنے کے لیے کلیجہ کو مضبوط بنانا پڑتا ہے۔ زندگی کی طرح موت کا بھی سب سے زیادہ نمایاں اثر چہرہ پر ہی پڑتا ہے۔ طاہر علی کی دن بھر

سینک باندھ ہوئی۔ چماروں نے اس طرح دوڑ دھوپ کی۔ گویا ان کا کوئی خاص دوست ہو۔ عملی ہمدردی کا ہونا دہقانوں کا ایک خاص وصف ہے۔ رات کو بھی کئی چمار ان کے پاس بیٹھے ہوئے سینکتے باندھتے رہے۔ زینب اور رقیہ بار بار کلثوم کو طعنے دیتیں۔ ''بہن تمہارا دل بھی غضب کا ہے۔ وہاں شوہر کا برا حال ہو رہا ہے اور تم یہاں مزہ سے بیٹھی ہو۔ ہمارے میاں کے سر میں ذرا سا درد ہوتا تھا تو ہماری جان نا خون میں آ جاتی تھی۔ آج کل کی عورتوں کا کلیجہ سچ مچ پتھر کا ہوتا ہے۔'' کلثوم کا دل ان تیروں سے چھدا جاتا تھا مگر یہ کہنے کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ تمہیں دونوں کیوں نہیں چلی جاتیں؟ آخر تم بھی تو انہیں کی کمائی کھاتی ہو اور مجھ سے زیادہ۔ لیکن اتنا کہتی تو بچ کر کہاں جاتی۔ دونوں اس کے گلے پڑ جاتیں۔ بیچاری ساری رات جاگتی رہی۔ بار بار دروازہ پر جا کر آہٹ لے آتی تھی۔ کسی طرح رات گئی۔ صبح طاہر علی کی آنکھ کھلی۔ درد سے اب بھی کراہ رہے تھے مگر اب ان کی حالت اس قدر تشویش انگیز نہ تھی۔ تکیہ کے سہارے بیٹھ گئے۔ کلثوم نے ان کو چماروں سے باتیں کرتے سنا۔ ایسا معلوم ہوا کہ ان کی آواز کچھ تبدیل ہوگئی ہے۔ چماروں نے جونہی انہیں ہوش میں دیکھا، سمجھ گئے کہ اب ہماری ضرورت نہیں رہی۔ اب گھر والوں کی تیمارداری کا وقت آ گیا۔ ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ اب کلثوم نے دل کو مضبوط کیا اور شوہر کے پاس آ بیٹھی۔ طاہر علی نے اس کو دیکھا تو کمزور آواز میں بولے۔ ''خدا نے مجھے نمک حرامی کی سزا دی ہے۔ جن کے لیے اپنے آقا کا برا چیتا وہی اپنے دشمن ہو گئے۔

کلثوم: تم یہ ملازمت چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟ جب تک زمین کا معاملہ طے ہو جائے گا نت نیا جھگڑا ہوتا ہی رہے گا۔ لوگوں سے دشمنی بڑھتی جائے گی۔ یہاں جان تھوڑا ہی دینی ہے۔ خدا جانے جس طرح اتنے دن رزق دیا اسی طرح آگے بھی دے گا۔ جان تو سلامت رہے گی۔

طاہر: جان تو سلامت رہے گی مگر گذر کیسے ہوگی؟ کون اتنا دیئے دیتا ہے؟ دیکھتی

ہو کہ اچھے اچھے پڑھے لکھے لوگ مارے مارے پھرتے ہیں۔

کلثوم: نہ اتنا ملے گا نہ سہی۔ اس کا نصف تو ملے گا۔ دونوں وقت نہ کھائیں گے۔ ایک ہی وقت سہی۔ جان تو آفت میں نہ رہے گی۔

طاہر: تم ایک وقت کھا کر خوش رہو گی۔ گھر میں اور لوگ بھی تو ہیں۔ ان کے دکھڑے روز کون سنے گا۔ مجھے اپنی جان سے دشمنی تھوڑا ہی ہے۔ پر مجبور ہوں۔ خدا کو جو منظور ہے، وہی ہو گا۔

کلثوم: گھر کے اور لوگوں کے پیچھے جان دے دو گے؟

طاہر: کیسی باتیں کرتی ہو۔ آخر وہ لوگ کوئی غیر تو نہیں ہیں۔ اپنے ہی بھائی ہیں یا مائیں ہیں۔ ان کی پرورش میرے سوا اور کون کرے گا؟

کلثوم: تم سمجھتے ہو گے وہ لوگ تمہارے محتاج ہیں مگر ان کو تمہاری رتی برابر بھی پروا نہیں ہے۔ جب تک مفت ملے اپنے خزانہ میں کیوں ہاتھ لگائیں۔ میرے بچے پیسے پیسے کو ترستے ہیں اور وہاں مٹھائیوں کی ہانڈیاں آتی ہیں۔ ان کے لڑکے مزہ میں کھاتے ہیں۔ دیکھتی ہوں اور آنکھیں بند کر لیتی ہوں۔

طاہر: میرا جو فرض ہے، اسے پورا کرتا ہوں۔ اگر ان کے پاس روپے ہیں تو اس کا مجھے کیوں افسوس ہو۔ وہ شوق سے کھائیں اور آرام سے رہیں۔ تمہاری باتوں سے حسد کی بو آتی ہے۔ خدا کے لیے مجھ سے ایسی باتیں نہ کیا کرو۔

کلثوم: پچھتاؤ گے۔ جب سمجھاتی ہوں مجھی پر ناراض ہوتے ہو، لیکن دیکھ لینا کوئی بات نہ پوچھے گا۔

طاہر: یہ سب تمہاری نیت کا قصور ہے۔

کلثوم: ہاں عورت ہوں۔ مجھ میں عقل کہاں۔ پڑے تو ہو کسی نے جھانکا تک نہیں۔ قلق ہوتا تو یوں چین سے نہ بیٹھی رہتیں۔

طاہر علی نے کروٹ بدلی تو کندھے پر شدت کا درد محسوس ہوا۔ آہ آہ کر کے چیخ

اٹھے۔ ماتھے پر پسینہ آ گیا، کلثوم گھبرا کر بولی۔ ''کسی کو بھیج کر ڈاکٹر کو کیوں نہیں بلا لیتے؟ کہیں ہڈی پر ضرب نہ آ گئی ہو۔''

طاہر: ہاں مجھے بھی ایسا ہی اندیشہ ہو رہا ہے مگر ڈاکٹر کو بلاؤں تو اس کی فیس کے روپے کہاں سے آویں گے؟

کلثوم: تنخواہ تو ابھی ملی تھی۔ کیا اتنی جلدی خرچ ہو گئی؟

طاہر: خرچ تو نہیں ہو گئی لیکن فیس کی گنجائش نہیں ہے۔ اب کے ماہر کی تین ماہ کی فیس دینی ہو گی۔ بارہ روپے تو فیس ہی کے نکل جائیں گے۔ صرف اٹھارہ بچیں گے۔ ابھی تو پورا مہینہ پڑا ہوا ہے۔ کیا فاقہ کریں گے؟

کلثوم: جب دیکھو ماہر کی فیس کا تقاضا سر پر سوار رہتا ہے۔ ابھی دس دن ہوئے فیس نہیں دی گئی۔

طاہر: دس دن نہیں ہوئے۔ ایک مہینہ ہو گیا۔

کلثوم: فیس اب کے نہ جائے گی۔ ڈاکٹر کی فیس اس فیس سے زیادہ ضروری ہے۔ وہ پڑھ کر روپے کمائی کے تو میرا گھر نہ بھریں گے۔ مجھے تو تمہاری ہی ذات کا بھروسہ ہے۔

طاہر: (بات بدل کر) ان موذیوں کی جب تک بخوبی تنبیہ نہ ہو جائے گی۔ شرارت سے باز نہ آئیں گے۔

کلثوم: ساری شرارت اسی ماہر کی تھی۔ لڑکوں میں لڑائی جھگڑا ہوتا ہی رہتا ہے۔ یہ وہاں نہ جاتا تو کیوں معاملہ اتنا طول کھینچتا۔ اس پر جواہیر کے لونڈے نے ذرا دانت کاٹ لیا تو آپ بھنا اٹھے۔

طاہر: مجھے تو خون کے چھینٹے دیکھتے ہی جیسے سر پر شیطان سوار ہو گیا۔

اتنے میں گھیسو کی ماں جمنی آ پہنچی۔ زینب نے اسے دیکھتے ہی فوراً بلا لیا اور ڈانٹ کر کہا: ''معلوم ہوتا ہے تیری شامت آ گئی ہے۔''

جمنی: بیگم صاحب! شامت نہیں آئی ہے۔ برے دن آئے ہیں اور کیا کہوں۔ میں کل دہی بیچ کر لوٹی تو یہ حال سنا۔ سیدھے آپ کی کھدمت (خدمت) میں دوڑی۔ پر یہاں بہت آدمی جمع تھے۔ لاج کے مارے لوٹ گئی۔ آج دہی بیچنے نہیں گئی۔ بہت ڈرتے ڈرتے آئی ہوں۔ جو کچھ بھول چوک ہوئی، اسے معاف کیجیے۔ نہیں تو اجڑ جائیں گے۔ کہیں ٹھکانا نہیں ہے۔

زینب: اب ہمارے کیے کچھ نہیں ہوسکتا۔ صاحب بلا مقدمہ چلائے نہ مانیں گے اور وہ نہ چلائیں گے تو ہم چلائیں گے۔ ہم کوئی دھنیے جلاہے ہیں۔ یوں سب سے دبتے پھریں تو عزت کیسے رہے۔ میاں کے باپ تھانہ دار تھے۔ سارا علاقہ ان کے نام سے کانپتا تھا۔ بڑے بڑے رئیس ہاتھ باندھے سامنے کھڑے رہتے تھے۔ ان کی اولاد کیا اب ایسی گئی گذری ہوگئی کہ چھوٹے چھوٹے آدمی بے عزتی کریں۔ تیرے لونڈے نے ماہر کو اتنے زور سے دانت سے کاٹا کہ لہولہان ہوگیا۔ پٹی باندھے پڑا ہے۔ تیرے شوہر نے آکر لڑکے کو ڈانٹ دیا ہوتا تو بگڑی بات بن جاتی، لیکن اس نے تو آتے ہی لاٹھی چلادی۔ ہم شریف لوگ ہیں۔ اتنی رعایت نہیں کرسکتے۔

رقیہ: جب پولیس آکر مارتے مارتے کچومر نکال لے گی۔ تب ہوش آئے گا۔ نذو ونیاز دینا پڑے گی وہ الگ۔ جبھی آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوگا۔

جمنی کو اپنے شوہر کے غصہ کی عملی واقفیت حاصل تھی۔ ان دھمکیوں سے ذرا بھی نہ ڈری۔ بولی: ''بیگم صاحب یہاں اتنے روپے کہاں دھرے ہیں۔ دودھ پانی کر کے دس پانچ روپے اکٹھے کیے ہیں بس وہیں تک اپنی دوڑ ہے۔ اس روزگار میں اب کیا رکھا ہے۔ روپیہ کا تین پنسیری تو بھوسہ ملتا ہے۔ ایک روپیہ میں ایک بھینس کا پیٹ نہیں بھرتا۔ اس پر کھلی، بنولہ، بھوسی، چوکر بھی کچھ چاہیے۔ کسی طرح دن کاٹ رہے ہیں۔ آپ کے بال بچوں کو سال چھ مہینے دودھ پلا دوں گی۔''

زینب سمجھ گئی کہ یہ اہیرن کچی گولی نہیں کھیلی ہے اس کے لیے کسی دوسرے ہی منتر سے کام لینا پڑے گا۔ ناک سکوڑتے ہوئی بولی۔ ''تو اپنا دودھ اپنے گھر رکھ۔ یہاں دودھ گھی کے ایسے بھوکے نہیں ہیں۔ یہ زمین اپنی ہوئی جاتی ہے۔ جتنے مویشی چاہوں گی پال لوں گی۔ مگر تجھے کہے دیتی ہوں کہ تو گھر میں کل سے نہ بیٹھنے پائے گی۔ پولیس کی رپٹ تو صاحب کے ہاتھ میں ہے، پر ہمیں بھی خدا نے ایسا علم دیا ہے کہ جہاں ایک نقش لکھ کر دم کیا، جنات اپنا کام کرنے لگے۔ جب ہمارے میاں زندہ تھے تو ایک بار پولیس کے ایک بڑے انگریز حاکم سے کچھ حجت ہوگئی۔ بولا ہم تم کو نکال دیں گے۔ میاں نے آ کر مجھ سے کہا۔ میں نے اسی رات سلیمانی نقش لکھ کر دم کیا۔ اس کی میم کا پورا حمل گر گیا۔ دوڑا ہوا آیا۔ خوشامدیں کیں۔ پیروں پر گرا۔ میاں سے قصور معاف کرایا۔ تب میم کی جان بچی۔ کیوں رقیہ تمہیں یاد ہے نا؟''

رقیہ: یاد کیوں نہیں ہے۔ میں نے ہی تو دعا پڑھی تھی۔ صاحب رات بھر دروازہ پر پکارتا رہا تھا۔

زینب: ہم اپنی طرف سے کسی کی برائی نہیں چاہتے لیکن جب جان پر آ بنتی ہے تو سبق بھی ایسا دیتے ہیں کہ زندگی بھر نہ بھولے۔ ابھی اپنے پیر سے کہہ دیں تو خدا جانے کیا غضب ڈھائیں۔ تمہیں تو یاد ہے رقیہ؟ ایک اہیر نے انہیں دودھ میں پانی ملا کر دیا تھا۔ ان کی زبان سے اتنا ہی نکلا۔ ''جا تجھے خدا سمجھے۔'' اہیر نے گھر آ کر دیکھا تو اس کی دو سو روپے کی بھینس مر گئی تھی۔

جمنی نے یہ باتیں سنی تو ہوش اڑ گئے۔ دوسری عورتوں کی طرح وہ بھی تھانہ، پولیس، کچہری اور دربار کی بہ نسبت بھوت پریت سے زیادہ خوف زدہ رہتی تھی۔ پاس پڑوس میں بھوتوں کی لیلا دیکھنے کے موقعے آئے دن ملتے ہی رہتے تھے۔ ملاؤں کے جنتر منتر کہیں زیادہ لاگو ہوتے تھے ہیں، یہ بھی جانتی تھی۔ زینب نے اس کے شیطانی خوف کو محرک کر کے اپنی کمال ہوشیاری کا ثبوت دیا۔ جمنی ڈر کر بولی۔

''نہیں بیگم صاحب آپ کو بھی بھگوان نے بال بچے دیئے ہیں، ایسا ظلم نہ کیجیے گا۔ نہیں تو مر جاؤں گی۔''

زینب: یہ بھی نہ کریں وہ بھی نہ کریں تو عزت کیسے رہے۔ کل کو تیرا اہیر پھر لٹھ لے کر آ پہنچے تو؟ خدا نے چاہا تو اب وہ لٹھ اٹھانے لائق رہ نہ جائے گا۔

جمنی کانپتی ہوئی پیروں پر گر پڑی اور بولی۔ ''بی بی جو حکم ہو، اس کے لیے حاضر ہوں۔''

زینب نے چوٹ پر چوٹ لگائی اور جمنی کے بہت رونے گڑگڑانے پر پچیس روپے لے کر جنات سے اس کو بے خوف کیا۔ جمنی گھر گئی۔ روپے لا کر دیئے اور پیروں پر گری۔ مگر بجرنگی سے یہ بات نہ کہی۔ وہ چلی گئی تو زینب نے ہنس کر کہا۔ ''خدا دیتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ اس کا وہم گمان بھی نہ تھا۔ تم بے صبر ہو جاتی ہو ورنہ میں نے کچھ نہ کچھ اور اینٹھا ہوتا۔ سوار کو چاہیے کہ باگ ہمیشہ کڑی رکھے۔''

دفعتاً صابر نے آ کر زینب سے کہا۔ ''آپ کو ابا بلاتے ہیں۔'' زینب وہاں گئی تو طاہر علی کو پڑے کراہتے دیکھا کلثوم سے بولی۔ ''بی بی غضب کا تمہارا جگر ہے۔ ارے بھلے آدمی! جا کر ذرا مونگ کا دلیا پکا دے۔ غریب نے رات کو کچھ نہیں کھایا۔ اس وقت بھی منہ میں کچھ نہ جائے گا۔ تو کیا حال ہوگا؟''

طاہر: نہیں۔ میرا کچھ کھانے کو جی نہیں چاہتا۔ آپ کو اس لیے تکلیف دی ہے کہ اگر آپ کے پاس کچھ روپے ہوں تو مجھے قرض کے طور پر دے دیجیے۔ میرے شانوں میں درد ہے۔ شاید ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ ڈاکٹر کو دکھلانا چاہتا ہوں مگر اس کی فیس کے لیے روپوں کی ضرورت ہے۔

زینب: بیٹا۔ بھلا سوچو تو میرے پاس روپے کہاں سے آئے؟ تمہارے سر کی قسم کھا کر کہتی ہوں مگر تم ڈاکٹر کو بلاتے ہی کیوں ہو؟ تمہیں سید تھے صاحب کے یہاں جانا چاہیے۔ یہ ہنگامہ انہیں کی بدولت تو ہوا ہے ورنہ یہاں ہم کو کسی سے کیا غرض

تھی؟ ایک یکہ منگوا لو اور صاحب کے یہاں چلے جاؤ۔ وہ ایک رقعہ لکھ دیں گے تو سرکاری شفاخانہ میں خاصی طرح علاج ہو جائے گا۔ تمہیں سوچو ہماری حیثیت ڈاکٹر بلانے کی ہے؟

طاہر علی کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی۔ ماں کا شکریہ ادا کیا۔ سوچا نہ جانے یہی بات میری سمجھ میں کیوں نہیں آئی۔ یکہ منگوایا۔ لاٹھی کے سہارے بڑی مشکل سے اس پر سوار ہوئے اور صاحب کے بنگلہ پر پہنچے۔

مسٹر سیوک، راجہ مہیندر کمار سے ملنے کے بعد کمپنی کے حصص بیچنے کے لیے باہر چلے گئے تھے۔ کل وہ راجہ صاحب سے پھر ملے تھے مگر جب ان کا فیصلہ سنا تو بہت مایوس ہوئے۔ بہت دیر تک بیٹھے بحث مباحثہ کرتے رہے لیکن راجہ صاحب نے کوئی اطمینان بخش جواب نہ دیا۔ ناامید ہو کر آئے اور مسز سیوک کو سارا حال سنایا۔

مسز سیوک کو ہندوستانیوں سے چڑ تھی۔ اگرچہ اسی ملک کے آب و گل سے ان کا جسم بنا تھا، لیکن اپنے خیال میں مذہب عیسوی کو اختیار کر کے وہ ان بد اطواریوں سے نجات پا چکی تھیں جو ہندوستانیوں کے لیے مخصوص ہیں۔ ان کے خیال میں خدا نے ہندوستانیوں کو شرافت، ہمدردی، فیاضی، انسانیت وغیرہ اعلیٰ اوصاف سے بالکل ہی محروم رکھا تھا۔ وہ مغربی تہذیب کی معتقد تھیں اور طرز معاشرت میں اسی کی تقلید کرتی تھیں۔ کھانا پینا، وضع قطع، بود و باش سب انگریزی تھی۔ مجبوری صرف اپنے سانولے رنگ سے تھی۔ صابن اور دیگر کیمیاوی اشیاء کے متواتر استعمال سے بھی دلی مراد بر نہ آتی تھی۔ ان کی زندگی کا اعلیٰ مقصد یہی تھا کہ ہم عیسائیوں کے درجہ سے نکل کر انگریزوں سے مل جائیں۔ ہمیں لوگ صاحب سمجھیں۔ ہمارا ربط ضبط انگریزوں سے ہو۔ ہمارے لڑکوں کی شادیاں اینگلو انڈین یا کم از کم اعلیٰ طبقہ والے یوروشین لوگوں کے یہاں ہوں۔ صوفیہ کی تعلیم و تربیت انگریزی طریقہ پر ہوئی تھی، لیکن وہ ماں کے بہت اصرار کرنے پر بھی انگریزی پارٹیوں اور دعوتوں میں

نہ شریک ہوتی تھی۔ ناچ سے تو اس کو نفرت ہی تھی، لیکن مسز سیوک ان مواقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیتی تھیں۔ یوں کام نہ چلتا تو خاص کر کوشش کر کے دعوتی کارڈ منگواتیں تھیں۔ اگر خود ان کے گھر پر دعوتیں اور پارٹیاں بہت کم ہوتی تھیں تو اس کا سبب تھا ایشور سیوک کی کنجوسی۔

یہ حال سن کر مسز سیوک نے کہا: دیکھ لی ہندوستانیوں کی شرافت؟ پھولے نہ ساتے تھے۔ اب تو معلوم ہوا کہ یہ لوگ کس قدر بد عہد اور نا اہل ہیں؟ ایک اندھے فقیر کے مقابلہ میں تمہاری یہ قدر ہے! جانبداری تو ان لوگوں کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ یہ ان بڑے بڑے آدمیوں کا حال ہے جو اپنی قوم کے رہنما سمجھے جاتے ہیں۔ جن کی فیاضی پر لوگوں کو ناز ہے! میں نے ایک بار مسٹر کلارک سے یہ ذکر کیا تھا انہوں نے تحصیل داروں کو حکم دے دیا کہ اپنے اپنے علاقہ میں تمباکو کی پیداوار بڑھاؤ۔ یہ صوفی کے آگ میں کودنے کا انعام ہے۔ ذرا سا میونسپلٹی کا اختیار کیا مل گیا۔ سبھوں کے دماغ پھر گئے۔ مسٹر کلارک کہتے تھے کہ اگر راجہ صاحب زمین کا معاملہ طے کریں گے تو میں اسے ضابطہ سے آپ کو دلا دوں گا۔

مسٹر کلارک حاکم ضلع تھے۔ ابھی تھوڑے ہی دنوں سے یہاں آئے تھے۔ مسز سیوک نے ان سے ربط ضبط پیدا کر لیا تھا۔ دراصل انہوں نے کلارک کو صوفی کے لیے منتخب کیا تھا۔ دو ایک دفعہ انہیں اپنے گھر بھی بلا چکی تھیں۔ گھر چھوڑ دینے سے پیشتر صوفی کی ان سے دو تین بار ملاقات بھی ہو چکی تھی، مگر وہ ان کی طرف زیادہ متوجہ نہ ہوئی تھی، تو بھی مسز سیوک ابھی اس بارے میں نا امید نہیں ہو چکی تھیں۔ کلارک سے کہتی رہتی تھیں کہ صوفی مہمانی کرنے گئی ہے۔ اسی طرح موقع پا کر ان کی آتش عشق کو مشتعل کرتی رہتی تھی۔

جان سیوک نے نادم ہو کر کہا۔ ''میں کیا جانتا تھا کہ یہ حضرت بھی دغا دیں گے۔ یہاں ان کی بڑی شہرت ہے۔ اپنے قول کے پکے سمجھے جاتے ہیں۔ خیر کچھ مضائقہ

نہیں۔اب کوئی دوسری تدبیر سوچنی پڑے گی۔''

مسز سیوک: میں مسٹر کلارک سے کہوں گی۔پادری صاحب سے سفارش کراؤں گی۔

جان سیوک: مسٹر کلارک کو میونسپلٹی کے معاملات میں دخل دینے کا اختیار نہیں ہے۔

جان سیوک اسی اندیشہ میں غرق تھے کہ ان کو ہنگامہ کی خبر ملی۔سناٹے میں آ گئے۔ پولیس میں رپورٹ کی۔دوسرے روز گودام جانے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ طاہر علی لاٹھی ٹیکتے ہوئے آ پہنچے۔آتے ہی ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔یکہ کے ہچکولوں نے ادھ موا سا کر دیا تھا۔

مسز سیوک نے انگریزی میں کہا: کیسی صورت بنا لی ہے۔گویا مصیبت کا پہاڑ پھٹ پڑا ہے۔

جان سیوک: کہیے منشی جی! معلوم ہوتا ہے آپ کے سخت چوٹ آئی۔مجھے اس کا بے حد افسوس ہے۔

طاہر: حضور کچھ نہ پوچھیے۔کم بختوں نے مار ڈالنے میں کوئی کسر نہ رکھ چھوڑی تھی۔

جان سیوک: اور انہیں مفسدوں کی آپ مجھ سے سفارش کر رہے تھے!

طاہر: حضور! اپنی خطا کی خوب سزا پا چکا۔مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے میری گردن کی ہڈی پر ضرب آ گئی ہے۔

جان سیوک: یہ آپ کی خام خیالی ہے۔ہڈی ٹوٹ جانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔آپ یہاں کسی طرح نہ آ سکتے تھے۔چوٹ ضرور آئی ہے مگر دو چار روز مالش کر لینے سے صحت ہو جائے گی۔آخر یہ مار پیٹ ہوئی کیوں؟

طاہر: حضور! یہ سب اسی شیطان بجرنگی اہیر کی حرکت ہے۔

جان سیوک: مگر مضروب ہو جانے ہی سے آپ جرم سے بری نہیں ہو سکتے۔میں

اس کو آپ کی نادانی اور بے احتیاطی سمجھتا ہوں۔ آپ ایسے لوگوں سے الجھے ہی کیوں؟ آپ کو معلوم ہے۔ اس میں میری کتنی بدنامی ہے؟

طاہر: میری طرف سے تو کوئی زیادتی نہیں ہوئی۔

جان سیوک: ضرور ہوئی ورنہ دیہاتیوں کے آدمی کسی سے چھیڑ کر لڑنے نہیں آتے۔ آپ کو اس طرح رہنا چاہیے کہ لوگوں پر آپ کا رعب رہے۔ یہ نہیں کہ چھوٹے چھوٹے آدمیوں کو آپ سے مار پیٹ کرنے کی ہمت ہو۔

مسز سیوک: کچھ نہیں۔ یہ سب ان کی کمزوری ہے۔ کوئی راہ چلتے کسی کو نہیں مارتا۔

ایشور سیوک کرسی پر پڑے پڑے بولے: خدا کے بیٹے! مجھے اپنے سایہ میں لے۔ سچے دل سے اس کی بندگی نہ کرنے کی یہی سزا ہے۔

طاہر علی کو یہ باتیں زخم پر نمک کی طرح معلوم ہوئیں۔ ایسا غصہ آیا کہ اسی وقت کہہ دوں۔ جہنم میں جائے تمہاری نوکری، لیکن جان سیوک کو ان کی خستہ حالی سے فائدہ اٹھانے کی ایک تدبیر سوجھ گئی۔ فٹن تیار کرائی اور طاہر علی کو لیے ہوئے راجہ مہیندر کمار کے مکان پر جا پہنچے۔ راجہ صاحب شہر کا گشت لگا کر مکان پر پہنچے ہی تھے کہ جان سیوک کا کارڈ ملا۔ کچھ جھنجھلائے، لیکن مروت دامن گیر ہوئی۔ باہر نکل آئے۔ مسٹر سیوک نے کہا "معاف کیجیے گا۔ میں نے آپ کو بے وقت تکلیف دی مگر پانڈے پور والوں نے اتنا فساد برپا کر رکھا ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ کے سوا کس کا دامن پکڑوں۔ کل سب نے مل کر گودام پر حملہ کر دیا۔ شاید آگ لگا دینا چاہتے تھے، پر آگ تو نہ لگا سکے۔ ہاں یہ میرے ایجنٹ ہیں۔ بس سب کے سب ان پر ٹوٹ پڑے۔ ان کو اور ان کے بھائیوں کو مارتے مارتے بے دم کر دیا۔ اتنے پر بھی ان کو تسکین نہ ہوئی۔ زنانہ مکان میں گھس گئے اور اگر عورتیں اندر سے دروازہ نہ بند کر لیں تو ان کی آبروریزی میں کوئی شک نہ تھا۔ ان کو تو ایسی چوٹیں لگی ہیں کہ شاید مہینوں تک چلنے پھرنے کے قابل نہ ہوں۔ کندھے کی ہڈی ہی ٹوٹ گئی ہے۔"

مہیندر رماّر سنگھ عورتوں کی بہت عزت کرتے تھے۔ان کی بے عزتی ہوتے دیکھ کر طیش میں آجاتے تھے۔غضب ناک ہو کر بولے۔"سب زنانہ میں گھس گئے؟"

جان سیوک: کواڑ توڑنا چاہتے تھے مگر چماروں نے دھمکایا تو ہٹ گئے۔

مہیندر رمار: کمینے!عورتوں پر ظلم کرنا چاہتے تھے!

جان سیوک: یہی تو اس ڈراما (ناٹک) کا سب سے زیادہ شرمناک حصہ ہے۔

مہیندر رمار: شرم ناک نہیں۔صاحب! قابل نفرین کہیے۔

جان سیوک: اب یہ بے چارے کہتے ہیں کہ یا تو میرا استعفیٰ لیجیے یا گودام کی حفاظت کے لیے چوکیداروں کا بندوبست کیجیے۔عورتیں اس قدر خوف زدہ ہیں کہ وہاں ایک منٹ بھی نہیں رہنا چاہتیں۔یہ ساری باتیں اسی اندھے کی بدولت ہو رہی ہیں۔

مہیندر رمار: مجھے تو وہ بہت ہی غریب اور سیدھا سا آدمی معلوم ہوتا ہے مگر ہے چھٹا ہوا! میں نے اسی کی بیچارگی پر ترس کھا کر تجویز کیا تھا کہ آپ کے لیے کوئی دوسری زمین تلاش کروں، لیکن جب ان لوگوں نے شرارت پر کمر باندھی ہے اور آپ کو وہاں سے جبراً ہٹانا چاہتے ہیں تو اس کی سزا انہیں ضرور ملے گی۔

جان سیوک: بس یہی بات ہے۔وہ لوگ مجھے وہاں سے نکال دینا چاہتے ہیں۔ اگر رعایت کی گئی تو میرے گودام میں ضرور آگ لگا دیں گے۔

مہیندر رمار: میں خوب سمجھ رہا ہوں۔یوں میں خود جمہوریت کا دلدادہ ہوں اور اس کے اصول کی دل و جان سے حمایت کرتا ہوں، لیکن جمہوریت کے نام پر ملک میں جو بدامنی پھیلی ہوئی ہے، اس کا میں ایک زبردست مخالف ہوں۔ایسی جمہوریت سے تو سرمایہ داری یا شخصی اقتدار وغیرہ سبھی بہتر ہیں۔آپ مطمئن رہیے۔

اسی طرح کچھ دیر اور باتیں کر کے اور راجہ صاحب کو خوب بھر کے جان سیوک رخصت ہوئے۔راستہ میں طاہر علی سوچنے لگے۔صاحب کو میری بد حالی سے اپنا

کام نکالنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہوا۔ کیا ایسے صاحب ثروت، باعزت، ذہین اور ذی علم لوگ ایسے خودغرض ہوتے ہیں؟

جان سیوک نے قیافہ سے ان کے خیالات کو معلوم کر لیا۔ بولے۔ ''آپ سوچ رہے ہوں گے۔ میں نے اس قدر مبالغہ اور رنگ آمیزی کیوں کی۔ صرف سانحہ کا واقعہ حال ہی کیوں نہ بیان کیا، لیکن سوچیے کہ کیا ایسی صورت میں مجھے یہ نتیجہ حاصل ہو سکتا؟ دنیا میں کسی کام کا اچھا یا برا ہونا محض کامیابی پر محمول ہے۔ ایک شخص حکومت سے بغاوت کرتا ہے۔ اگر حکام نے اس پر تشدد کرنے کا موقع پا لیا تو وہ باغی کہا جاتا ہے اور سزائے موت پاتا ہے۔ اگر اس کا مقصد پورا ہو گیا تو وہ اپنے ملک کا نجات دہندہ اور فاتح سمجھا جاتا ہے اور اس کی یادگاریں قائم کی جاتی ہیں۔ کامیابی میں عیوب کے مٹا دینے کی عجیب قوت ہے۔ آپ جانتے ہیں دو سال پہلے مصطفیٰ کمال نے کیا تھا؟ باغی! ملک اس کے خون کا پیاسا تھا۔ آج وہ اپنی قوم کا روح رواں ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ کامیاب ہوا۔ لینن کئی سال قبل اپنی جان کے خوف سے امریکہ بھاگ گیا تھا۔ آج وہ جمہور روس کا پریذیڈنٹ ہے۔ یہ محض اس لیے کہ اس کی بغاوت کامیاب ہوئی۔ میں نے راجہ صاحب کو طرفدار بنا لیا پھر مبالغہ کا عیب کہاں رہا؟''

اتنے میں فٹن بنگلہ پر آ پہنچی۔ ایشور سیوک نے آتے ہی پوچھا۔ ''کہو کیا کر آئے؟''

جان سیوک نے فخر سے کہا۔ ''راجہ کو اپنا مرید بنا لیا۔ تھوڑی سی رنگ آمیزی تو ضرور کرنی پڑی، پر اس کا اثر بہت اچھا ہوا۔''

ایشور سیوک: خدا تجھ پر رحم کی نگاہ رکھے۔ بیٹا! رنگ آمیزی بغیر بھی دنیا کا کوئی کام چلتا ہے؟ کامیابی کی یہی کنجی ہے اور تجارتی کامیابی کے لیے تو اس کا ہونا اور بھی ضروری ہے۔ آپ کے پاس اچھی سے اچھی چیز ہے۔ جب تک آپ اس کی

تعریف نہیں کرتے، کوئی گاہک کھڑا ہی نہیں ہوتا۔ اپنے عمدہ مال کو لاجواب نایاب وغیرہ کہنا بے جا نہیں۔ اپنی دوا کو آب حیات اکسیر زندگی بخش تیر بہدف جو بھی چاہیں آپ کہہ سکتے ہیں۔ اس میں کوئی عیب نہیں۔ کسی واعظ سے پوچھو۔ کسی وکیل سے پوچھو۔ کسی مضمون نگار سے پوچھو۔ سبھی ایک آواز سے یہی کہیں گے کہ رنگ آمیزی اور کامیابی مترادف ہیں۔ یہ وہم ہے کہ مصور ہی کو رنگ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب تو تمہیں یقین ہو گیا کہ وہ زمین مل جائے گی؟

جان سیوک: جی ہاں۔ اب کوئی شبہ نہیں ہے۔

یہ کہہ کر انہوں نے پربھو سیوک کو پکارا اور حقارت آمیز لہجہ میں بولے۔ ''بیٹھے بیٹھے کیا کر رہے ہو؟ ذرا پانڈے پور کیوں نہیں چلے جاتے؟ اگر تمہارا یہی حال رہا تو میں کہاں تک تمہاری مدد کرتا رہوں گا۔''

پربھو سیوک: مجھے جانے میں کوئی عذر نہیں مگر اس وقت مجھے صوفی کے پاس جانا ہے۔

جان سیوک: پانڈے پور سے لوٹتے ہوئے صوفی کے پاس بہت آسانی سے جا سکتے ہو۔

پربھو سیوک: میں صوفی سے ملنا زیادہ ضروری خیال کرتا ہوں۔

جان سیوک: تمہارے روز روز ملنے سے کیا فائدہ، جب تم آج تک اسے یہاں لانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

پربھو سیوک کے منہ سے یہ الفاظ نکلتے نکلتے رہ گئے۔ ماما نے جو آگ لگا دی ہے، وہ میرے بجھائے نہیں بجھ سکتی۔ وہ فوراً اپنے کمرہ میں گئے۔ کپڑے پہنے اور اسی وقت طاہر علی کے ساتھ پانڈے پور جانے کو تیار ہو گئے۔ گیارہ بج چکے تھے۔ زمین سے آگ کی لپٹ نکل رہی تھی۔ دوپہر کا کھانا تیار تھا۔ میز لگا دی گئی تھی، لیکن پربھو سیوک والدین کے بے حد اصرار پر بھی کھانے کی میز پر نہ بیٹھے۔ طاہر علی خدا سے دعا

کر رہے تھے کہ کسی طرح دوپہر یہیں کٹ جائے۔ پنکھوں کے نیچے خس کی ٹٹیوں سے چھن کر آنے والی ٹھنڈی ہوا نے ان کے درد کو بہت کم کر دیا تھا، لیکن پر بھو سیوک کی ضد نے ان کو لطف اندوزی سے محروم ہی رکھا۔

(11)

بھیرو پاسی اپنی ماں کا سپوت بیٹا تھا۔ حتی الامکان اسے آرام سے رکھنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ اس خیال سے کہ کہیں بہو اپنی ساس کو بھوکا نہ رکھے وہ اسکی تھالی اپنے سامنے پر سالیا کرتا اور اس کو اپنے ساتھ ہی بٹھا کر کھانا کھلاتا تھا۔ بڑھیا تمباکو پیتی تھی۔ اس کے واسطے ایک پیتل سے منڈھا ہوا خوب صورت ناریل لایا تھا۔ آپ چاہے زمین پر سوئے، پر اس کو کھاٹ پر سلاتا تھا۔ کہتا کہ اس نے نہ جانے کتنی تکلیف برداشت کر کے مجھے پالا پوسا ہے۔ میں اس سے جیتے جی کبھی ارن نہیں ہو سکتا۔ اگر ماں کا سر بھی کبھی درد کرتا تو بے چین ہو جاتا۔ اچھے سیانے بلا لاتا۔ بڑھیا کو کپڑے گہنے کا بھی شوق تھا۔ شوہر کے راج میں جو آرام نہ ملا تھا، اسے بیٹے کے راج میں حاصل کرنا چاہتی تھی۔ بھیرو نے اس کے لیے ہاتھوں کے کڑے اور گلے کی ہنسلی اور ایسی ہی کئی چیزیں بنوا دی تھیں۔ پہننے کے لیے موٹے کپڑے کے بجائے کوئی رنگین چھینٹ لایا کرتا تھا۔ اپنی بیوی کو تاکید کرتا رہتا کہ ماں کو کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔ اس طرح بڑھیا کے مزاج میں کچھ رعونت آ گئی تھی۔ ذرا سی کوئی بات طبیعت کے خلاف ہوتی تو روٹھ جاتی اور بہو کو آڑے ہاتھوں لیتی۔ بہو کا نام سوبھاگی تھا۔ بڑھیا نے اس کا نام ابھاگی رکھ چھوڑا تھا۔ بہو نے ذرا چلم بھرنے میں دیر کی۔ چارپائی بچھانا بھول گئی یا منہ سے نکلتے ہی ان کے پیر دبانے یا سر کی جوئیں نکالنے نہ آ پہنچی تو بڑھیا اس کے سر ہو جاتی۔ اس کے باپ اور بھائیوں کے منہ کو کالا بناتی۔ سبھوں کی داڑھیاں جلاتی اور اسے گالیوں سے صبر نہ ہوتا بلکہ جوں ہی بھیرو دکان سے آتا تو ایک ایک کی سو سو لگاتی۔ بھیرو سنتے ہی آگ ہو جاتا۔ کبھی جلی کٹی باتوں

سے اور کبھی ڈنڈے سے بیوی کی خبر لیتا۔ جگدھر سے اس کی گہری دوستی تھی۔ اگرچہ بھیرو کا گھر آبادی کے مغربی سرے پر تھا اور جگدھر کا مشرقی سرے پر، لیکن جگدھر کے یہاں زیادہ آمدورفت تھی۔ یہاں مفت تاڑی پینے کو مل جاتی تھی جسے مول لینے کے لیے اس کے پاس پیسہ نہ تھا۔ اس کے گھر میں کھانے والے بہت تھے اور کمانے والا تنہا وہی تھا۔ پانچ لڑکیاں تھیں۔ ایک لڑکا اور ایک بیوی۔ خوانچہ سے اتنا نفع کہاں کہ اتنے پیٹ بھرے اور تاڑی شربت بھی پیے؟ یہ بھیرو کی ہاں میں ہاں ملایا کرتا تھا اس لیے سوبھاگی اس سے جلتی تھی۔

دو تین برس پہلے کی بات ہے، ایک رات کو بھیرو اور جگدھر بیٹھے ہوئے تاڑی پی رہے تھے۔ جاڑوں کے دن تھے۔ بڑھیا کھاپی کر انگیٹھی سامنے رکھے آگ تاپ رہی تھی۔ بھیرو نے سوبھاگی سے کہا۔ ''تھوڑے سے مٹر بھون لا۔ نمک، مرچ، پیاز بھی لیتی آنا۔'' تاڑی کے لیے گزک کی ضرورت تھی۔ سوبھاگی نے مٹر تو بھونے، لیکن پیاز گھر میں نہ تھا۔ ہمت نہ پڑی کہ کہہ دے ''پیاز نہیں ہے۔'' دوڑی ہوئی کنجڑے کی دکان پر گئی۔ کنجڑا دکان بند کر چکا تھا۔ سوبھاگی نے بہت خوشامد کی، پر اس نے دکان نہ کھولی۔ مجبوراً اس نے بھنے ہوئے مٹر لاکر بھیرو کے سامنے رکھ دیئے۔ بھیرو نے پیاز نہ دیکھا تو تیور بدلے۔ بولا۔ ''کیا مجھے بیل سمجھتی ہے کہ بھونے ہوئے مٹر لاکر رکھ دیئے؟ پیاز کیوں نہیں لائی؟''

سوبھاگی نے کہا۔ ''پیاز گھر میں نہیں ہے تو کیا میں پیاز ہو جاؤں؟''

جگدھر: پیاز کے بغیر کیا مٹر اچھے لگیں گے۔

بڑھیا: پیاج تو ابھی کل ہی دھیلے کی آئی تھی۔ گھر میں کوئی چیز تو بچتی ہی نہیں۔ نہ جانے اس چڑیل کا پیٹ ہے یا بھاڑ۔

سوبھاگی: مجھ سے کسم (قسم) لے لو جو پیاج ہاتھ سے بھی چھوئی ہو۔ ایسی جبان (زبان) ہوتی تو اس گھر میں ایک دن بھی نباہ نہ ہوتا۔

بھیرو: پیاز نہیں تھے لائی کیوں نہیں۔

جگدھر: جو چیز گھر میں نہ رہے اس کی فکر رکھنی چاہیے۔

سوبھاگی: میں کیا جانتی تھی کہ آج آدھی رات کو پیاز کی دھن سوار ہوگی۔

بھیرو تاڑی کے نشہ میں تھا۔ نشہ میں بھی غصہ کی خاصیت ہے۔ کمزوروں ہی پر اترتا ہے۔ ڈنڈا پاس ہی رکھا تھا۔ اٹھا کر ایک ڈنڈا سوبھاگی کو مارا۔ اس کے ہاتھ کی سب چوریاں ٹوٹ گئیں۔ وہ گھر سے بھاگی۔ بھیرو پیچھے دوڑا۔ سوبھاگی ایک دکان کی آڑ میں چھپ گئی۔ بھیرو نے ڈھونڈا، جب نہ پایا تو گھر جا کر کواڑ بند کر لیے اور پھر رات بھر خبر نہ لی۔ سوبھاگی نے سوچا کہ اس وقت جاؤں گی تو جان کی خیر نہیں لیکن رات بھر رہوں گی کہاں؟'' وہ بجرنگی کے گھر گئی اس سے کہا۔ ''نا بابا میں یہ روگ نہیں پالتا۔ کھوٹا آدمی ہے، کون اس سے لڑائی مول لے؟ ٹھاکر دین کا دروازہ بند تھا۔ سورداس کھانا پکا رہا تھا۔ سوبھاگی اس کی جھونپڑی میں گھس گئی اور بولی۔ ''سورداس آج کی رات مجھے یہیں پڑا رہنے دو مارے ڈالتا ہے ابھی جاؤں گی تو ایک ہڈی بھی نہ بچے گی۔''

سورداس نے کہا۔ ''آؤ پڑ رہو۔ سویرے چلی جانا، ابھی نشہ میں ہوگا۔''

دوسرے روز جب بھیرو کو یہ بات معلوم ہوئی تو سورداس سے خوب گالی گلوچ کی اور مارنے کی بھی دھمکی دی۔ سوبھاگی اسی وقت سے سورداس پر مہربانی کرنے لگی۔ جب فرصت پاتی تو اس کے پاس آ بیٹھتی۔ کبھی کبھی اس کے گھر میں جھاڑو لگا جاتی۔ کبھی گھر والوں کی آنکھ بچا کر اس کو کچھ دے جاتی۔ مٹھوا کو اپنے گھر لے جاتی اور اسے گڑ چبنا دیتی۔

بھیرو نے کئی بار اس کو سورداس کے گھر سے نکلتے دیکھا۔ جگدھر نے دونوں کو باتیں کرتے ہوئے پایا۔ بھیرو کے دل میں شک ہو گیا کہ ضرور ان دونوں میں سانٹھ گانٹھ ہے۔ جبھی سے وہ سورداس سے خار کھاتا تھا۔ اس سے چھیڑ کر لڑتا، پر نا یک

رام کے خوف سے اس کو مار نہ سکتا تھا۔ سو بھاگی پر اس کی سختیاں روز بروز زیادہ ہوتی جاتی تھیں اور جگدھر اپنی نرم مزاجی کے باوجود بھی بھیرو کی طرف داری کرتا۔

جس دن بجرنگی اور طاہر علی میں جھگڑا ہوا تھا۔ اسی دن بھیرو اور سورداس میں بھی ہنگامہ آرائی ہوئی۔ بڑھیا دوپہر کو نہائی تھی۔ سو بھاگی اس کی دھوتی دھونا بھول گئی۔ گرمی کا موسم تھا ہی۔ رات کو 9 بجے بڑھیا کو پھر گرمی معلوم ہوئی۔ گرمیوں میں روز دو مرتبہ نہاتی تھی اور جاڑوں میں دو مہینے میں ایک مرتبہ۔ جب وہ نہا کر دھوتی مانگنے لگی تو سو بھاگی کو یاد آئی۔ کاٹو تو لہو نہ تھا بدن میں۔ ہاتھ جوڑ کر بولی۔ ''آج دھوتی دھونے کو بھول گئی۔ تم ذرا دیر میری دھوتی پہن لو تو میں اسے دھو کر ابھی سکھائے دیتی ہوں۔''

بڑھیا اس قدر متحمل مزاج نہ تھی۔ اس نے بہو کو ہزاروں گالیاں دیں اور گیلی دھوتی پہنے بیٹھی رہی۔ اتنے میں بھیرو دکان سے آیا اور سو بھاگی سے بولا۔ ''جلدی کھانا لا۔ آج سنگت ہونے والی ہے اور اماں تم بھی کھالو۔''

بڑھیا بولی: نہا کر گیلی دھوتی پہنے بیٹھی ہوں۔ اب اپنے ہاتھوں دھولیا کروں گی۔

بھیرو: کیا اس نے دھوتی نہیں دھوئی؟

بڑھیا: وہ اب میری دھوتی کیوں دھونے لگی؟ گھر کی مالکن ہے۔ یہ کیا کم ہے کہ ایک روٹی کھانے کو دے دیتی ہے۔

سو بھاگی نے بہت کچھ معذرت کی، پر بھیرو نے ایک نہ سنی۔ ڈنڈا لے کر مارنے کو دوڑا۔ سو بھاگی بھاگی اور آ کر سورداس کے گھر میں گھس گئی۔ پیچھے پیچھے بھیرو بھی وہیں پہنچا۔ جھونپڑے میں گھسا اور چاہتا تھا کہ سو بھاگی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لے کہ سورداس اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ''کیا بات ہے بھیرو، اسے کیوں مار رہے ہو؟''

بھیرو گرم ہو کر بولا۔ ''دروازہ سے ہٹ جاؤ نہیں تو پہلے تمہاری ہی ہڈیاں توڑ دوں گا۔ ساری بگلا بھگتی نکل جائے گی۔ بہت دنوں سے تمہارا رنگ دیکھ رہا ہوں۔ آج

ساری کسر نکال دوں گا۔''

سورداس: تم نے میرا کیا رنگ دیکھا؟ بس یہی نا کہ میں نے سوبھاگی کو گھر سے نکال نہیں دیا؟

بھیرو: بس اب چپ ہی رہنا۔ ایسے پاپی نہ ہوتے تو بھگوان نے آنکھیں کیوں پھوڑ دی ہوتیں۔ بھلا چاہتے ہو تو سامنے سے ہٹ جاؤ۔

سورداس: میرے گھر میں تم اسے نہ مارنے پاؤ گے۔ یہاں سے چلی جائے تو جتنا جی چاہے مار لینا۔

بھیرو: ہٹتا ہے آگے سے کہ نہیں؟

سورداس: میں اپنے گھر میں یہ اودھم نہ مچانے دوں گا۔

بھیرو نے غصے میں آکر سورداس کو دھکا دیا۔ بیچارہ بے سہارے کھڑا تھا، گر پڑا۔ پر پھر اٹھا اور بھیرو کی کمر پکڑ کر بولا۔ ''اب چپکے سے چلے جاؤ نہیں تو اچھا نہ ہوگا۔''

سورداس تھا تو دبلا پتلا، پر اس کی ہڈیاں لوہے کی تھیں۔ بادل بوندی، سردی گرمی جھیلتے جھیلتے اس کے اعضا سخت اور مضبوط ہو گئے تھے۔ بھیرو کو ایسا معلوم ہونے لگا گویا کوئی آہنی شکنجہ ہے۔ بہت زور مارتا تھا مگر شکنجہ ذرا ڈھیلا نہ ہوتا تھا۔ سوبھاگی نے موقع پایا تو بھاگی۔ اب بھیرو زور زور سے گالیاں دینے لگا۔ محلّہ والے شور سن کر آ پہنچے۔ نایک رام نے مذاقاً کہا۔ ''سورداس۔ اچھی صورت دیکھ کر آنکھیں کھل جاتیں ہیں کیا؟ محلّہ ہی میں؟''

سورداس: پنڈا جی تمہیں دل لگی سوجھی ہے اور یہاں منہ میں کالک لگائی جا رہی ہے۔ اندھا تھا، اپاہج تھا، بھکاری تھا، نیچ تھا، پر چوری بدمعاشی کے الجام (الزام) سے بچا ہوا تھا۔ آج وہ الجام بھی لگ گیا۔

بجرنگی: آدمی جیسا آپ ہوتا ہے، ویسا ہی دوسروں کو بھی سمجھتا ہے۔

بھیرو: تم کہاں کے بڑے سادھو ہو؟ ابھی آج ہی لاٹھی چلا کر آئے ہو۔ میں دو

سال سے دیکھ رہا ہوں۔ میری گھر والی اس سے آکر اکیلے میں گھنٹوں باتیں کرتی ہے۔ جگدھر نے بھی اس کو یہاں سے رات میں آتے جاتے دیکھا ہے۔ آج ابھی اسی کے پیچھے مجھ سے لڑنے پر تیار تھا۔

نایک رام: شبہ ہونے کی بات ہی ہے۔ اندھا آدمی دیوتا تھوڑا ہی ہوتا ہے اور پھر دیوتا لوگ بھی تو کام دیو کے بان سے نہیں بچے۔ سورداس تو پھر آدمی ہے اور ابھی عمر ہی کیا ہے۔

ٹھاکر دین: مہاراج! کیوں اندھے کے پیچھے پڑے ہوئے ہو؟ چلو کچھ بھجن کیرتنا ہو۔

نایک رام: تمہیں بھجن کی سوجھتی ہے۔ یہاں ایک بھلے آدمی کی عزت کا معاملہ آ پڑا ہے۔ بھیرو! ہماری ایک بات مانو تو کہیں۔ تم سوبھاگی کو مارتے بہت ہو۔ اس سے اس کا دل تم سے نہیں ملتا۔ ابھی دوسرے دن باری آتی ہے۔ اب مہینہ میں دوبار سے زیادہ نہ آنے پاوے۔

بھیرو دیکھ رہا تھا کہ مجھے لوگ بنا رہے ہیں۔ بگڑ کر بولا۔ ''اپنی عورت ہے، مارتے پیٹتے ہیں تو کسی کا ساجھا ہے۔ جو گھوڑے پر کبھی سوار ہی نہیں ہوا وہ دوسرے کو سوار ہونا کیا سکھائے گا۔ وہ کیا جانے عورت کیسے قابو میں رہتی ہے۔''

یہ طنز نایک رام پر تھا، جس کی شادی ہنوز نہیں ہوئی تھی۔ گھر میں دولت تھی۔ ججمانوں کی بدولت کسی بات کی فکر نہ تھی پھر بھی نہ جانے کیوں اس کی شادی ابھی تک نہ ہوئی تھی۔ وہ ہزار پانچ سو روپے سے غم کھانے کو تیار تھا، لیکن کہیں ڈول نہ لگتا تھا۔ بھیرو نے سمجھا تھا نایک رام دل میں کٹ جائیں گے مگر وہ چھٹا ہوا شہری گنڈا۔ ایسے طنزوں کو کب خیال میں لاتا تھا۔ بولا ''کہو بجرنگی! اس کا کچھ جواب دو۔ عورت کیسے بس میں رہتی ہے؟''

بجرنگی: مار پیٹ سے ننھا سا لڑکا تو بس میں آتا نہیں۔ عورت کیا بس میں آئے گی؟

بھیرو: بس میں تو آئے عورت کا باپ۔ عورت کس کھیت کی مولی ہے۔ مارے بھوت بھاگتا ہے۔

بجرنگی: تو عورت بھی بھاگ جائے گی مگر قابو میں نہ آئے گی۔

نایک رام: بہت اچھی کہی بجرنگی۔ بہت پکی کہی، واہ واہ۔ مارے بھوت بھاگتا ہے تو عورت بھی بھاگ جائے گی۔ اب تو کٹ گئی تمہاری بات۔

بھیرو: بات کیا کٹ جائے گی دل لگی ہے؟ چونے کو جتنا ہی کوٹو اتنا ہی چمٹتا ہے۔

جگدھر: یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ عورت اپنی طبیعت سے بس میں آتی ہے اور کسی طرح نہیں۔

نایک رام: کیوں بجرنگی نہیں ہے کوئی جواب؟

ٹھاکردین: پنڈا جی تم دونوں کو لڑا کر تبھی آرام لو گے۔ بیچارے اپاہج آدمی کے پیچھے پڑے ہو۔

نایک رام: تم سورداس کو کیا سمجھتے ہو۔ یہ دیکھنے ہی میں اتنے دبلے ہیں۔ ابھی ہاتھ ملاؤ تو معلوم ہو بھیرو! اگر انہیں پچھاڑ دو تو پانچ روپے انعام دوں۔

بھیرو: نکل جاؤ گے۔

نایک رام: نکلنے والے کو کچھ کہتا ہوں۔ یہ دیکھو ٹھاکردین کے ہاتھ میں رکھے دیتا ہوں۔

جگدھر: کیا تاکتے ہو بھیرو؟ لے پڑو۔

سورداس: میں نہیں لڑتا۔

نایک رام: سورداس! دیکھو نام ہنسائی مت کراؤ۔ مرد ہو کر لڑنے سے ڈرتے ہو۔ ہار ہی جاؤ گے یا اور کچھ؟

سورداس: لیکن بھائی، میں داؤ پیچ نہیں جانتا۔ پیچھے سے یہ نہ کہنا کہ ہاتھ کیوں پکڑا۔ میں جیسے چاہوں لڑوں گا۔

جگدھر: ہاں ہاں تم جیسے چاہنا ویسے لڑنا۔

سورداس: اچھا تو آؤ کون آتا ہے؟

نایک رام: اندھے آدمی کا جیوٹ دیکھنا۔ چلو بھیرو۔ آؤ میدان میں۔

بھیرو: اندھے سے کیا لڑوں!

نایک رام: بس اسی پر اتنا اکڑتے تھے؟

جگدھر: نکل آؤ بھیرو۔ ایک جھپٹ میں تو مار لوگے۔

بھیرو: تمہیں کیوں نہیں لڑ جاتے؟ تمہیں انعام لے لینا۔

جگدھر کو روپوں کی ہمیشہ فکر رہتی تھی۔ کنبہ بڑا ہونے کے سبب کسی طرح چول نہ بیٹھتی تھی۔ گھر میں ایک نہ ایک چیز گھٹی ہی رہتی تھی۔ روپیہ کمانے کی کسی تدبیر کو ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہتا تھا۔ بولا۔ ''کیوں سورداس! ہم سے لڑوگے؟''

سورداس: تمہیں آجاؤ۔ کوئی سہی۔

جگدھر: کیوں پنڈا جی انعام دوگے نا؟

نایک رام: انعام تو بھیرو کے لیے تھا، لیکن کوئی ہرج نہیں۔ ہاں شرط یہ ہے کہ ایک ہی جھپٹ میں گرا دو۔

جگدھر نے دھوتی اوپر چڑھا لی اور سورداس سے لپٹ گیا۔ سورداس نے اس کی ایک ٹانگ پکڑ لی اور اتنے زور سے کھینچا کہ جگدھر دھم سے گر پڑا۔ چاروں طرف سے تالیاں بجنے لگیں۔ بجرنگی بولا۔ ''واہ سورداس واہ۔'' نایک رام نے دوڑ کر اس کی پیٹھ ٹھونکی۔

بھیرو: مجھے تو کہتے تھے ایک ہی جھپٹ میں گرا دوگے۔ اب تم کیسے گر گئے؟

جگدھر: سورداس نے ٹانگ پکڑ لی نہیں تو کیا گرا دیتا۔ وہ اڑنگا مارتا کہ چاروں شانے چت گر جاتا۔

نایک رام: اچھا تو ایک بازی اور ہو جائے۔

جگدھر: ہاں ہاں اب کی دیکھنا۔

دونوں سورماؤں نے پھر زور آزمائی شروع کی۔سورداس نے اب کے جگدھر کا ہاتھ پکڑ کر اتنے زور سے اینٹھا کہ وہ آہ آہ کرتا ہوا زمین پر بیٹھ گیا۔سورداس نے فوراً ہاتھ چھوڑ دیا اور گردن کو دونوں ہاتھوں سے ایسا دبوچا کہ جگدھر کی آنکھیں نکل آئیں۔نایک رام نے دوڑ کر سورداس کو ہٹا دیا۔بجرنگی نے جگدھر کو اٹھا کر بٹھایا اور ہوا کرنے لگا۔بھیرو نے بگڑ کر کہا۔''یہ کوئی کشتی ہے کہ جہاں پکڑ پایا وہیں دھر دبایا۔ یہ تو گنواروں کی لڑائی ہے۔کشتی تھوڑا ہی ہے۔''

نایک رام: یہ بات تو پہلے ہی معلوم ہو چکی تھی۔

جگدھر سنبھل کر اٹھ بیٹھا اور چپکے سے سرک گیا۔بھیرو بھی اس کے پیچھے چلتا ہوا۔ ان کے جانے کے بعد وہاں خوب قہقہے مچے اور سورداس کو خوب خوب شاباشی دی گئی۔سب کو تعجب تھا کہ سورداس جیسا نحیف شخص جگدھر جیسے موٹے تازے آدمی کو کس طرح دبا بیٹھا۔ٹھاکر دین جادو منتر کا قائل تھا۔بولا۔''سورداس پر ضرور کسی دیوتا کا سایہ ہے۔ہم کو بھی بتاؤ سورداس! کون سا منتر جگایا تھا؟''

سورداس: سو منتروں کا منتر ہے ہمت۔یہ روپے جگدھر کو دے دینا،نہیں تو میری بھلائی نہیں ہے۔

ٹھاکر دین: روپے کیوں دے دوں؟ کوئی لوٹ ہے؟ تم نے باجی (بازی) ماری ہے تمھیں کو ملیں گے۔

نایک رام: اچھا سورداس! ایمان سے بتا دو،سوبھاگی کو کس منتر سے بس میں کیا؟ اب تو یہاں سب لوگ اپنے ہی ہیں۔کوئی دوسرا نہیں ہے۔میں بھی کہیں کانپا لگاؤں۔

سورداس نے رقت آمیز لہجہ میں کہا۔''پنڈا جی! اگر تم بھی مجھ سے ایسی باتیں کرو گے تو میں منہ میں کالک لگا کر کہیں نکل جاؤں گا۔میں پرائی عورت کو اپنی ماں،بہن یا

بیٹی سمجھتا ہوں۔ جس دن میرا من اتنا چنچل ہو جائے گا، اس دن تم مجھے جیتا نہ دیکھو گے۔'' یہ کہہ کر سورداس پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ذرا دیر میں آواز سنبھال کر بولا۔ ''بھیرو روز اس کو مارتا ہے۔ بیچاری کبھی کبھی میرے پاس آ کر بیٹھ جاتی ہے۔ میرا قصور اتنا ہی ہے کہ میں اس کو دھتکار نہیں دیتا۔ اس کے لیے چاہے کوئی مجھ کو بدنام کرے، چاہے جو الزام لگائے۔ میرا جو دھرم تھا وہ میں نے کیا۔ بدنامی کے ڈر سے جو آدمی دھرم سے منہ پھیر لے، وہ آدمی نہیں ہے۔

بجرنگی: تمہیں ہٹ جانا تھا، اس کی عورت تھی۔ مارتا چاہے پیٹتا تم سے مطلب!

سورداس: بھیا! آنکھوں دیکھ کر نہیں رہا جاتا۔ یہ تو سنسار کا بیوہار ہے، پر اتنی سی بات پر کوئی اتنا بڑا کلنک تو نہیں لگا دیتا۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں، آج مجھے جتنا دکھ ہو رہا ہے اتنا دادا کے مرنے پر بھی نہ ہوا تھا۔ میں اپاہج دوسروں کے ٹکڑے کھانے والا اور مجھ پر یہ کلنک! (رونے لگا)

نایک رام: تو روتے کیا ہو۔ بھلے آدمی! اندھے ہو تو کیا مرد نہیں ہو۔ مجھ پر تو کوئی ایسا کلنک لگاتا تو میں اور خوش ہوتا۔ یہ ہزاروں آدمی جو تڑکے گنگا نہانے جاتے ہیں، وہاں نظر بازی کے سوا اور کیا کرتے ہیں۔ مندروں میں اس کے سوا اور کیا ہوتا ہے۔ میلوں ٹھیلوں میں بھی یہی بہار رہتی ہے۔ یہی مردوں کا کام ہے۔ اب سرکار کے راج میں لاٹھی تلوار کا تو کہیں نام نہیں رہا۔ ساری مردی اسی نظر بازی میں رہ گئی ہے۔ اس کی کیا چنتا (فکر)۔ چلو بھگوان کا بھجن کرو۔ سب دکھ دور ہو جائے گا۔

بجرنگی کو اندیشہ تھا۔ آج کی مار پیٹ کا نہ جانے کیا پھل ہو۔ کل پولیس دروازہ پر آ جائے گی۔ غصہ حرام ہوتا ہے۔ ایک رام نے تشفی کی۔ ''بھلے آدمی! پولیس سے کیا ڈرتے ہو؟ کہو تھانہ دار کو بلا کر نچاؤں، کہو انسپکٹر کو بلا کر چمپیاؤں۔ بے فکر رہو۔ کچھ نہ ہونے پائے گا۔ تمہارا بال بانکا ہو جائے میرا ذمہ۔''

ہر سہ اشخاص یہاں سے چلے۔ دیا گر پہلے سے ان کی راہ دیکھ رہے تھے۔ کئی

گاڑیاں بان اور بنیے بھی آ بیٹھے تھے۔ ذرا دیر میں بھجن کی باتیں اٹھنے لگیں۔ سورداس اپنے تفکرات بھول گیا۔ مست ہو کر گانے لگا۔ کبھی وجد میں آ کر ناچتا، اچھلنے کودنے لگتا، کبھی روتا اور کبھی ہنستا۔ محفل برخاست ہوئی تو سب لوگ خوش تھے۔ دل صاف تھے، کدورت مٹ گئی تھی۔ گویا کسی دلکش فضا کی سیر کر کے آئے ہوں۔ سورداس تو مندر کے چبوترے ہی پر لیٹا۔ باقی لوگ اپنے اپنے گھر گئے۔ مگر تھوڑی ہی دیر بعد سورداس کو انہیں تفکرات نے پھر آ گھیرا۔ میں کیا جانتا تھا کہ بھیرو کے دل میں میری طرف سے اتنا میل ہے، نہیں تو سوبھاگی کو اپنے جھونپڑے میں آنے ہی کیوں دیتا۔ جو سنے گا وہی مجھ پر تھوکے گا۔ لوگوں کو ایسی باتوں پر کتنی جلدی یقین ہو جاتا ہے۔ محلّہ میں کوئی اپنے دروازہ پر کھڑا نہ ہونے دے گا۔ اونہہ! بھگوان تو سب کے من کی بات جانتے ہیں۔ آدمی کا دھرم ہے کہ جب کسی کو دکھ میں دیکھے تو اسے تسلی دے۔ اگر اپنا دھرم پالنے میں بھی کلنک لگتا ہے تو بھلے ہی لگے۔ اس کے لیے کہاں تک روؤں۔ کبھی نہ کبھی تو لوگوں کو میرے دل کا حال معلوم ہو ہی جائے گا۔

مگر جگدھر اور بھیرو دونوں کے دل میں حسد کی آگ بھڑک رہی تھی۔ جگدھر کہتا تھا۔ ''میں نے تو سمجھا تھا کہ پانچ روپے سہج ہی مل جائیں گے نہیں تو کیا کتے نے کاٹا تھا اس سے بھڑنے جاتا۔ آدمی کا ہے کو ہے لوہا ہے۔''

بھیرو: میں اس کی طاقت آزما چکا ہوں۔ ٹھاکر دین سچ کہتا ہے اسے کسی دیوتا کا اشت ہے۔

جگدھر: اشت وشت کچھ نہیں۔ یہ سب بے فکری ہے۔ ہم تم گرہست کے جنجال میں پھنسے ہوئے ہیں۔ نمک، تیل، لکڑی کی فکر سر پر سوار رہتی ہے۔ گھاٹے نفع کے پھیر میں پڑے رہتے ہیں۔ اس کو کون سی فکر ہے؟ مزہ سے جو کچھ مل جاتا ہے کھاتا ہے اور میٹھی نیند سوتا ہے۔ ہم کو تم کو روٹی دال بھی دونوں بھات (وقت) نصیب نہیں ہوتی۔ اسے کیا کمی ہے۔ کسی نے چاول دیئے۔ کہیں سے مٹھائی پا گیا۔ گھی دودھ

بجرنگی کے گھر سے مل ہی جاتا ہے۔ بل تو کھانے سے ہوتا ہے۔

بھیرو: نہیں یہ بات نہیں ہے۔ نشہ کرنے سے بل کا ناس ہو جاتا ہے۔

جگدھر: کیسی الٹی باتیں کرتے ہو۔ ایسا ہوتا تو فوج میں گوروں کو برانڈی کیوں پلائی جاتی؟ انگریز سبھی شراب پیتے ہیں تو کیا کمزور ہوتے ہیں؟

بھیرو: آج سوبھاگی آئے گی تو گلا گھونٹ دوں گا۔

جگدھر: کسی کے گھر میں چھپی بیٹھی ہوگی۔

بھیرو: اندھے نے میری آبرو بگاڑ دی۔ برادری میں بات پھیلے گی تو حقہ پانی بند ہو جائے گا۔ بھوج دینا پڑے گا۔

جگدھر: تمہیں تو ڈھنڈورا پیٹ رہے ہو۔ یہ نہیں پٹکنی کھائی تھی تو چپکے سے گھر چلے آتے۔ سوبھاگی گھر آتی تو اس سے سمجھ لیتے۔ تم لگے وہیں دہائی دینے۔

بھیرو: اس اندھے کو میں ایسا کپٹی نہ سمجھا تھا نہیں تو اب تک کبھی اس کو مزہ چکھا چکا ہوتا۔ اب اس چڑیل کو گھر میں نہ رکھوں گا۔ چمار کے ہاتھوں یہ بے آبروئی!

جگدھر: اب اس سے بڑی اور کیا بدنامی ہوگی۔ گلا کاٹنے کا کام کیا ہے۔

بھیرو: بس یہی جی میں آتا ہے کہ چل کر ایک گنڈاسا مار کر کام تمام کر دوں، لیکن نہیں میں اسے گھلا گھلا کر ماروں گا۔ سوبھاگی کا دکھ نہیں ہے۔ سارا طوفان اسی عیبی اندھے کا کھڑا کیا ہوا ہے۔

جگدھر: دکھ دونوں کا ہے۔

بھیرو: لیکن چھیڑ چھاڑ تو پہلے مرد ہی کرتا ہے۔ اس سے تو اب مجھے کوئی واسطہ نہیں رہا۔ جہاں چاہے جائے، جیسے چاہے رہے۔ مجھے تو اب اسی اندھے سے بھگتنا ہے۔ صورت سے کیسا گریب (غریب) جان پڑتا ہے، جیسے کچھ جانتا ہی نہیں اور من میں اتنا کپٹ بھرا ہوا ہے۔ بھیک مانگتے دن جاتے ہیں، اس پر بھی ابھاگی کی آنکھیں نہیں کھلتیں۔ جگدھر! اس نے میرا سر نیچا کر دیا۔ میں دوسروں پر ہنسا کرتا تھا۔ اب

دنیا مجھ پر ہنسے گی۔ مجھے سب سے بڑا ملال تو یہ ہے کہ ابھاگن گئی تو چمار کے ساتھ گئی۔ اگر کسی ایسے آدمی کے ساتھ جاتی جو جات پات میں، دیکھنے سننے میں، دھن دولت میں، مجھ سے بڑھ کر ہوتا تو مجھے اتنا رنج نہ ہوتا۔ جو سنے گا اپنے من میں یہی کہے گا کہ میں اس اندھے سے بھی گیا بیتا ہوں۔

جگدھر: عورتوں کا سو بھاؤ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ نہیں تو کہاں تم اور کہاں وہ اندھا۔ منہ پر مکھیاں بھنکا کرتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے جوتے کھا کر آیا ہے۔

بھیرو: اور بے حیا کتنا بڑا ہے۔ بھیک مانگتا ہے۔ اندھا ہے، پر جب دیکھو ہنستا ہی رہتا ہے۔ میں نے اسے کبھی روتے نہیں دیکھا۔

جگدھر: گھر میں روپے گڑے ہیں۔ روئے اس کی بلا۔ بھیک تو دکھانے کی مانگتا ہے۔

بھیرو: اب روئے گا۔ ایسا رلاؤں گا کہ چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا۔

یوں باتیں کرتے کرتے دونوں اپنے اپنے گھر گئے۔ رات کے دو بجے ہوں گے کہ یکا یک سورداس کی جھونپڑی سے آگ کا شعلہ بلند ہوا۔ لوگ اپنے اپنے دروازوں پر سو رہے تھے۔ حالت خواب میں بھی باطنی حواس بیدار رہتے ہیں۔ دم کے دم میں سینکڑوں آدمی جمع ہو گئے۔ آسمان پر سرخی چھائی ہوئی تھی۔ شعلے لپک لپک کر آسمان کی طرف دوڑنے لگے۔ کبھی ان کی صورت کسی مندر کے سنہری کلس کی سی ہو جاتی تھی۔ کبھی وہ ہوا کے جھونکوں سے اس طرح کانپنے لگتے تھے جیسے پانی میں چاند کا عکس۔ آگ بجھانے کی تدبیر کی جا رہی تھی، لیکن جھونپڑے کی آگ آتش حسد کی طرح کبھی نہیں بجھتی۔ کوئی پانی لا رہا تھا۔ کوئی یونہی شور مچا رہا تھا لیکن زیادہ تر لوگ خاموش کھڑے مایوسانہ نظروں سے یہ آگ کا جلنا دیکھ رہے تھے جیسے کسی عزیز یا دوست کی چتا کی آگ ہو۔

دفعتاً سورداس دوڑا ہوا آیا اور چپ چاپ آگ کی روشنی میں کھڑا ہو گیا۔ بجرنگی

نے پوچھا۔ ''یہ آگ کیسے لگی۔ سورداس؟ چولہے میں آگ تو نہیں چھوڑ دی تھی؟''

سورداس: جھونپڑے میں جانے کا کوئی راستہ نہیں ہے؟

بجرنگی: اب تو اندر باہر سب ایک ہو گیا۔ دیواریں جل رہی ہیں۔

سورداس: کسی طرح بھی نہیں جا سکتا؟

بجرنگی: کیسے جاؤ گے؟ دیکھتے نہیں ہو یہاں تک لپٹیں آ رہی ہیں؟

جگدھر: سورداس! کیا آج چولہا ٹھنڈا کیا تھا؟

نایک رام: چولہا ٹھنڈا کیا ہوتا تو دشمنوں کا کلیجا کیسے ٹھنڈا ہوتا؟

جگدھر: پنڈا جی! میرا لڑکا کام نہ آئے اگر مجھے کچھ بھی معلوم ہو۔ تم مجھ پر ناحق شبہ کرتے ہو۔

نایک رام: میں جانتا ہوں جس نے آگ لگائی ہے۔ بگاڑ نہ دوں تو کہنا۔

ٹھاکر دین: تم کیا بگاڑو گے؟ بھگوان آپ ہی بگاڑ دیں گے۔ اسی طرح جب میرے گھر میں چوری ہوئی تھی تو سب سوا ہا ہو گیا تھا۔

جگدھر: جس کے من میں اتنی کھوٹ ہو بھگوان اس کا ستیاناس کر دیں۔

سورداس: اب تو لپٹ نہیں آتی؟

بجرنگی: ہاں پھوس جل گیا ہے، اب دھرن جل رہی ہے۔

سورداس: اب تو اندر جا سکتا ہوں؟

نایک رام: اندر تو جا سکتے ہو، پر باہر نہیں نکل سکتے۔ اب چلو آرام سے سو رہو۔ جو ہونا تھا ہو گیا، پچھتانے سے کیا ہو گا۔

سورداس: ہاں سو رہوں گا، جلدی کیا ہے۔

تھوڑی دیر میں بچی کھچی آگ بھی بجھ گئی۔ خیریت یہ ہوئی کہ اور کسی کے گھر میں آگ نہیں لگی۔ سب لوگ اس سانحہ پر رائے زنی کرتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ سناٹا چھا گیا، لیکن سورداس اب بھی وہیں بیٹھا ہوا تھا۔ اسے جھونپڑے کے جل

جانے کا غم نہ تھا۔ برتن وغیرہ کے بھی جل جانے کا غم نہ تھا۔ غم تھا تو اس پوٹلی کا جو اس کی عمر بھر کی کمائی تھی۔ جس پر اس کی زندگی کی ساری تمناؤں کا انحصار تھا۔ جو اس کی ساری تکلیفوں اور التجاؤں کا ماحصل تھی۔ یہ چھوٹی سی پوٹلی اس کی، اس کے بزرگوں کی، اس کے نام لیوا لوگوں کی نجات کا ذریعہ تھی۔ یہی اس کے لوک اور پرلوک۔ دین و دنیا کی امیدوں کی شمع فروزاں تھی۔ اس نے سوچا۔ ''پوٹلی کے ساتھ روپے تو تھوڑے ہی جل گئے ہوں گے۔ اگر روپے پگھل بھی گئے ہوں گے تو چاندی کہاں جائے گی۔ کیا جانتا تھا کہ آج آفت آنے والی ہے نہیں تو یہیں نہ سوتا۔ پہلے تو کوئی جھونپڑی کے پاس آتا ہی نا اور اگر آگ لگاتا تو پوٹلی کو پہلے ہی نکال لیتا۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے یہاں روپیوں کو رکھنا ہی نہ چاہیے تھا۔ پر رکھتا کہاں؟ محلّہ میں ایسا کون ہے جسے رکھنے کو دیتا۔ ہائے پورے پانچ سو روپے تھے! کچھ پیسے اوپر ہو گئے تھے۔ کیا اسی دن کے لیے پیسے پیسے بٹور رہا تھا۔ کھا لیا ہوتا تو کچھ تسکین ہوتی۔ کیا سوچتا تھا اور کیا ہوا گیا جی جا کر پتروں کو پنڈ دینے کا ارادہ کیا تھا۔ اب ان سے کیسے گلا چھوٹے گا۔ سوچتا تھا کہیں مٹھوا کی سگائی ٹھہر جائے تو کر ڈالوں۔ بہو گھر میں آ جائے تو ایک روٹی کھانے کو ملے۔ اپنے ہاتھوں ٹھونک کر کھاتے ایک جگ بیت گیا۔ بڑی بھول ہوئی۔ چاہیے تھا کہ جیسے جیسے ہاتھ میں روپے آتے۔ ایک ایک کام پورا کرتا جاتا۔ بہت پاؤں پھیلانے کا یہی پھل ہے۔''

اس وقت تک راکھ ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ سورداس اٹکل سے دروازہ کی طرف سے جھونپڑی میں گھسا۔ پر دو تین قدم کے بعد دفعتاً پاؤں بھوبل میں پڑ گیا۔ اوپر راکھ تھی، لیکن نیچے آگ۔ سورداس نے فوراً پاؤں کھینچ لیا اور اپنی لکڑی سے راکھ کو الٹنے پلٹنے لگا کہ نیچے کی آگ بھی جلد راکھ ہو جائے۔ آدھ گھنٹہ میں اس نے ساری آگ نیچے اوپر کر دی اور پھر ڈرتے ڈرتے راکھ میں پیر رکھا۔ راکھ گرم تھی مگر ناقابل برداشت نہ تھی۔ اس نے ٹھیک اسی مقام کی سیدھ میں راکھ ٹٹولنا شروع کیا جہاں

چھپر میں پوٹلی رکھی تھی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ اس کو یقین تھا کہ روپے ملیں یا نہ ملیں، پر چاندی تو کہیں گئی ہی نہیں ہے۔ یکا یک وہ اچھل پڑا۔ کوئی بھاری چیز ہاتھ لگی۔ اسے اٹھالیا، پر ٹٹول کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ اینٹ کا ٹکڑا ہے۔ پھر ٹٹولنے لگا جیسے کوئی شخص پانی میں مچھلیاں ٹٹولے۔ کوئی چیز ہاتھ نہ لگی۔ پھر تو اس نے مایوسانہ عجلت اور اضطراب کے ساتھ ساری راکھ چھان ڈالی۔ ایک ایک مٹھی راکھ ہاتھ میں لے کر دیکھی۔ لوٹا ملا، تو املا، پر پوٹلی نہ ملی۔ اس کا وہ پیر جواب تک سیڑھی پر تھا پھسل گیا اور اب وہ اتھاہ گہرائی میں جا پڑا۔ اس کے منہ سے دفعتاً ایک چیخ نکل گئی۔ وہ وہیں راکھ پر بیٹھ گیا اور زارو قطار رونے لگا۔ یہ پھوس کی راکھ نہ تھی۔ اس کی تمناؤں کی راکھ تھی۔ اپنی بے بسی پر اس کو اتنا رنج کبھی نہ ہوا تھا۔

تڑکا ہو گیا۔ سورداس اب راکھ کے ڈھیر کو سمیٹ کر ایک جگہ جمع کر رہا تھا۔ امید سے زیادہ سخت جان اور کوئی دنیا میں نہیں ہوتی۔

اسی وقت جگدھر آ کر بولا۔ ''سورداس سچ کہنا تمہیں مجھ پر تو شبہ نہیں ہے۔''

سورداس کو شبہ تو تھا، پر اس نے اسے چھپا کر کہا۔ ''تمہارے اوپر کیوں شبہ کروں گا۔ تم سے میری کون سی عداوت تھی؟''

جگدھر: محلّہ تمہیں بھڑکائیں گے۔ پر میں بھگوان کو ساکھشی بنا کر کہتا ہوں کہ میں اس بارے میں کچھ بھی نہ جانتا۔

سورداس: اب تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ کون جانے کسی نے لگا دی یا کسی کی چلم سے اڑ کر لگ گئی۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے چولہے میں آگ رہ گئی ہو۔ بلا جانے بوجھے کس پر سبہا کروں۔

جگدھر: اسی سے تمہیں جتا دیا کہ کہیں سبھے میں میں بھی نہ مارا جاؤں۔

سورداس: تمہاری طرف سے میرا دل صاف ہے۔

جگدھر کو بھیرو کی باتوں سے اب یقین ہو گیا کہ یہ اسی کی شرارت ہے۔ اس نے

سورداس کو رلانے کی بات کہی تھی۔ اس دھمکی کو اس طرح پورا کیا۔ وہ یہاں سے سیدھا بھیرو کے پاس گیا۔ وہ چپ چاپ بیٹھا ناریل پی رہا تھا، لیکن چہرہ سے پریشانی اور بے چینی ظاہر ہو رہی تھی۔ جگدھر کو دیکھتے ہی بولا۔ ''کچھ سنا لوگ کیا بات چیت کر رہے ہیں۔''

جگدھر: سب لوگ تمہارے اوپر سبہا (شبہ) کرتے ہیں۔ نایک رام کی دھمکی تو تم نے اپنے کانوں سنی۔

بھیرو: مجھے ایسی دھمکیوں کی پروا نہیں ہے۔ ثبوت کیا ہے کہ میں نے آگ لگائی؟

جگدھر: سچ کہو۔ تمہیں نے لگائی؟

بھیرو: ہاں چپکے سے ایک دیا سلائی لگا دی۔

جگدھر: میں کچھ کچھ پہلے سمجھ گیا تھا۔ پر یہ تم نے برا کیا۔ جھونپڑی جلانے سے کیا ملا؟ دو چار دن میں پھر وہی جھونپڑی تیار ہو جائے گی۔

بھیرو: کچھ ہو۔ دل کی آگ ٹھنڈی ہو گئی۔ یہ دیکھو!

یہ کہہ کر اس نے ایک تھیلی دکھائی جس کا رنگ دھوئیں سے سیاہ ہو گیا تھا۔ جگدھر نے پوچھا۔ ''اس میں کیا ہے؟ ارے! اس میں تو روپے بھرے ہوئے ہیں۔''

بھیرو: یہ سبھاگی کو بہکا لے جانے کا جریانہ (جرمانہ) ہے۔

جگدھر: سچ بتاؤ یہ روپے کہاں سے ملے؟

بھیرو: اسی جھونپڑی میں بڑے جتن سے دھرن کی آڑ میں رکھے ہوئے تھے۔ پاجی روز راہگیروں کو ٹھگ ٹھگ کر پیسے لاتا تھا اور اسی تھیلی میں رکھتا تھا۔ میں نے گنے ہیں۔ پانچ سو روپے سے اوپر ہیں۔ نہ جانے کیسے اتنے جمع ہو گئے۔ بچہ کو انہیں روپیوں کی گرمی تھی۔ اب گرمی نکل گئی۔ اب دیکھوں کس بل پر اچھلتے۔ برادری کو بھوج دینے کا سامان ہو گیا۔ نہیں تو اس بکھت (وقت) اتنے روپے کہاں ملتے؟ آج دل تو دیکھتے ہو۔ بلم ٹیروں کے مارے بکری کتنی مندی ہے۔

جگدھر: میری تو صلاح ہے کہ روپے اس کو لوٹا دو۔ بڑی مسکت (مشقت) کی کمائی ہے۔ ہضم نہ ہوگی۔

جگدھر دل کا کھوٹا نہیں تھا، پر اس وقت اس نے یہ صلاح نیک نیتی سے نہیں حسد سے دی تھی۔ اسے یہ گوارا نہ تھا کہ بھیرو کے ہاتھ اتنے روپے لگ جائیں۔ بھیرو نصف روپے اسے دے دیتا تو شاید اس کو تسکین ہو جاتی۔ مگر بھیرو سے یہ امید نہ کی جاسکتی تھی۔ بے پروائی سے بولا۔ ''مجھے اچھی طرح ہجم (ہضم) ہو جائے گی۔ ہاتھ میں آئے ہوئے روپے کو لوٹا نہیں سکتا۔ اس نے بھیک ہی مانگ کر تو جمع کیا ہے۔ گیہوں تو نہیں تولا تھا؟''

جگدھر: پولیس سب کھا جائے گی۔

بھیرو: سورداس پولیس میں نہ جائے گا۔ رو دھو کر چپ ہو رہے گا۔

جگدھر: گریب (غریب) کی ہائے بڑی جان لیوا ہوتی ہے۔

بھیرو: وہ گریب ہے! اندھا ہونے ہی سے گریب ہو گیا؟ جو آدمی دوسروں کی عورتوں پر ڈورے ڈالے، جس کے پاس سینکڑوں روپے جمع ہوں جو دوسروں کو روپے ادھار دیتا ہو، وہ گریب ہے؟ گریب جو کہو تو ہم تم ہیں۔ گھر بھر میں ڈھونڈ آؤ۔ ایک پورا روپیہ نہ نکلے گا۔ ایسے پاپیوں کو گریب نہیں کہتے۔ اب بھی میرے دل کا کانٹا نہیں نکلا۔ جب تک اسے روتے نہ دیکھوں گا، یہ کانٹا نہ نکلے گا۔ جس نے میری آبرو بگاڑ دی، اس کے ساتھ جو چاہے کروں۔ مجھے پاپ نہیں لگ سکتا۔

جگدھر کا دل آج خوانچہ لے کر گلیوں کا چکر لگانے میں نہ تھا۔ چھاتی پر سانپ لوٹ رہا تھا۔ اسے دم کی دم اتنے روپے مل گئے۔ اب موج اڑائے گا۔ تقدیر اس طرح کھلتی ہے۔ یہاں کبھی پڑا ہوا پیسہ بھی نہ ملا۔ پاپ پن کی کوئی بات نہیں۔ میں ہی کون دن بھر پن کیا کرتا ہوں۔ دمڑی، چھدام، کوڑیوں کے لیے ٹینی مارتا ہوں۔ باٹ کھوٹے رکھتا ہوں۔ تیل کی مٹھائی گھی کی کہہ کر بیچتا ہوں۔ ایمان گنوانے پر بھی ہاتھ

کچھ نہیں آتا۔ جانتا ہوں یہ برا کام ہے۔ پر بال بچوں کو پالنا بھی تو ضروری ہے۔ اس نے ایمان کھویا تو کچھ لے کر کھویا۔ گناہ بےلذت نہیں رہا۔ اب وہ تین دکانوں کا اور ٹھیکہ لے لے گا۔ ایسا ہی کوئی مال میرے ہاتھ پڑ جاتا تو جنم سپھل ہو جاتا۔

جگدھر کے دل میں حسد نے جگہ کی۔ وہ بھیرو کے گھر سے لوٹا تو دیکھا کہ سورداس راکھ بٹور کر اسے آٹے کی طرح گوندھ رہا ہے۔ سارا جسم راکھ سے، دھنکا ہوا اور پسینہ خوب بہہ رہا ہے۔ بولا۔ ''سورداس! کیا ڈھونڈ تے ہو؟''

سورداس: کچھ نہیں۔ یہاں رکھا ہی کیا تھا۔ یہی لوٹا تو دیکھ رہا تھا۔

جگدھر: اور وہ تھیلی کس کی ہے جو بھیرو کے پاس ہے؟

سورداس چونکا: کیا اسی لیے بھیرو آیا تھا؟ ضرور یہی بات ہے۔ گھر میں آگ لگانے سے پہلے روپے نکال لیے ہوں گے۔

لیکن اندھے بھکاری کے لیے مفلسی اتنی شرم کی بات نہیں ہے جتنی دولت مندی۔ سورداس جگدھر سے اپنے مالی نقصان کو پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا۔ وہ کیا کرنا چاہتا تھا۔ مٹھوا کا بیاہ کرنا چاہتا تھا۔ کنواں بنوانا چاہتا تھا، مگر اس انداز سے کہ لوگوں کو تعجب ہو کہ اس کے پاس روپے کہاں سے آئے اور لوگ یہی سمجھیں کہ بھگوان ہی محتاجوں کی مدد کرتے ہیں۔ بھکاریوں کے لیے دولت کا جمع کرنا گناہ گاری سے کم ذلت کی بات نہیں ہے۔ بولا: ''میرے پاس تھیلی ویلی کہاں ہوگی کسی کی۔ تھیلی ہوتی تو بھیک کیوں مانگتا؟''

جگدھر: مجھ سے اڑتے ہو۔ بھیرو مجھ سے خود کہہ رہا تھا کہ جھونپڑے میں دھرن کے اوپر یہ تھیلی ملی۔ پانچ سو روپے سے کچھ بیسی ہے۔

سورداس: وہ تم سے ہنسی کرتا ہوگا۔ ساڑھے پانچ روپے تو کبھی اکٹھے ہی نہیں ہوئے۔ ساڑھے پانچ سو کہاں سے آئے؟

اتنے میں سوبھاگی وہاں آ پہنچی۔ رات بھر مندر کے پیچھے امرود کے باغ میں چھپی

بیٹھی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ آگ بھیرو نے لگائی ہے۔ بھیرو نے اس پر جو تہمت لگائی تھی۔ اس کی اسے خاص فکر تھی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ کسی کو اس پر یقین نہ آئے گا۔ لیکن میری خاطر سورداس یوں تباہ ہوا۔ اس کا اسے بے حد ملال تھا۔ وہ اس وقت اس کی تشفی کرنے آئی تھی۔ جگدھر کو وہاں کھڑے دیکھا تو جھجکی۔ خوف ہوا کہ کہیں یہ مجھے پکڑ نہ لے۔ جگدھر کو یہ بھیرو ہی کا دوسرا اوتار سمجھتی تھی۔ اس نے عہد کر لیا تھا کہ اب بھیرو کے گھر نہ جاؤں گی۔ الگ رہوں گی اور محنت مزدوری کر کے زندگی بسر کروں گی۔ یہاں کون لڑکے رو رہے ہیں۔ ایک میرا ہی پیٹ اسے بھاری ہے نا۔ اب اکیلے ٹھونکے اور کھائے اور بڑھیا کے پاؤں دھو دھو کر پیے۔ مجھ سے تو یہ نہیں ہو سکتا۔ اتنے دن ہوئے کبھی اس نے اپنی طبیعت سے دھیلے کا سیندور بھی لے کر نہ دیا ہو گا تو میں ہی کیوں اس کے لیے مروں۔

وہ پیچھے لوٹنا ہی چاہتی تھی کہ جگدھر نے پکارا۔ ''سوبھاگی۔ کہاں جاتی ہے؟ دیکھی اپنے کھسم کی کرتوت۔ بے چارے سورداس کو کہیں کا نہ رکھا۔''

سوبھاگی نے سمجھا کہ مجھے جھانسہ دے رہا ہے۔ میرے پیٹ کی تھاہ لینے کے لیے یہ جال پھینکا ہے۔ طنز سے بولی۔ ''اس کے گرو تو تمہیں ہو۔ تمہیں نے منتر دیا ہو گا۔''

جگدھر: ہاں یہی میرا کام ہے۔ چوری ڈاکہ نہ سکھاؤں تو روٹیاں کیونکر چلیں؟

سوبھاگی نے پھر طنز سے کہا۔ ''کیا رات تاڑی پینے کو نہیں ملی۔ کیا؟''

جگدھر: تاڑی کے بدلے کیا اپنا ایمان بیچ دوں گا۔ جب تک سمجھا تھا بھلا آدمی ہے۔ ساتھ بیٹھتا تھا۔ ہنستا بولتا تھا۔ تاڑی بھی پی لیتا تھا۔ کچھ تاڑی کے لالچ سے نہیں جاتا تھا۔ کیا کہنا ہے آپ ایسے ہی دھرماتما تو ہیں، لیکن آج سے جو کبھی اس کے ساتھ بیٹھتے دیکھنا تو کان پکڑ لینا۔ جو آدمی دوسروں کے گھروں میں آگ لگائے۔ گریبوں (غریبوں) کے روپے چرا لے جائے، وہ اگر میرا بیٹا بھی ہو تو اس کی صورت نہ دیکھوں۔ سورداس نے نہ جانے کتنے جتن سے پانچ سو روپے اکٹھے

کیے تھے۔ وہ سب اڑا لے گیا۔ کہتا ہوں لوٹا دو۔ تو لڑنے پر تیار ہوتا ہے!

سورداس: پھر وہی رٹ لگائے جاتے ہو۔ کہہ دیا کہ میرے پاس روپے نہیں تھے کسی اور جگہ سے مار لایا ہوگا۔ میرے پاس پانچ سو روپے ہوتے تو چین کی بنسی نہ بجاتا۔ دوسروں کے سامنے ہاتھ کیوں پسارتا؟

جگدھر: سورداس! اگر تم بھری گنگا میں کہو کہ میرے روپے نہیں ہیں تو میں نہ مانوں گا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے وہ تھیلی دیکھی ہے۔ بھیرو نے اپنے منہ سے کہا ہے کہ یہ تھیلی جھونپڑے میں دھرن کے اوپر ملی۔ تمہاری بات کیسے مان لوں؟

سوبھاگی: تم نے تھیلی دیکھی ہے؟

جگدھر: ہاں دیکھی نہیں تو کیا جھوٹ بولتا ہوں؟

سوبھاگی: سورداس سچ مچ بتا دو۔ روپے تمہارے ہیں؟

سورداس: پاگل ہوگئی ہے کیا؟ ان کی باتوں میں آ جاتی ہے۔ بھلا میرے پاس روپے کہاں سے آئے؟

جگدھر: ان سے پوچھو۔ روپے نہ تھے تو اس وقت راکھ بٹور کر کیا ڈھونڈ رہے تھے؟

سوبھاگی نے سورداس کے چہرہ کی طرف غور سے دیکھا۔ اس کی حالت اس مریض کی سی تھی جو اپنے عزیزوں کی تسکین کے لیے اپنی ناقابل برداشت تکلیف کے چھپانے کی ناکام کوشش کر رہا ہو۔ جگدھر کے قریب آ کر بولی۔ ''روپے ضرور تھے۔ اس کا چہرہ کہے دیتا ہے۔''

جگدھر: میں نے تھیلی اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔

سوبھاگی: اب چاہے وہ مجھے مارے یا نکالے، پر رہوں گی اسی کے گھر میں۔ کہاں کہاں تھیلی کو چھپائے گا۔ کبھی تو میرے ہاتھ لگے گی۔ میرے ہی کارن ان پر یہ مصیبت پڑی ہے۔ میں نے ہی اجاڑا ہے۔ میں ہی بساؤں گی۔ جب تک اس کے روپے نہ دلا دوں گی۔ مجھے چین نہ آئے گا۔

یہ کہہ کر وہ سورداس سے بولی۔ ''تو اب رہو گے کہاں؟''

سورداس نے یہ بات سنی۔ وہ سوچ رہا تھا۔ روپے میں نے ہی تو کمائے تھے۔ کیا پھر نہیں کما سکتا؟ یہی ہوگا نا! کہ جو کام اس سال ہوتا، وہ کچھ دنوں بعد ہوگا۔ میرے روپے تھے ہی نہیں۔ شاید اس جنم میں میں نے بھیرو کے روپے چرائے ہوں گے۔ یہ اسی کا ڈنڈ ملا ہے، مگر بے چاری سبھاگی کا اب کیا حال ہوگا؟ بھیرو اسے اپنے گھر میں کبھی نہ رکھے گا۔ بے چاری کہاں کہاں ماری ماری پھرے گی؟ یہ کلنک بھی میرے سر لگنا تھا۔ کہیں کا نہ رہا۔ دھن گیا، گھر گیا۔ آبرو گئی۔ جو دھرتی بچ رہی ہے، وہ بھی نہ جانے بچے گی کہ نہیں۔ اندھا ہونا ہی کیا تھوڑی بپت تھی کہ نت نئی چپت اور پڑی رہتی ہے۔ جس کے جی میں آیا ہے، چار کھری کھوٹی سنا دیتا ہے۔

ان دکھ دینے والے خیالات سے متاثر ہو کر وہ رونے لگا۔ سوبھاگی جگدھر کے ساتھ بھیرو کے گھر کی طرف چلی جا رہی تھی اور یہاں سورداس تنہا بیٹھا ہوا رو رہا تھا۔

دفعتاً وہ چونک پڑا۔ کسی طرف سے آواز آئی۔ ''تم کھیل میں روتے ہو؟''

مٹھوا گھیسو کے گھر سے روتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ شاید گھیسو نے مارا تھا۔ اس پر گھیسو اس کو چڑا رہا تھا۔ ''تم کھیل میں روتے ہو!''

سورداس کہاں تو حسرت و یاس، رنج و حرمان کے گہرے دریا میں غوطے کھا رہا تھا۔ کہاں یہ بات سنتے ہی اس کو ایسا معلوم ہوا گویا کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کنارے پر کھڑا کر دیا۔ واہ میں تو کھیل میں روتا ہوں! کتنی بری بات ہے! لڑکے بھی کھیل میں رونا برا خیال کرتے ہیں۔ رونے والے کو چڑاتے ہیں اور میں کھیل میں روتا ہوں۔ پکے کھلاڑی کبھی روتے نہیں۔ بازی پر بازی ہارتے ہیں۔ چوٹ پر چوٹ کھاتے ہیں۔ دھکے پر دھکے سہتے ہیں، پر میدان میں ڈٹے رہتے ہیں۔ ان کے تیوروں پر بل نہیں پڑتے۔ ہمت ان کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ دل میں کدورت کا شائبہ نہیں ہوتا۔ وہ نہ تو کسی سے جلتے ہیں۔ نہ چڑتے ہیں۔ کھیل میں رونا کیسا۔ کھیل تو ہنسنے کے

لیے، دل بہلانے کے لیے ہے۔ رونے کے لیے نہیں۔''

سورداس اٹھ کھڑا ہوا اور فاتحانہ تکبر کے نشہ میں راکھ کے ڈھیر کو دونوں ہاتھوں سے اڑانے لگا۔

ہم جوش کی حالت میں مقررہ حد سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ وہ ضبط کہاں ہے جو دشمن پر فتح پانے کے بعد تلوار کو میان میں کر لے۔

ایک لمحہ میں مٹھوا گھیسو اور محلّہ کے بیسوں لڑکے آ کر اس راکھ کے ڈھیر کے چاروں طرف جمع ہو گئے اور اپنے بے انتہا سوالات سے سورداس کو پریشان کر دیا۔ اس کو راکھ اڑاتے دیکھ کر ان سب کو بھی ایک مشغلہ ہاتھ آیا۔ راکھ کی بارش ہونے لگی۔ ذرا دیر میں ساری راکھ بکھر گئی اور زمین پر صرف سیاہ نشانات رہ گئے۔

مٹھوا نے پوچھا: دادا اب ہم رہیں گے کہاں؟

سورداس: دوسرا گھر بنائیں گے۔

مٹھوا: اور جو کوئی پھر آگ لگا دے۔

سورداس: تو پھر بنائیں گے۔

مٹھوا: اور جو پھر لگا دے؟

سورداس: تو ہم پھر بنائیں گے۔

مٹھوا: اور جو کوئی ہجار (ہزار) بار لگا دے؟

سورداس: تو ہم ہزار بار بنائیں گے!

لڑکوں کو گنتی سے خاص دل چسپی ہوتی ہے۔ مٹھوا نے پھر پوچھا: ''اور جو کچھ سو لاکھ بار لگائے دے؟'' سورداس نے اسی طفلانہ سادگی سے جواب دیا۔ ''تو ہم بھی سو لاکھ بار بنائیں گے۔''

جب وہاں راکھ کی ایک چٹکی بھی نہ رہی تو سب لڑکے کسی دوسرے مشغلہ کی تلاش میں دوڑے۔ آفتاب کی روشنی خوب پھیل گئی تھی۔ سورداس نے بھی لکڑی سنبھالی اور

سڑک کی طرف چلا۔ ادھر جگدھر یہاں سے نایک رام کے پاس گیا اور وہاں بھی یہ سب حال کہہ سنایا۔ پنڈا نے کہا۔ ''میں بھیرو کے بات سے روپے وصول کروں گا۔ جاتا کہاں ہے؟ اس کی ہڈیوں سے روپے نکال کر دم لوں گا۔ اندھا اپنے منہ سے کچھ کہے یا نہ کہے۔''

جگدھر وہاں سے بجرنگی، دیاگر، ٹھاکر دین وغیرہ محلّہ کے سب چھوٹے بڑے آدمیوں سے ملا اور یہ قصہ بیان کیا۔ حسب ضرورت واقعی بات میں نمک مرچ بھی لگاتا جاتا تھا۔ سارا محلّہ بھیرو کا دشمن ہو گیا۔

سورداس تو سڑک کے کنارے راہ گیروں کے جان و مال کی خیر منا رہا تھا۔ یہاں محلّہ والوں نے اس کی جھونپڑی بنانی شروع کی۔ کسی نے پھوس دیا۔ کسی نے بانس دیئے، کسی نے دھرن دی۔ کئی آدمی جھونپڑی بنانے لگ گئے۔ جگدھر ہی اس جماعت کا خاص مشیر تھا۔ اپنی زندگی میں شاید ہی اس نے اتنا حوصلہ دکھلایا ہو۔ حسد میں صرف سیاہی نہیں ہوتی بلکہ کچھ سفیدی بھی ہوا کرتی ہے۔ شام تک جھونپڑا تیار ہو گیا۔ پہلے سے کہیں زیادہ وسیع اور مضبوط۔ جمنی مٹی کے دو گھڑے اور دو تین ہانڈیاں لا کر رکھ دیں۔ ایک چولہا بھی بنا دیا۔ سب نے صلاح کر رکھی تھی کہ سورداس کو جھونپڑی کے بننے کی ذرا بھی خبر نہ ہو۔ جب وہ شام کو آئے تو گھر کو دیکھ کر متعجب ہو جائے اور پوچھنے لگے۔ کس نے بنایا؟ اس وقت سب لوگ کہیں کہ آپ ہی آپ تیار ہو گیا۔

(12)

پربھو سیوک طاہر علی کے ساتھ چلے تو باپ پر جھلائے ہوئے تھے۔ ''یہ مجھے کولہو کا بیل بنانا چاہتے ہیں۔ آٹھوں پہر تمباکو کے نشے میں ڈبویا پڑا ہوں۔ حکام کے آستانوں پر سجدے کروں۔ حصص فروخت کرتا پھروں۔ اخبار میں اشتہارات چھپواؤں۔ بس مجسم سگریٹ کی ڈبیہ بن جاؤں۔ یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ میں دولت

کمانے کی مشین نہیں ہوں ۔انسان ہوں ۔زر کی ہوس نے ابھی تک میرے جذبات کوفنا نہیں کیا۔اگر میں اپنی خداداد طباعی سے کام نہ لوں تو یہ میری احسان فراموشی ہو گی ۔قدرت نے مجھے دولت کمانے کے لیے بنایا ہی نہیں ورنہ وہ مجھ کو یہ جذبات کیوں عطا کرتی ۔کہتے تو ہیں کہ اب مجھے روپوں کی کیا فکر۔تھوڑے دنوں کا مہمان ہوں ۔گویا یہ سب تیاریاں میرے لیے ہو رہی ہیں! لیکن ابھی کہہ دوں کہ آپ میرے لیے یہ تکلیف نہ اٹھائیے ۔میں جس حالت میں ہوں،اسی میں خوش ہوں تو کہرام برپا ہو جائے ۔اچھی بلا گلے پڑی ۔جا کر دیہاتیوں پر رعب جمائیے ۔ان کو دھمکائیے ۔انہیں گالیاں سنائیے ۔کیوں؟ ان سب نے کوئی نئی بات نہیں کی ہے ۔ کوئی ان کی جائیداد پر جبراً قبضہ کرے گا تو لڑنے پر آمادہ ہو ہی جائیں گے ۔اپنے حقوق کے تحفظ کا ان کے پاس اورکون سا ذریعہ ہے؟ آج میرے گھر پرکوئی قبضہ کرنا چاہےتو میں بھی چپ چاپ نہ بیٹھوں گا۔صبر تو نا امیدی کی انتہائی حالت کا نام ہے ۔ جب تک ہم بالکل مجبورنہیں ہو جاتے،صبر نہیں کرتے ۔ان میاں جی کو بھی ذرا سی چوٹ آ گئی تو فریاد لے کر پہنچے۔خوشامدی ہے۔تملق سے اپنا اعتبار قائم کرنا چاہتا ہے۔ان کو بھی غریبوں پر رعب جمانے کی دھن سوار ہو گی مل کر نہیں رہتے بنتی ۔پاپا کی بھی یہی خواہش کرے۔خدا کرے سب کے سب بگڑ کھڑے ہوں۔گودام میں آگ لگا دیں اوران حضرت کی ایسی خبر لیں کہ وہاں سے بھاگتے ہی بنے! طاہر علی سے خفا ہو کر بولے۔ ’’کیا بات ہوئی کہ سب کے سب بگڑ کھڑے ہوئے؟‘‘

طاہر:حضور! بالکل بے سبب۔ میں تو خود ہی ان سبوں سے اپنی جان بچاتا رہتا ہوں ۔

پربھوسیوک:معلول کے لیے علت کا ہونا ضروری ہے،لیکن آج معلوم ہوا کہ یہ بھی ایک فلسفیانہ راز ہے ۔کیوں؟

طاہر:(بات نہ سمجھ کر) جی ہاں اور کیا۔

پربھوسیوک: جی ہاں اور کیا کے کیا معنے؟ کیا آپ بات بھی نہیں سمجھتے؟ یا بہرے پن کا مرض ہے؟ میں کہتا ہوں۔ بلا چنگاری کے آگ نہیں لگ سکتی۔ آپ فرماتے ہیں۔ جی ہاں اور کیا۔ آپ نے کہاں تک تعلیم پائی ہے؟

طاہر: (خائف ہوکر) حضور! مڈل تک تعلیم پائی تھی۔ مگر بدقسمتی سے پاس نہ ہو سکا۔ پھر بھی جو کام میں کر سکتا ہوں، اس کو مڈل پاس کر دے تو جو جرمانہ کہیے دوں۔ عرصہ تک چنگی میں محرر رہ چکا ہوں۔

پربھوسیوک: تو پھر آپ کی علمیت وفضلیت پر کسے شک ہو سکتا ہے۔ آپ کے کہنے پر مجھے مان لینا چاہیے کہ آپ خاموش بیٹھے ہوئے کتب بینی میں محو تھے یا شاید یادالٰہی میں غرق تھے اور مخالفوں کی ایک مسلح جماعت پہنچ کر آپ پر حملے کرنے لگی۔

طاہر: حضور تو خود ہی چل رہے ہیں۔ میں کیا عرض کروں۔ تحقیقات کر لیجیے گا۔

پربھوسیوک: آفتاب کو بتلانے کے لیے چراغ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ دہقانی عموماً امن پسند ہوتے ہیں۔ جب تک انھیں بھڑکایا نہ جائے لڑائی جھگڑا نہیں کرتے۔ آپ کی طرح انہیں یادالٰہی سے روٹیاں نہیں ملتیں۔ سارا دن سر کھپاتے ہیں جب روٹیاں میسر آتی ہیں۔ تعجب ہے کہ آپ پر جو کچھ بیتی اس کا سبب بھی نہیں بتلا سکتے۔ اس کے معنے اس کے سوا اور کیا ہو سکتے ہیں کہ یا تو آپ کو خداوند تعالی نے بہت موٹی عقل دی ہے یا آپ اپنا رعب جمانے کے لیے لوگوں پر بے جا دباؤ ڈالتے ہیں۔

طاہر: حضور! لڑائی کی ابتدا تو لڑکوں سے ہوئی۔ محلّہ کے کئی لڑکے میرے لڑکوں کو مار رہے تھے۔ میں نے جا کر ان سبھوں کی گوشمالی کر دی۔ بس اتنی ذرا سی بات پر لوگ چڑھ آئے۔

پربھوسیوک: خیر شکر ہے۔ آپ کے ساتھ خدا نے اس قدر بے انصافی نہیں کی جتنا میں سمجھتا تھا۔ آپ کے اور محلّہ کے لڑکوں میں مار پیٹ ہو رہی تھی۔ آپ نے اپنے

لڑکوں کے رونے کی آواز سنی اور آپ کا خون جوش میں آیا۔ دہقانوں کے لڑکوں میں اتنی جرأت کہ وہ آپ کے لڑکوں کو ماریں؟ غضب خدا کا۔ آپ کی شرافت اس کی متحمل نہ ہو سکی۔ آپ نے مصلحت، دور اندیشی، دانائی سب کو سمیٹ کر طاق پر رکھ دیا اور ان گستاخ لڑکوں کو مارنے دوڑے۔ تو اگر آپ جیسے مہذب شخص کو لڑکوں کی طفلانہ جنگوں میں مداخلت کرتے دیکھ کر اور لوگ بھی آپ کی تقلید کریں تو آپ کو شکایت نہ ہونی چاہیے۔ آپ کو دنیا میں اتنے عرصہ تک رہنے پر یہ تجربہ ہو جانا چاہیے تھا کہ لڑکوں کے بیچ میں بوڑھوں کو نہ پڑنا چاہیے۔ اس کا نتیجہ برا ہوتا ہے۔ اگر آپ کو یہ تجربہ نہ تھا تو اب سبق کے لیے آپ کو خوش ہونا چاہیے جس کے ذریعہ آپ کو ایک نہایت ضروری اور اہم تجربہ حاصل ہوا۔ اس کے لیے فریاد کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

فٹن اڑی جاتی تھی اور اس کے ساتھ طاہر علی کے ہوش بھی اڑے جاتے تھے۔ دل میں کہہ رہے تھے، میں سمجھتا تھا کہ ان حضرت میں زیادہ انسانیت ہو گی، پر دیکھتا ہوں تو یہ اپنے پدر بزرگوار سے بھی دو انگل اونچے ہیں۔ نہ ہاری مانتے ہیں نہ جیتی۔ یہ طعنے برداشت نہیں ہو سکتے۔ کچھ مفت تنخواہ نہیں دیتے۔ کام کرتا ہوں، اجرت لیتا ہوں۔ کنایتہً مجھے رذیل، احمق، جاہل، سب کچھ بنا ڈالا۔ ابھی عمر میں مجھ سے کتنے چھوٹے ہیں۔ ماہر سے دو چار سال بڑے ہوں گے مگر مجھے اس طرح آڑے ہاتھوں لے رہے ہیں۔ گویا میں نادان بچہ ہوں۔ دولت زیادہ ہونے سے کیا عقل بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ آرام سے زندگی بسر ہوتی ہے جبھی یہ باتیں سوجھ رہی ہیں۔ روٹیوں کے لیے ٹھوکریں کھانی پڑتیں تو معلوم ہو جاتا کہ تجربہ کیا چیز ہے۔ آقا کوئی بات اعتراض کے قابل دیکھے تو سمجھانے کا اس کو حق ہے۔ اس کی مجھے شکایت نہیں مگر جو کچھ ہو نرمی اور ہمدردی کے ساتھ۔ یہ نہیں زہر اگلنے لگو۔ کلیجہ کو چھلنی بنا ڈالو۔

یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ پانڈے پور آ پہنچا۔ سورداس آج بہت خوش نظر آ رہا تھا اور روز سواریوں کے نکل جانے کے بعد دوڑتا تھا۔ آج آگے ہی سے ان کا خیر مقدم

کرتا تھا۔ فٹن دیکھتے ہی دوڑا۔ پربھوسیوک نے فٹن روک دی اور تند لہجہ میں بولے:

''کیوں سورداس! مانگتے ہو بھیک، بنتے ہو سادھو اور کام کرتے ہو بدمعاشوں کا؟ تجھے فوج داری کرنے کا حوصلہ ہوا ہے؟

سورداس: کیسی فوج داری حضور؟ میں اندھا بھلا کیا فوجداری کروں گا؟

پربھوسیوک: تمہیں نے تو محلّہ والوں کو ساتھ لے کر میرے منشی پر حملہ کیا تھا اور گودام میں آگ لگا دینے کو تیار تھے؟

سورداس: سرکار! بھگوان کی کسم پر کہتا ہوں، میں نہیں تھا۔ آپ لوگوں کا منگتا ہوں۔ جان و مال کا کلیان مناتا ہوں۔ میں کیا پھوجداری کروں گا؟

پربھوسیوک: کیوں منشی جی۔ یہ شخص سرغنہ تھا نا؟

طاہر: نہیں حضور۔ اشارہ اسی کا تھا پر یہ وہاں نہ تھا۔

پربھوسیوک: میں ان چالوں کو خوب سمجھتا ہوں۔ تم جانتے ہو گے ان دھمکیوں سے یہ لوگ ڈر جائیں گے مگر ایک ایک سے چکی نہ پسوائی تو کہنا کہ کوئی کہتا تھا۔ صاحب کو تم نے کیا سمجھا ہے۔ اگر حاکموں سے جھوٹوں بھی کہہ دیں تو سارا محلّہ بندھ جائے۔ میں تمہیں جتائے دیتا ہوں۔

فٹن آگے بڑھی تو جگدھر ملا۔ خوانچہ ہتھیلی پر رکھے۔ ایک ہاتھ سے مکھیاں اڑاتا ہوا چلا جاتا تھا۔ پربھوسیوک کو دیکھتے ہی سلام کر کے کھڑا ہو گیا۔ پربھوسیوک نے پوچھا۔ ''تم بھی کل فوج داری کرنے والوں میں سے تھے؟''

جگدھر: سرکار! میں ٹکے کا آدمی کیا کھا کر پھوجداری کروں گا اور بیچارے سورداس کی کیا مجال ہے کہ سرکار کے سامنے اکڑ دکھائے۔ اپنی ہی مصیبت میں پڑا ہوا ہے۔ کسی نے رات کو بیچارہ کی جھونپڑی میں آگ لگا دی۔ برتن بھانڈا سب جل گیا۔ نہ جانے کس کس جتن سے کچھ روپے جٹائے تھے وہ بھی لٹ گئے۔ گریب نے ساری رات رو رو کر کاٹی ہے۔ آج ہم لوگوں نے اس کا جھونپڑا بنایا ہے۔ ابھی چھپّی

ملی ہے تو خوانچہ لے کر نکلا ہوں۔ حکم ہو تو کچھ کھلاؤں۔ کچالو خوب چٹ پٹے ہیں۔

پربھوسیوک کا جی للچا گیا۔ خوانچہ اتارنے کو کہا اور کچالو، دہی بڑے اور پکوڑیاں کھانے لگے۔ بھوک لگی تھی۔ یہ چیزیں بہت لذیذ معلوم ہوئیں۔ کہا۔ ’’سورداس نے تو یہ بات مجھ سے نہیں کہی۔‘‘

جگدھر: وہ کبھی نہ کہے گا۔ کوئی گلا بھی کاٹ ڈالے تو شکایت نہ کرے گا۔

پربھوسیوک: تب تو واقعی کوئی مہاتما ہے۔ کچھ پتہ نہ چلا کس نے جھونپڑے میں آگ لگائی تھی؟

جگدھر: سب معلوم ہو گیا حضور! پر کیا کیا جائے کتنا کہا گیا کہ اس پر تھانہ میں رپٹ کردے، پر وہ کہتا ہے کہ کون کسی کو پھنسائے۔ جو کچھ بھاگ میں لکھا تھا وہ ہوا۔ حضور ساری کرتوت اس بھیرو تاڑی والے کی ہے۔

پربھوسیوک: کیسے معلوم ہوا؟ کسی نے اسے آگ لگاتے دیکھا؟

جگدھر: حضور! وہ خود مجھ سے کہہ رہا تھا۔ روپیوں کی تھیلی لا کر دکھائی۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو گا؟

پربھوسیوک: بھیرو کے منہ پر کہو گے؟

جگدھر: نہیں سرکار۔ خون ہو جائے گا۔

دفعتاً بھیرو سر پر تاڑی کا گھڑا رکھے آتا ہوا نظر آیا۔ جگدھر نے فوراً خوانچہ اٹھایا اور بلا پیسے لیے قدم بڑھاتا دوسری طرف چل دیا۔ بھیرو نے سامنے آکر سلام کیا۔ پربھوسیوک نے آنکھیں دکھا کر پوچھا۔ ’’تو ہی بھیرو تاڑی والا ہے نہ؟‘‘

بھیرو: (کانپتے ہوئے) ہاں حضور۔ میرا نام ہی بھیرو ہے؟

پربھوسیوک: تو یہاں لوگوں کے گھروں میں آگ لگاتا پھرتا ہے۔

بھیرو: حضور! جوانی کی کسم کھاتا ہوں۔ کسی نے حضور سے جھوٹ کہہ دیا ہے۔

پربھوسیوک: تو کل میرے گودام پر فوجداری کرنے میں شریک تھا؟

بھیرو: ہجور کا تابعدار ہوں۔ آپ سے پھوجداری کروں گا۔ منشی جی سے پوچھیے۔ جھوٹ کہتا ہوں یا سچ۔ سرکار نہ جانے کیوں سارا محلّہ مجھ سے دشمنی کرتا ہے۔ اپنے گھر میں ایک روٹی کھاتا ہوں۔ وہ بھی لوگوں سے نہیں دیکھا جاتا۔ یہ جو اندھا ہے۔ ہجور ایک ہی بد ماش ہے۔ دوسروں کی بہو بیٹیوں پر بری نگاہ رکھتا ہے۔ مانگ مانگ کر روپے جوڑے ہیں، لین دین کرتا ہے۔ سارا محلّہ اس کے کہنے میں ہے۔ اسی کے چیلے بجرنگی اہیر نے پھوجداری کی ہے۔ مال مست ہے۔ گائیں بھینسیں لگتی ہیں۔ پانی ملا ملا کر دودھ بیچتا ہے۔ اس کے سوا کس کا گردہ ہے کہ ہجور سے پھوجداری کرے۔

پربھوسیوک: اچھا! اس اندھے کے پاس روپے بھی ہیں۔

بھیرو: ہجور! بنا روپیوں کے اتنی گرمی اور کیسے ہوگی؟ جب پیٹ بھرتا ہے تبھی تو بہو بیٹیوں پر نگاہ ڈالنے کی سوجھتی ہے۔

پربھوسیوک: بیکار کیوں بکتا ہے؟ اندھا آدمی کیا بری نگاہ ڈالے گا؟ میں نے تو سنا ہے کہ وہ بہت سیدھا سادہ آدمی ہے۔

بھیرو: آپ کا کتا آپ کو تھوڑا ہی کاٹتا ہے۔ آپ تو اس کی پیٹھ سہلاتے ہیں۔ پر جنھیں کاٹنے کو دوڑتا ہے وہ تو اس کو اتنا سیدھا نہ سمجھیں گے۔

اتنے میں بھیرو کی دکان آ گئی۔ کئی گاہک اس کی راہ دیکھ رہے تھے۔ وہ اپنی دکان میں چلا گیا۔ اس وقت پربھوسیوک نے طاہر علی سے کہا۔ ''آپ کہتے ہیں سارا محلّہ مجھے مل کر مارنے آیا تھا۔ مجھے اس پر یقین نہیں آتا۔ جہاں لوگوں میں اتنی نا اتفاقی اور نا چاقی ہے وہاں اس قدر اتفاق ہونا غیر ممکن ہے۔ دو آدمی ملے۔ دونوں ایک دوسرے کے دشمن۔ اگر آپ کی جگہ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو اس باہم نا چاقی سے حسب مرضی فائدہ اٹھاتا۔ ان کو آپس میں لڑا کر دور سے تماشا دیکھتا۔ مجھے تو ان لوگوں پر غصہ کی بجائے رحم آتا ہے۔''

بجرنگی کا گھر ملا۔ تیسرا پہر ہو گیا تھا۔ وہ بھینسوں کی ناند میں پانی ڈال رہا تھا۔ فٹن پر طاہر علی کے ساتھ پربھوسیوک کو بیٹھے دیکھا تو سمجھ گیا۔ میاں جی اپنے مالک کو لے کر رعب جمانے آئے ہیں۔ جانتے ہیں کہ اس طرح میں دب جاؤں گا۔ صاحب امیر ہوں گے تو اپنے گھر کے ہوں گے۔ مجھے کایل (قائل) کر دیں تو ابھی جو جربانہ (جرمانہ) لگا دیں، دینے کو تیار ہوں لیکن جب میرا کوئی قصور نہیں بلکہ قصور سولہوں آنے میاں ہی کا ہے تو میں کیوں دبوں۔ نیائے سے دبا لیں پد (عہدہ) سے دبا لیں، پربھکی سے دبنے والے کوئی اور ہوں گے۔''

طاہر علی نے اشارہ کیا۔ یہی بجرنگی ہے۔ پربھوسیوک نے مصنوعی غصہ دکھا کر کہا۔

''کیوں بے کل کے ہنگامے میں تو بھی شریک تھا؟''

بجرنگی: سریک کس کے ساتھ تھا؟ میں اکیلا تھا۔

پربھوسیوک: تیرے ساتھ سورداس اور محلّہ کے دوسرے لوگ نہ تھے؟ جھوٹ بولتا ہے؟

بجرنگی: جھوٹ نہیں بولتا۔ کسی کا دبیل نہیں ہوں۔ میرے ساتھ نہ سورداس تھا اور نہ محلّہ کا دوسرا آدمی۔ میں اکیلا تھا۔

گھیسو نے ہانک لگائی۔ ''پادڑی! پادڑی!''

مٹھوا بولا۔ ''پادڑی آیا۔ پادڑی آیا۔''

دونوں اپنے ہم جولیوں کو یہ خوش خبری سنانے دوڑے۔ ''پادڑی گائے گا، تصویریں دکھائے گا، کتابیں دے گا، مٹھائیاں اور پیسے بانٹے گا۔'' لڑکوں نے سنا تو وہ بھی اس لوٹ کا مال بٹانے کو دوڑے۔ ایک لمحہ میں وہاں بیسیوں لڑکے جمع ہو گئے۔ شہر کے دور افتادہ محلوں میں انگریزی لباس والا پادڑی کا مترادف ہے۔ نایک رام بھنگ پی کر بیٹھے ہوئے تھے۔ پادری کا نام سنتے ہی اٹھے۔ ان کی بے سری تانوں میں انہیں خاص مزہ ملتا تھا۔ ٹھاکر دین نے بھی دکان چھوڑ دی۔ انہیں

پادریوں سے مذہبی مباحثہ کرنے کی عادت تھی۔اپنی مذہبی واقفیت کے اظہار کے ایسے عمدہ موقعوں کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ دیا گر بھی آ پہنچے لیکن جب لوگ فٹن کے پاس پہنچے اس وقت بھید کھلا۔ پربھوسیوک بجرنگی سے کہہ رہے تھے۔ تمہاری شامت نہ آئے ورنہ صاحب تم کو تباہ کر دیں گے۔ کسی کام کے نہ رہو گے۔ تمہاری اتنی مجال!

بجرنگی اس کا جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ نایک رام نے آگے بڑھ کر کہا۔''اس پر کیوں بگڑتے ہیں فوجداری میں نے کی ہے۔جو کہنا ہو مجھ سے کہیے۔''

پربھوسیوک نے متحیر ہو کر پوچھا۔''تمہارا کیا نام ہے؟''

نایک رام کو کچھ تو راجہ مہیندر کمار کی نوازش، کچھ بھنگ کی ترنگ اور کچھ اپنی طاقت کے زعم نے گستاخ بنا دیا تھا۔لاٹھی سیدھی کرتا ہوا بولا۔''لٹھ مار پانڈے!''

اس جواب میں شیخی کی جگہ ظرافت کی فراوانی تھی۔ پربھوسیوک کا مصنوعی غصہ ہوا ہوگیا۔ہنس کر بولے۔''تب تو یہاں ٹھہرنے میں خیریت نہیں ہے۔''

نایک رام اکھڑ آدمی تھا۔ پربھوسیوک کے مطلب کو نہ سمجھ سکا۔اسے خیال ہوا کہ یہ میری ہنسی اڑا رہے ہیں گویا کہہ رہے ہیں کہ''تمہاری بکواس سے کیا ہوتا ہے۔ ہم زمین لیں گے اور ضرور لیں گے۔''ذرا بگڑ کر بولا۔''آپ ہنستے کیا ہیں؟ کیا سمجھ رکھا کہ اندھے کی جمین (زمین) سہج ہی مل جائے گی؟اس دھوکے میں نہ رہیے گا۔ ''

پربھوسیوک کو بھی اب غصہ آیا۔ پہلے انہوں نے سمجھا تھا کہ نایک رام مذاق کر رہا ہے۔اب معلوم ہوا کہ وہ واقعی لڑنے پر آمادہ ہے۔بولے۔''اس دھوکے میں نہیں ہوں۔مشکلات کو خوب جانتا ہوں۔اب تک بھروسہ تھا کہ سمجھوتہ سے ساری باتیں طے ہو جائیں گی۔اسی لیے آیا تھا،لیکن تمہاری خواہش کچھ اور ہو تو وہی سہی۔اب تک میں تمہیں کمزور سمجھتا تھا اور کمزوروں پر اپنی طاقت کو استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا،

لیکن آج جانا کہ تم زبردست ہو۔ تمہیں اپنی طاقت پر غرور ہے اس لیے اب ہم بھی تم کو اپنی طاقت دکھائیں تو اس میں کوئی ناانصافی نہیں ہے۔''

ان الفاظ میں نیک نیتی جھلک رہی تھی۔ ٹھاکر دین نے کہا۔ ''ہجور! پنڈا جی کی باتوں کا خیال نہ کریں۔ ان کی عادت ہی ایسی ہے جو کچھ منہ میں آیا بک ڈالتے ہیں۔ ہم لوگ آپ کے تابعدار ہیں۔''

نایک رام: آپ دوسروں کے بل پر کودتے ہوں گے۔ یہاں اپنے ہاتھوں کے بل کا بھروسہ رکھتے ہیں۔ آپ لوگوں کے دل میں جو ارمان ہو نکال ڈالیے۔ پھر نہ کہنا کہ دھوکے میں وار کیا (آہستہ سے) ایک ہی ہاتھ میں ساری کرستانی نکل جائے گی۔

پربھوسیوک: کیا کہا؟ ذرا زور سے کیوں نہیں کہتے؟

نایک رام: (کچھ ڈر کر) کہہ تو رہا ہوں۔ جو ارمان ہو نکال ڈالیے۔

پربھوسیوک: نہیں تم نے کچھ اور کہا ہے۔

نایک رام: جو کچھ کہا ہے وہی پھر کہہ رہا ہوں کسی کا ڈر نہیں ہے۔

پربھوسیوک: تم نے گالی دی ہے؟

یہ کہتے ہوئے پربھوسیوک فٹن سے نیچے اتر پڑے۔ آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ نتھنے پھڑک اٹھے۔ سارا جسم تھرتھرانے لگا۔ ایڑیاں اس طرح اچھل رہی تھیں گویا کسی ابلتی ہوئی ہانڈی کا ڈھکنا ہیں۔ چہرہ کی حالت تبدیل ہوگئی۔ ان کے ہاتھ میں صرف ایک پتلی سی چھڑی تھی۔ فٹن سے اترتے ہی وہ جھپٹ کر نایک رام کے گلے پر پہنچ گئے۔ اس کے ہاتھ سے لاٹھی چھین کر پھینک دی اور متواتر کئی بیت لگائے۔ نایک رام دونوں ہاتھوں سے واروں کو روکتا ہوا پیچھے ہٹتا جاتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا اس کے اوسان خطا ہو گئے ہیں۔ وہ جانتا تھا کہ شریف لوگ مار کھا کر چاہے چپ ہو جائیں، پر گالی نہیں برداشت کر سکتے۔ کچھ پشیمانی، کچھ حملہ کی تیزی، کچھ

انجام کا خوف، ان باتوں نے اس کو وار کرنے کی مہلت نہ دی۔ لگاتار واروں سے وہ چوندھیا سا گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پربھوسیوک اس کے جوڑ کے نہ تھے مگر اس میں وہ پاک ہمت، وہ حق بجانب ہونے کی بات نہ تھی جس کو تعداد اور اسلحہ اور طاقت کی پروا نہیں ہوتی۔

اور لوگ بھی بدحواس سے کھڑے تھے۔ کسی نے بیچ بچاؤ تک نہ کیا۔ بجرنگی نایک رام کے پسینہ کی جگہ خون بہانے والوں میں تھا۔ دونوں ساتھ کھیلے اور ایک ہی اکھاڑے میں لڑے تھے۔ ٹھاکر دین اور کچھ نہ کرسکتا تھا تو پربھوسیوک کے سامنے کھڑا ہو سکتا تھا لیکن دونوں کے دونوں گم صم سے تکتے رہے۔ یہ سب کچھ پلک مارنے میں ہوگیا۔ پربھوسیوک ابھی تک بیت مارتے جاتے تھے۔ جب دیکھا کہ چھڑی سے کوئی اثر نہیں ہو رہا تو ٹھوکر لگانی شروع کی۔ یہ چوٹ کارگر ہوئی۔ دو ہی تین ٹھوکریں پڑیں تھیں کہ نایک رام ران میں چوٹ کھا کر گر گیا۔ اس کے گرتے ہی بجرنگی نے دوڑ کر پربھوسیوک کو ہٹا دیا اور بولا ''بس صاحب بس۔ اب اس میں خیریت ہے کہ آپ چلے جائیے، نہیں تو خون ہو جائے گا۔''

پربھوسیوک: ہم کو کوئی چڑ کٹا سمجھ لیا ہے۔ بدمعاش! خون پی لوں گا۔ گالی دیتا ہے۔

بجرنگی: بس اب بہت نہ بڑھیے۔ یہ اسی گالی کا پھل ہے کہ آپ یوں کھڑے ہیں۔ نہیں تو اب تک نہ جانے کیا ہو گیا ہوتا۔

پربھوسیوک جنون کے درجہ سے گزر کر مصلحت کے درجہ میں پہنچ چکے تھے۔ جا کر فٹن میں بیٹھ گئے اور گھوڑے کو چابک ماری۔ گھوڑا ہوا ہو گیا۔

بجرنگی نے جا کر نایک رام کو اٹھایا۔ گھٹنوں میں بہت چوٹ آئی تھی۔ کھڑا نہ ہوا جاتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ بجرنگی کا کندھا پکڑ کر آہستہ آہستہ لنگڑاتے ہوئے گھر چلے۔

ٹھاکر دین نے کہا۔ ’’نایک رام! بھلا مانو یا برا، بھول تمہاری تھی۔ یہ لوگ گالی نہیں سہہ سکتے۔

نایک رام: ارے تو میں نے گالی کب دی تھی۔ بھائی میں نے تو یہی کہا تھا کہ ایک ہی ہاتھ میں کرستانی نکل جائے گی۔ بس اسی پر بگڑ گیا۔

جمنی اپنے دروازہ پر کھڑی ہوئی یہ تماشا دیکھ رہی تھی۔ آ کر بجرنگی کو کوسنے لگی۔ ’’کھڑے منہ تاکتے رہے اور لونڈا مار پیٹ کر چلا گیا۔ ساری پہلوانی دھری رہ گئی۔‘‘

بجرنگی: میں تو جیسا گھبرا گیا۔

جمنی: چپ بھی رہو۔ لاج نہیں آتی۔ ایک لونڈا آ کر سب کو پچھاڑ گیا۔ یہ تم لوگوں کے گھمنڈ کا ڈنڈ ہے۔

ٹھاکر دین: بہت سچ کہتی ہو جمنا۔ یہ تماشا دیکھ کر یہی کہنا پڑتا ہے کہ بھگوان کو ہمارے گرور (غرور) کی سجا (سزا) دینی تھی۔ نہیں تو کیا ایسے ایسے جودھا کٹھ پتلیوں کی طرح کھڑے رہتے۔ بھگوان کسی کا گھمنڈ نہیں رکھتے۔

نایک رام: یہی بات ہو گی۔ میں اپنے گھمنڈ میں کسی کو کچھ نہ سمجھتا تھا۔

یہ باتیں کرتے ہوئے لوگ نایک رام کے گھر آئے۔ کسی نے آگ جلائی۔ کوئی ہلدی پیسنے لگا۔ ذرا دیر میں محلّہ کے اور لوگ آ کر جمع ہو گئے۔ سب کو تعجب تھا کہ نایک رام جیسا پھنکیت اور لٹھ باز کس طرح زک کھا گیا۔ کہاں سینکڑوں کے بیچ سے بے داغ نکل آتا تھا۔ کہاں ایک چھوکرے نے لتھاڑ ڈالا۔ بھگوان کی مرضی!

جگدھر ہلدی کی لیپ کرتا ہوا بولا۔ ’’یہ ساری آگ بھیرو کی لگائی ہوئی ہے۔ اس نے راستہ ہی میں صاحب کے کان بھر دیئے تھے۔ میں نے تو دیکھا کہ اس کی جیب میں پستول بھی تھا۔‘‘

نایک رام: پستول اور بندوق سب دیکھوں گا۔ اب تو لاگ پڑ گئی ہے۔

ٹھاکر دین: کوئی انُستھان کروا دیا جائے۔

جگدھر: انسٹھان کا کرستانوں پر کچھ بس نہیں چلتا۔

نایک رام: اسے بیچ بازار میں فٹن روک کر ماروں گا۔ پھر کہیں منہ دکھانے کے لائق نہ رہے گا۔ اب من میں یہی ٹھن گئی ہے۔ اسی وقت بھیرو بھی آ کر کھڑا ہو گیا۔ نایک رام نے طنزاً کہا۔ ''تم کو تو بڑی خوشی ہوئی ہو گی۔ بھیرو؟''

بھیرو: کیوں بھیا؟

نایک رام: مجھ پر مار پڑ رہی ہے نا۔

بھیرو: کیا میں تمہارا دشمن ہوں بھیا۔ میں نے تو ابھی دکان پر سنا۔ ہوش اڑ گئے۔ صاحب دیکھنے میں بہت سیدھا سادہ معلوم ہوتا تھا۔ مجھ سے ہنس ہنس کر باتیں کیں۔ یہاں آ کر نہ جانے کون بھوت اس کے سر پر سوار ہو گیا؟

نایک رام: اس کو بھوت میں اتار دوں گا۔ اچھی طرح اتار دوں گا۔ ذرا کھڑا تو ہونے دو۔ ہاں۔ یہاں جو کچھ رائے ہو اس کی کھبر وہاں نہ ہونے پائے۔ نہیں تو چوکنا ہو جائے گا۔

بجرنگی: یہاں ہمارا کون ایسا بیری بیٹھا ہوا ہے؟

جگدھر: یہ نہ کہو۔ گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے۔ کون جانے کوئی آدمی سابا سی لوٹنے کے لیے انعام لینے کے لیے یا سرکھرو (سرخرو) بننے کے لیے ساری باتیں لگا آئے۔

بھیرو: مجھی پر شک کر رہے ہو تو میں اتنا نیچ نہیں ہوں کہ گھر کا بھید دوسروں سے کھولتا پھروں۔ اس طرح چار آدمی ایک جگہ رہتے ہیں تو آپس میں کھٹ پٹ ہو ہی جاتی ہے، لیکن اتنا کمینہ نہیں ہوں کہ بھبھیکن کی طرح اپنے بھائی کے گھر آگ لگوا دوں۔ کیا اتنا نہیں جانتا کہ مرنے جینے میں، بپت سمپت میں محلّہ ہی کے لوگ کام آتے ہیں۔ کبھی کسی کے ساتھ بسواس گھات کیا ہے؟ پنڈا جی ہی کہہ دیں کہ میں نے کبھی ان کی بات دولکھی ہے۔ ان کی آڑ نہ ہوتی تو پولیس نے اب تک مجھے کب کا

لدوا دیا ہوتا نہیں تو رجسٹر میں نام تک نہیں ہے۔

نایک رام: بھیرو! تم نے وقت پڑنے پر کبھی ساتھ نہیں چھوڑا، اتنا تو ماننا ہی پڑے گا۔

بھیرو: پنڈا جی تمہارا حکم ہو تو آگ میں کود پڑوں۔

اتنے میں سورداس بھی آ پہنچا۔ سوچتا آتا تھا کہ آج کھانا کہاں بناؤں گا۔ اس کی کیا فکر ہے۔ بس نیم کے پیڑ کے نیچے بائیاں لگاؤں گا۔ گرمی کے تو دن ہیں۔ کون سا پانی برس رہا ہے۔ اسی سوچ بچار میں وہ جوں ہی بجرنگی کے دروازہ پر پہنچا۔ جمنی نے آج کا سارا حال کہہ سنایا۔ ہوش اڑ گئے۔ اپلے ایندھن کی سدھ نہ رہی۔ سیدھے نایک رام کے یہاں پہنچا۔ بجرنگی نے کہا۔ ''آؤ سورداس! بڑی دیر لگائی۔ کیا ابھی چلے آتے ہو؟ آج تو یہاں بڑا گول مال ہو گیا۔''

سورداس: ہاں۔ جمنا نے ابھی مجھ سے کہا۔ میں تو سنتے ہی ٹھک سے رہ گیا۔

بجرنگی: ہونہار تھی اور کیا۔ ہے تو لونڈا پر ہمت کا پکا ہے جب تک ہم لوگ ہاں ہاں کریں تب تک فٹن پر سے کود ہی تو پڑا اور لگا ہاتھ پر ہاتھ چلانے۔

سورداس: تم لوگوں نے پکڑ بھی نہ لیا؟

بجرنگی: سنتے تو ہو۔ جب تک دوڑیں تب تک تو اس نے ہاتھ چلا ہی دیا۔

سورداس: بڑے آدمی گالی سن کر آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔

جگدھر: جب بیچ باجار (بازار) میں بے بھاؤ کی پڑیں گی تب روئیں گے۔ ابھی تو پھولے نہ ساتے ہوں گے۔

بجرنگی: جب چوک میں نکلے تو گاڑی روک کر جوتوں سے ماریں۔

سورداس: ارے اب جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اسکے آبرو بگاڑنے سے کیا ملے گا؟

نایک رام: تو میں یونہی چھوڑ دوں گا۔ ایک ایک بیت کے بدلے اگر سو سو جوتے نہ لگاؤں تو میرا نام نایک رام نہیں۔ یہ چوٹ میرے بدن میں نہیں کلیجہ پر لگی ہے۔

میں بڑوں بڑوں کا سر نیچا کر چکا ہوں، انہیں مٹاتے کیا دیر لگتی ہے۔ (چٹکی بجا کر) اس طرح اڑا دوں گا۔

سورداس: بیر بڑھانے سے کچھ پھائدہ (فائدہ) نہ ہوگا۔ تمہارا تو کچھ نہ بگڑے گا، پر محلّہ کے سب آدمی بندھ جائیں گے۔

نایک رام: کیسی پاگلوں سی باتیں کرتے ہو۔ میں کوئی دھنیا چمار ہوں کہ اتنی بے عزتی کرا کے چپ ہو جاؤں۔ تم لوگ سورداس کو قایل کیوں نہیں کرتے جی؟ کیا چپ ہو کے بیٹھ رہوں؟ بولو، بجرنگی! تم لوگ بھی ڈر رہے ہو کہ وہ کرستان سارے محلّہ کو پیس کر پی جائے گا؟

بجرنگی: اوروں کو تو میں نہیں کہتا، لیکن میرا بس چلے تو اس کے ہاتھ پیر توڑ دوں۔ چاہے جیل ہی کیوں نہ کاٹنا پڑے۔ یہ تمہاری ہی بے اجتی (بےعزتی) نہیں ہے۔ محلّہ بھر کے منہ میں کالک لگ گئی ہے!

بھیرو: بس تم نے تو میرے منہ سے بات چھین لی۔ کیا کہوں اس بکھت (وقت) نہ تھا نہیں تو ہڈی توڑ ڈالتا۔

جگدھر: پنڈا جی۔ منہ دیکھی نہیں کہتا۔ تم چاہے دوسروں کے کہنے سننے میں آ جاؤ، لیکن میں بنا اس کی مرمت کیے نہ مانوں گا۔

اس پر کئی آدمیوں نے کہا۔ ''مکھیا کی اجت گئی تو سب کی گئی۔ وہی تو کرستان ہیں جو گلی گلی عیسیٰ مسیح کے گیت گاتے پھرتے ہیں۔ دومڑا، چمار جو گرجا میں جا کھانا کھائے، وہی کرستان ہو جاتا ہے۔ وہی پیچھے کوٹ پتلون پہن کر صاحب بن جاتے ہیں۔''

ٹھاکر دین: میری تو صلاح یہی ہے کہ کوئی انسٹھان کرا دیا جائے۔

نایک رام: اب بتاؤ سورداس! تمہاری بات مانوں یا اتنے آدمیوں کی؟ تمہیں ڈر ہوگا کہ کہیں میری دھرتی پر آنچ نہ آ جائے تو اس سے تم نسچت رہو۔ راجہ صاحب نے

جو بات کہہ دی اسے پتھر کی لکیر سمجھو۔ صاحب سر رگڑ کر مر جائیں گے تو بھی اب اس دھرتی کو نہیں پا سکتے۔

سورداس: دھرتی کی مجھے چنتا نہیں ہے۔ مروں گا تو سر پر لاد تھوڑا ہی جاؤں گا مگر آخر میں سارا پاپ میرے ہی سر پڑے گا۔ میں ہی تو اس سارے تو پھان (طوفان) کی جڑ ہوں۔ میرے ہی کارن تو یہ رگڑ جھگڑ مچی ہوئی ہے۔ نہیں تو صاحب کو تم سے کون دشمنی تھی۔

نایک رام: یارو سورداس کو سمجھاؤ۔

جگدھر: سورداس سوچو ہم لوگوں کی کتنی بے آبروئی ہوئی ہے۔

سورداس: آبرو کا بنانے بگاڑنے والا آدمی نہیں ہے۔ بھگوان ہے۔ اس کی نگاہ میں آبرو بنی رہنی چاہیے۔ آدمیوں کی نگاہ میں آبرو کی پرکھ کہاں ہے۔ جب سود کھانے والا بنیا اور گھوس کھانے والا حاکم اور جھوٹ بولنے والا گواہ بے آبرو نہیں سمجھا جاتا۔ لوگ ان کا آدر مان کرتے تو یہاں سچی آبرو کی قدر کرنے والا کوئی ہے ہی نہیں۔

بجرنگی: تم سے کچھ مطلب نہیں۔ ہم لوگ جو چاہیں گے، وہ کریں گے۔

سورداس: اگر تم میری بات نہ مانو گے تو میں جا کر صاحب سے سارا ماجرا کہہ سناؤں گا۔

نایک رام: اگر تم نے ادھر پیر رکھا تو یاد رکھنا، وہیں کھود کر گاڑ دوں گا۔ اندھا اپاہج سمجھ کر تمہاری مروت کرتا ہوں، نہیں تو تم ہو کس کھیت کی مولی۔ کیا تمہارے کہنے سے اپنی عزت گنوا دوں۔ باپ داووں کے منہ میں کالک لگوا دوں۔ بڑے آئے ہو وہاں سے گیانی بن کے، تم بھیک مانگتے ہو۔ تمہیں اپنی عزت کی فکر نہ ہو۔ یہاں تو آج تک پیٹھ میں دھول نہیں لگی۔

سورداس نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ چپکے سے اٹھا اور مندر کے چبوترہ پر جا کر

لیٹ گیا۔ مٹھوا پرشاد کے انتظار میں وہیں بیٹھا ہوا تھا۔ اسے پیسے نکال کر دیئے کہ ستو گڑ لاکر کھالے۔ مٹھوا خوش ہو کر بنیے کی دکان کی طرف دوڑا۔ لڑکوں کو ستو اور چربن روٹیوں سے لذیذ تر معلوم ہوتا ہے۔

سورداس کے چلے جانے کے بعد کچھ دیر تک سب لوگ سناٹے میں بیٹھے رہے۔ اس کی مخالفت نے ان کو شک میں ڈال دیا تھا۔ اس کی صاف گوئی سے سب لوگ ڈرتے تھے۔ یہ بھی معلوم تھا کہ وہ جو کہتا ہے، اسے پورا کر دکھاتا ہے، اس لیے ضروری تھا کہ پہلے سورداس ہی سے نبٹ لیا جائے۔ اس کو قایل کرنا مشکل تھا۔ دھمکی سے بھی کوئی کام نہ نکل سکتا تھا۔ نایک رام نے اس پر لگے ہوئے الزام کی تائید کر کے اسے شکست دینا تجویز کیا۔ بولا۔ ''معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے اندھے کو پھوڑ لیا۔''

بھیرو: مجھے بھی یہی شک ہوتا ہے۔

جگدھر: سورداس پھوٹنے والا آدمی نہیں ہے۔

بجرنگی: کبھی نہیں۔

ٹھاکر دین: ایسا سو بھاؤ تو نہیں، پر کون جانے کسی کی نہیں چلائی جاتی۔ میرے ہی گھر چوری ہوئی تو کیا باہر کے چور تھے۔ پڑوسیوں کی ہی کرتوت ہے۔ پورے ایک ہزار کا مال اٹھ گیا اور وہی لوگ جنھوں نے مال اڑایا اب تک میرے دوست بنے ہوئے ہیں۔ آدمی من چھن بھر میں کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔

نایک رام: شاید زمین کا معاملہ کرنے پر راضی ہو گیا ہو۔ پر صاحب نے ادھر آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو بنگلہ میں آگ لگا دوں گا (مسکرا کر) بھیرو میری مدد کریں گے ہی۔

بھیرو: پنڈا جی! تم لوگ میرے اوپر شبہ کرتے ہو۔ پر میں جوانی کی قسم کھاتا ہوں جو اس جھونپڑے کے پاس گیا بھی ہوں۔ جگدھر میرے یہاں آتے جاتے ہیں۔

ایمان سے پوچھے انہیں سے۔

نایک رام: جو آدمی کسی کی بہو بیٹی پر بری نگاہ کرے، اس کے گھر میں آگ لگانا برا نہیں۔ مجھے پہلے تو بسواس نہیں آتا تھا پر آج اس کے مجاج (مزاج) کا رنگ بدلا ہوا ہے۔

بجرنگی: پنڈا جی! سورداس کو تم آج سے تیس برس سے دیکھ رہے ہو۔ ایسی بات نہ کہو۔

جگدھر: سورداس میں اور چاہے جتنی برائیاں ہوں، پر یہ برائی نہیں ہے۔

بھیرو: مجھے بھی ایسا جان پڑتا ہے کہ ہم نے ناہک (ناحق) اس پر کلنک لگایا۔ سبھا گی آج سویرے آ کر میرے پیروں پر گر پڑی اور تب سے گھر کے باہر نہیں نکلی۔ سارے دن اماں کی سیوا ٹہل کرتی رہی۔

یہاں تو یہی باتیں ہوتی رہیں۔ پربھو سیوک کی خاطر مدارت کیونکر کی جائے گی۔ ادھر پربھو سیوک گھر چلے تو آج کے کام پر ان کو وہ خوشی نہ تھی جو نیک کام کا سب سے بڑا انعام ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کا دل مطمئن تھا۔

کوئی شریف آدمی برے کلمات کو برداشت نہیں کرسکتا اور نہ ہی کرنا چاہیے۔ اگر کوئی گالیاں کھا کر چپ ہو رہے تو اس کے معنے یہ ہیں اس میں مردانگی نہیں ہے۔ خودداری نہیں ہے۔ گالیاں کھا کر بھی جس کے خون میں جوش نہ آئے، وہ بے جان اور مردہ ہے۔

پربھو سیوک کو افسوس یہ تھا کہ میں نے یہ نوبت آنے ہی کیوں دی۔ مجھے ان سے دوستی کرنی چاہیے تھی۔ ان لوگوں کو طاہر علی کے گلے ملانا چاہیے تھا مگر یہ زمانہ سازی کس سے سیکھوں؟ اونھ! یہ چالیں وہ چلے جسے پھیلنے کی چاہ ہو۔ یہاں تو سمٹ کر رہنا چاہتے ہیں۔ پاپا سنتے ہی جھلا اٹھیں گے۔ سارا الزام میرے ہی سر تھوپیں گے۔ میں ہی کوتاہ فہم۔ نا مصلحت شناس۔ ناتجربہ کار ہوں۔ ضرور ہوں۔ جسے دنیا میں رہ کر دنیا

داری نہ آئے وہ ضرور خر دماغ ہے۔ پاپا ناخوش ہوں گے۔ میں خاموشی سے ان کی ناخوشی برداشت کرلوں گا۔ اگر وہ میری طرف سے مایوس ہو کر یہ کارخانہ کھولنے کا ارادہ ترک کر دیں تو میں منہ مانگی مراد پا جاؤں۔

لیکن پربھوسیوک کو کتنا تعجب ہوا جب سارا ماجرا سن کر بھی جان سیوک کے چہرہ پر غصہ کی کوئی علامت نمودار نہ ہوئی۔ یہ خاموشی تنبیہ و تہدید سے زیادہ ناقابل برداشت تھی۔ پربھوسیوک چاہتے تھے کہ پاپا مجھے خوب تنبیہ کریں کہ مجھے اپنی صفائی دینے کا موقع ملے۔ میں ثابت کر دوں کہ اس ناگوار واقعہ کا ذمہ دار میں نہیں ہوں۔ میرے بجائے کوئی دوسرا آدمی ہوتا تو اس پر بھی یہی افتد پڑتی۔ انہوں نے دو ایک بار اپنے والد کے غصہ کو مشتعل کرنے کی کوشش کی، لیکن جان سیوک نے صرف ایک مرتبہ ان کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھا اور اٹھ کر چلے گئے۔ کسی شاعر کی داد پانے کی تمنا سامعین کے سکوت سے اتنی برباد نہ ہوئی ہو گی!

مسٹر جان سیوک چھلکے ہوئے دودھ پر آنسو نہ بہاتے تھے۔ پربھوسیوک کے کام کی برائی کرنا بے سود تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اس میں خودداری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ انہوں نے خود ہی اس جذبہ کی پرورش کی تھی۔ سوچنے لگے اس گتھی کو کیسے سلجھاؤں۔ نایک رام محلّہ کا مکھیا ہے۔ سارا محلّہ اس کے اشارہ پر ناچتا ہے۔ سورداس تو محض برائے نام وزن بیت ہے اور نایک مکھیا ہی نہیں بلکہ شہر کا مشہور گنڈا بھی ہے۔ بڑی خیریت ہوئی کہ پربھوسیوک وہاں سے جیتا جاگتا آیا۔ راجہ صاحب بڑی مشکل سے راہ راست پر آئے تھے۔ نایک رام ان سے ضرور فریاد کرے گا اب کے ہماری زیادتی ثابت ہو گی۔ راجہ صاحب کو سرمایہ داروں سے یونہی چڑ ہے۔ یہ حال سنتے ہی جامہ سے باہر ہو جائیں گے۔ پھر کسی طرح ان کا منہ سیدھا نہ ہو گا۔ ساری رات جان سیوک اسی ادھیڑ بن میں پڑے رہے۔ دفعتاً انہیں ایک بات سوجھی۔ چہرہ پر مسکراہٹ کی جھلک دکھائی دی۔ ممکن ہے یہ چال سیدھی پڑ جائے تو بگڑا ہوا کام پھر

سے بن جائے۔ صبح کو ناشتا کرنے کے بعد فٹن تیار کرائی اور پانڈے کو روانہ ہو گئے۔

نایک رام نے پیروں میں پٹیاں باندھ لی تھیں۔ بدن میں ہلدی کی مالش کرائے ہوئے تھے۔ ایک ڈولی منگوا رکھی تھی اور راجہ مہیندر کمار کے پاس جانے کو تیار تھے۔ ابھی مہورت میں دو چار پل کی کسر تھی۔ بجرنگی اور جگدھر بھی ساتھ جانے والے تھے۔ یکا یک فٹن پہنچی تو لوگ متحیر ہو گئے۔ ایک لمحہ میں سارا محلہ آ کر جمع ہو گیا کہ آج کیا ہو گا۔

جان سیوک نایک رام کے پاس جا کر بولے۔ ''آپ ہی کا نام نایک رام پانڈے ہے نا؟ میں آپ سے کل کی باتوں کے لیے معافی مانگنے آیا ہوں۔ جونہی لڑکے نے مجھ سے یہ واقعہ بیان کیا، میں نے اسے خوب ڈانٹا اور رات زیادہ نہ گئی ہوتی تو میں اسی وقت آپ کے پاس آتا۔ لڑکا نالائق اور ناتجربہ کار ہے۔ کتنا ہی چاہتا ہوں کہ اس میں ذرا آدمیت آ جائے، پر ایسی الٹی سمجھ ہے یہ کسی بات پر دھیان ہی نہیں دیتا۔ پڑھنے کے لیے ولایت بھیجا۔ وہاں سے بھی پاس ہو آیا، لیکن آدمیت نہ آئی۔ اس کی نادانی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو گا اتنے آدمیوں کے بیچ میں وہ آپ سے بے ادبی کر بیٹھا۔ اگر کوئی آدمی شیر پر پتھر پھینکے تو یہ اس کی بہادری نہیں بلکہ نادانی ہے۔ ایسا شخص رحم کے قابل ہے کیونکہ دیر میں یا جلد ہی وہ شیر کے منہ کا لقمہ بن جائے گا۔ اس لونڈے کی بجنسہٖ یہی حالت ہے۔ آپ نے مروت نہ کی ہوتی، تحمل سے کام نہ لیا ہوتا تو نہ جانے کیا ہو جاتا۔ جب آپ نے اتنی رعایت کی ہے تو دل سے ملال بھی نکال ڈالیے۔''

نایک رام چارپائی پر لیٹ گئے گویا کھڑے رہنے میں تکلیف ہو رہی ہے۔ بولے۔ ''صاحب! دل سے ملال تو نہ نکلے گا چاہے جان نکل جائے۔ اسے چاہے ہم لوگوں کی مروت کہیے چاہے ان کی تقدیر کہیے کہ وہ یہاں سے بچ کر چلے گئے، لیکن ملال تو دل میں بنا ہوا ہے۔ وہ تبھی نکلے گا جب ہم دونوں میں سے ایک نہ رہے گا۔

رہی بھل منسی سو بھگوان نے چاہا تو جلد ہی سیکھ جائیں گے۔ بس ایک برا ہمارے ہاتھ میں پھر پڑ جانے دیجیے۔ ہم نے بڑے بڑوں کو بھلا مانس بنا دیا۔ ان کی کیا ہستی ہے۔''

جان سیوک: اگر آپ اتنی آسانی سے اسے بھل منسی سکھا سکیں تو کہیے آپ ہی کے پاس بھیج دوں۔ میں تو سب کچھ کر کے ہار گیا۔

نایک رام: بولو بھائی بجرنگی۔ صاحب کی باتوں کا جواب دو۔ مجھ سے تو بولا نہیں جاتا۔ رات کراہ کراہ کر کاٹی ہے۔ صاحب کہتے ہیں ماپھ (معاف) کر دو۔ دل میں ملال نہ رکھو۔ میں یہ سب بیوہار نہیں جانتا۔ یہاں تو اینٹ کا جواب پتھر سے دینا سیکھا ہے۔

بجرنگی: صاحب لوگوں کا یہی دستور ہے۔ پہلے تو مارتے ہیں اور جب دیکھتے ہیں کہ ہمارے اوپر بھی مار پڑا چاہتی ہے تو چٹ کہتے ہیں ماپھ کر دو۔ یہ نہیں سوچتے کہ جس نے مار کھائی ہے اس کو بنا مارے کیسے تسکین ہوگی۔

جان سیوک: تمہارا کہنا ٹھیک ہے لیکن یہ سمجھ لو کہ معافی انتقام کے خوف سے نہیں مانگی جاتی۔ خوف سے آدمی چھپ جاتا ہے۔ دوسروں کی مدد مانگنے دوڑتا ہے۔ معافی نہیں مانگتا۔ معافی آدمی اسی وقت مانگتا ہے جب اس کو اپنی بے انصافی اور زیادتی کا یقین ہو جاتا ہے اور جب اس کا دل اسے شرمندہ کرنے لگتا ہے۔ پربھو سیوک سے تم معافی مانگنے کو کہو تو ہرگز نہ مانے گا۔ تم اس کی گردن پر تلوار چلا کر بھی اس کے منہ سے معافی کا ایک لفظ نہیں نکلوا سکتے۔ اگر یقین نہ ہو تو اس کا امتحان لے لو۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ سمجھتا ہے میں نے کوئی زیادتی نہیں کی۔ وہ کہتا ہے کہ مجھے ان لوگوں نے گالیاں دیں، لیکن میں یہ باور نہیں کر سکتا کہ آپ لوگوں نے اس کو گالیاں دی ہوں گی۔ شریف آدمی نہ گالیاں دیتا ہے نہ گالیاں سنتا ہے۔ میں جو معافی مانگ رہا ہوں تو اس لیے کہ مجھے یہاں سراسر اس کی زیادتی معلوم ہوتی ہے۔ میں اس کی حرکت پر

دل سے نادم ہوں اور مجھے اس کا افسوس ہے کہ میں نے اس کو یہاں کیوں آنے دیا۔ سچ پوچھیے تو اب مجھے یہ پچھتاوا ہو رہا ہے کہ میں نے اس زمین کو لینے کی بات ہی کیوں اٹھائی۔ آپ لوگوں نے میرے ملازم کو مارا۔ میں نے پولیس میں رپورٹ تک نہ کی۔ میں نے قصد کرلیا کہ اب اس زمین کا نام نہ لوں گا۔ میں آپ لوگوں کو تکلیف نہیں دینا چاہتا۔ آپ لوگوں کا گھر اجاڑ کر اپنا گھر نہیں بنانا چاہتا۔ اگر تم لوگ خوشی سے دو گے تو لوں گا ورنہ چھوڑ دوں گا۔ کسی کا دل دکھانا سب سے بڑا گناہ کہا گیا ہے۔ جب تک آپ لوگ مجھے معاف نہ کردیں میرے دل کو چین نہ آئے گا۔

شرارت سادگی کی محض ایک خوفناک شکل ہے۔ صاحب کی شیریں بیانی نے نایک رام کا غصہ ٹھنڈا کردیا۔ کوئی دوسرا شخص اتنی ہی آسانی سے اس کو صاحب کی گردن پر تلوار چلانے کے لیے آمادہ کرسکتا تھا۔ ممکن تھا پر بھو سیوک کو دیکھ کر اس کے سر پر پھر خون سوار ہو جاتا، لیکن اس وقت صاحب کی باتوں نے اس پر جادو سا کر دیا۔ بولا۔ ''بجرنگی کیا کہتے ہو؟''

بجرنگی: کہنا کیا ہے۔ جو اپنے سامنے سر جھکائے اس کے سامنے سر جھکانا ہی پڑتا ہے۔ صاحب یہ بھی تو کہتے ہیں کہ اب ہم جمین (زمین) سے کوئی سروکار نہ رکھیں گے تو ہمارے اور ان کے بیچ میں جھگڑا ہی کیا رہا۔

جگدھر: ہاں جھگڑے کا مٹ جانا ہی اچھا ہے۔ عداوت اور لڑائی سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

بھیرو: چھوٹے صاحب کو چاہیے کہ آ کر پنڈا جی سے ماپھی (معافی) مانگیں۔ اب وہ کوئی چھوٹے بچہ نہیں ہیں کہ آپ ان کی طرف سے سپارس (سفارش) کریں۔ چھوٹا لڑکا ہوتا تو دوسری بات تھی۔ تب ہم لوگ آپ ہی کو اولنہا دیتے۔ وہ پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ مونچھ داڑھی نکل آئی ہے۔ انہیں خود آکر پنڈا جی سے کہنا سننا چاہیے۔

نا یک رام: ہاں یہ بات پکی ہے۔ جب تک وہ تھوک کر نہ جائیں گے میرے دل سے ملال نہ دور ہوگا۔

جان سیوک: تو تم سمجھتے ہو کہ داڑھی مونچھ آ جانے سے عقل بھی آ جاتی ہے۔ کیا ایسے آدمی نہیں دیکھے ہیں جن کے بال پک گئے ہیں۔ دانت ٹوٹ گئے ہیں اور ابھی تک عقل نہیں آئی۔ پربھو سیوک اگر بے عقل نہ ہوتا تو اتنے آدمیوں کے بیچ میں پنڈا جی جیسے پہلوان پر ہاتھ نہ چلاتا۔ اسے تم کتنا ہی دباؤ، پر وہ معافی نہ مانگے گا۔ رہی زمین کی بات۔ سو اگر تم لوگوں کی مرضی ہے کہ اس معاملہ کو دبا رہنے دوں تو یہی سہی۔ مگر شاید ابھی تک تم لوگوں نے اس مسئلہ پر اچھی طرح غور نہیں کیا۔ ورنہ کبھی مخالفت نہ کرتے۔ بتلائیے پنڈا جی آپ کو اس معاملہ پر کیا اعتراض ہے؟

نا یک رام: بھیرو اس کا جواب دو۔ اب تو صاحب نے تم کو کائل (قائل) کر دیا۔

بھیرو: کائل کیا کر دیا۔ صاحب یہی کہتے ہیں نا کہ چھوٹے صاحب کو اکل (عقل) نہیں ہے تو وہ کوئیں (کنویں) میں کیوں نہیں کود پڑتے۔ اپنے دانتوں سے اپنا ہاتھ کیوں نہیں کاٹ لیتے؟ ایسے آدمیوں کو کوئی کیسے پاگل سمجھ لے؟

جان سیوک: جو آدمی یہ نہ سمجھے کہ کس موقع پر کون سا کام کرنا چاہیے وہ پاگل نہیں تو اور کیا ہے؟

نا یک رام: صاحب انہیں میں پاگل تو کسی طرح نہ مانوں گا۔ ہاں آپ کا منہ دیکھ کر اس سے بیر نہ بڑھاؤں گا۔ آپ کی بنتی نے میرا سر جھکا دیا۔ سچ کہتا ہوں آپ کی بھل منسی نے میرا غصہ ٹھنڈا کر دیا۔ نہیں تو میرے دل میں نہ جانے کتنا گبار (غبار) بھرا ہوا تھا۔ اگر آپ تھوڑی دیر اور نہ آتے تو آج شام تک چھوٹے صاحب اسپتال میں ہوتے۔ آج تک کبھی میری پیٹھ میں دھول نہیں لگی۔ جندگی (زندگی) میں پہلی بار میری اتنی بے عزتی ہوئی اور پہلی بار میں نے ماپھ (معاف) کرنا بھی سیکھا۔ یہ

آپ کی عقل کی برکت ہے۔ میں آپ کی کھوپڑی کو مان گیا۔اب صاحب کی دوسری بات کا جواب دو بجرنگی۔

بجرنگی: اس میں اب کا ہے کا سوال جواب۔ صاحب نے تو کہہ دیا کہ میں اس کا نام نہ لوں گا۔بس جھگڑا مٹ گیا۔

جان سیوک: لیکن اگر زمین کے میرے ہاتھ آنے سے تمہارا سولہوں آنے فائدہ ہوتو تم ہمیں نہ لینے دو گے؟

بجرنگی: ہمارا پھائدہ کیا ہوگا؟ ہم تو مٹی میں مل جائیں گے!

جان سیوک: میں تو دکھا دوں گا کہ تمہارا بھرم ہے۔بتلاؤ تمہیں کیا اعتراض ہے؟

بجرنگی: پنڈا جی کے ہزاروں جاتری آتے ہیں۔وہ سب اسی میدان میں ٹھہرتے ہیں۔دس دس بیس بیس دن پڑے رہتے ہیں۔وہیں کھانا پکاتے ہیں۔وہیں سوتے ہیں۔شہر کے دھرم سالوں میں دیہات کے لوگوں کو آرام کہاں۔یہ دھرتی نہ رہے تو کوئی جاتری یہاں جھانکنے بھی نہ آئے۔

جان سیوک: جاتریوں کے لیے سڑک کے کنارے کھپریل کے مکانات بنوا دیئے جائیں تو کیسا؟

بجرنگی: اتنے مکان کون بنوائے گا؟

جان سیوک: اس کا میرا ذمہ۔میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں یہاں دھرم شالا بنوا دوں گا۔

بجرنگی: میرے محلّہ کے دوسرے آدمیوں کی گائیں بھینسیں کہاں چریں گی؟

جان سیوک: احاطہ میں گھاس چرانے کا تمہیں اختیار رہے گا۔پھر اب تم کو اپنا سارا دودھ لے کر شہر جانا پڑتا ہے۔حلوائی تم سے دودھ لے کر ملائی، مکھن، دہی بناتا ہے اور تم سے کہیں زیادہ خوشحال نظر آتا ہے۔یہ نفع اس کو تمہارے ہی دودھ سے تو ہوتا ہے۔تم ابھی یہاں ملائی مکھن بناؤ تو لے گا کون۔جب یہاں کارخانہ کھل جائے گا تو

ہزاروں آدمیوں کی بستی ہو جائے گی۔ تم دودھ کی بالائی بیچو گے دودھ علیحدہ بکے گا۔ اس طرح تمہیں دوہرا منافع ہوگا۔ تمہارے اپلے گھر بیٹھے بک جائیں گے۔ تمہیں تو کارخانہ کھلنے سے سب نفع ہی نفع ہے۔

نایک رام: آتا ہے سمجھ میں نا بجرنگی۔

بجرنگی: سمجھ میں کیوں نہیں آتا، لیکن ایک میں دودھ کی ملائی بنالوں گا اور لوگ بھی تو ہیں تو دودھ کھانے کے لیے جانور پالے ہوئے ہیں۔ انہیں مشکل پڑے گی۔

ٹھاکر دین: میرے ہی ایک گائے ہے۔ چوروں کا بس چلتا تو اسے بھی لے گئے ہوتے۔ دن بھر وہاں چرتی ہے، سانجھ سیرے (سویرے) دودھ دوہ کر چھوڑ دیتا ہوں۔ دھیلے کا بھی چارا نہیں لینا پڑتا۔ جب تو آٹھ آنے روج (روز) کا بھوسہ بھی پورا نہ پڑے گا۔

جان سیوک: تمہاری پان کی دکان ہے نا، ابھی تم دس بارہ آنے کے پیسے کماتے ہو گے۔ اس وقت تمہاری بکری چوگنی ہو جائے گی۔ ادھر کی کمی ادھر پوری ہو جائے گی۔ مزدوروں کو پیسے کی پکڑ نہیں ہوتی۔ کام سے ذرا فرصت ہوئی کہ کوئی پان پر گرا۔ کوئی سگریٹ پر دوڑا۔ خوانچہ والوں کی بھی خاصی بکری ہو گی اور شراب تاڑی کا تو پوچھنا ہی کیا۔ چاہیے تو پانی کو شراب بنا کر بیچو۔ گاڑی والوں کی مزدوری بڑھ جائے گی۔ یہی محلّہ چوک کا ٹکڑا ہو جائے گا۔ ابھی تمہارے لڑکے پڑھنے کے لیے شہر جاتے ہیں۔ تب یہیں مدرسہ کھل جائے گا۔

جگدھر: کیا کہاں مدرسہ بھی کھلے گا؟

جان سیوک: ہاں کارخانہ کے آدمیوں کے لڑکے آخر پڑھنے کہاں جائیں گے؟ انگریزی بھی پڑھائی جائے گی۔

جگدھر: پھیس کچھ کم لی جائے گی؟

جان سیوک: فیس بالکل ہی نہ لی جائے گی۔ کم زیادہ کیسی!

جگدھر: تب تو بڑا آرام ہو جائے گا۔

نایک رام: جس کا مال ہے اسے کیا ملے گا؟

جان سیوک: جو تم لوگ طے کر دو۔ میں تمہیں کو پنچ مانتا ہوں۔ بس اسے راضی کرنا تمہارا کام ہے۔

نایک رام: وہ راجی ہی ہے۔ آپ نے بات کی۔ بات میں سب کو راجی کر لیا۔ نہیں تو یہاں لوگ من میں نہ جانے کیا کیا سمجھے بیٹھے تھے۔ سچ ہے بدیا بڑی چیز ہے۔

بھیرو: وہاں تاڑی کی دکان کے لیے کچھ دینا تو نہ پڑے گا؟

نایک رام: کوئی اور کھڑا ہو گیا تو ضرور چڑھا اوپری ہو گی۔

جان سیوک: نہیں تمہارا حق سب سے بڑھ کر سمجھا جائے گا۔

نایک رام: تو پھر تمہاری چاندی ہے۔ بھیرو۔

جان سیوک: تو اب میں چلوں پنڈا جی۔ آپ کے دل میں ملال تو نہیں ہے۔

نایک رام: اب کچھ کہلائیے نا۔ آپ کا سا بھلا مانس آدمی کم دیکھا ہے۔

جان سیوک چلے گئے تو بجرنگی نے کہا۔ ''کہیں سورداس راجی نہ ہوئے تو؟''

نایک رام: ہم تو راجی کریں گے۔ چار ہزار روپے دلانے ہیں۔ اب اسی سمجھوتہ میں کسل ہے۔ جمین (زمین) رہ نہیں سکتی۔ وہ آدمی اتنا ہشیار ہے کہ ہم لوگ اس سے پیش نہیں پا سکتے۔ یوں ہی نکل جائے گا تو ہمارے ساتھ یہ سلوک کون کرے گا۔ مفت میں جتنا ملتا ہو تو چھوڑنا نہ چاہیے۔

جان سیوک گھر پہنچے تو ڈنر تیار تھا۔ پربھو سیوک نے پوچھا۔ ''آپ کہاں گئے تھے؟'' جان سیوک نے رومال سے منہ پونچھتے ہوئے کہا۔ ''ہر ایک کام کرنے کو تمیز چاہیے۔ اشعار کہہ لینا دوسری بات ہے۔ کام کر دکھانا دوسری بات! تم ایک کام کرنے گئے۔ محلّہ بھر سے لڑائی ٹھان کر چلے آئے۔ جس وقت میں پہنچا ہوں

سارے آدمی نایک رام کے دروازہ پر جمع تھے۔ وہ ڈولی پر بیٹھ کر شاید راجہ مہیندر سنگھ کے پاس جانے کو تیار تھا۔ مجھے سب نے یوں دیکھا گویا پھاڑ کھائیں گے، لیکن میں نے کچھ اس طرح تحمل اور انکسار سے کام لیا۔ ان کو دلیلوں اور چکنی چپڑی باتوں سے ایسا ڈھرے پر لایا کہ جب وہاں سے چلا تو سب میرا کلمہ پڑھ رہے تھے۔ زمین کا معاملہ بھی طے ہوگیا۔ اس کے ملنے میں اب کوئی رکاوٹ نہیں۔''

پربھو سیوک: پہلے تو سب اس زمین کے لیے مرنے مارنے پر تیار تھے۔

جان سیوک: اور کچھ کسر تھی تو وہ تم نے جا کر پوری کر دی۔ مگر یاد رکھو کہ ایسے معاملات میں ہمیشہ ''ڈرائینگ مومنٹ'' پر نگاہ رکھنی چاہیے۔ یہی کامیابی کی کنجی ہے۔ شکاری جانتا ہے کہ کس وقت ہرن پر نشانہ مارنا چاہیے۔ وکیل جانتا ہے عدالت پر اس کی دلیلوں کا بہترین اثر کب پڑ سکتا ہے۔ ایک مہینہ نہیں ایک دن پہلے میری باتوں کا ان آدمیوں پر ذرا بھی اثر نہ ہوتا۔ کل تمہاری زیادتیوں نے وہ موقع پیدا کر دیا۔ میں معافی کا خواستگار بن کر ان کے سامنے گیا۔ مجھے دب کر، جھک کر، عاجزی سے انکساری سے اپنے مسئلہ کو ان کے سامنے پیش کرنے کا موقع ملا۔ اگر ان کی زیادتی ہوتی تو میری جانب سے بھی سختی کا اظہار ہوتا۔ اس حالت میں دبنا آئین اخلاق کے خلاف ہوتا۔ زیادتی ہماری طرف سے ہوئی۔ بس یہی میری جیت تھی۔

ایشور سیوک بولے: ''یسوع! اس گناہ گار کو اپنے دامن میں لے۔ برف آج کل بہت مہنگی ہوگئی ہے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کیوں اتنی بے دردی سے خرچ کی جاتی ہے۔ صراحی کا پانی تو کافی ٹھنڈا ہوتا ہے۔''

جان سیوک: پاپا معاف کیجیے۔ بلا برف کے پیاس ہی نہیں بجھتی۔

ایشور سیوک: خدا نے چاہا بیٹا تو اس زمین کا معاملہ طے ہو جائے گا۔ آج تم نے بڑی ہوشیاری سے کام کیا۔

مسز سیوک: مجھے ان ہندوستانیوں پر ذرا بھی اعتبار نہیں۔ دغا بازی کوئی ان سے

سیکھ لے۔ ابھی سب کے سب ہاں ہاں کر رہے ہیں۔ موقع پڑنے پر سب نکل جائیں گے۔ مہیندر سنگھ ہی نے دھوکا نہیں دیا۔ یہ قوم ہی ہماری دشمن ہے۔ ان کا بس چلے تو ایک عیسائی بھی ملک میں نہ رہنے پائے۔

پربھوسیوک: ماما یہ آپ کی زیادتی ہے۔ پہلے ہندوستانیوں کو عیسائیوں سے کتنی نفرت رہی ہو، لیکن اب حالت تبدیل ہو گئی ہے۔ ہم خود انگریزوں کی نقل کر کے انہیں چڑاتے ہیں۔ ہر موقع پر انگریزوں کی مدد سے انہیں دبانے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن یہ ہماری سیاسی غلطی ہے۔ ہماری نجات اہل ملک کے ساتھ برادرانہ تعلق رکھنے میں ہے۔ ان پر رعب جمانے میں نہیں۔ آخر ہم بھی تو اسی بھارت ماتا کی اولاد ہیں۔ یہ غیر ممکن ہے کہ گوری قومیں صرف مذہب کے تعلق سے ہمارے ساتھ برابری کا برتاؤ کریں۔ امریکہ کے حبشی عیسائی ہیں، لیکن وہاں کے گورے ان کے ساتھ کتنا وحشیانہ اور ظالمانہ سلوک کرتے ہیں۔ ہماری نجات ہندوستانیوں ہی کے ساتھ ہے۔

مسز سیوک: خدا وہ دن نہ لائے کہ ہم ان کافروں کی دوستی کو اپنی نجات کا ذریعہ بنائیں۔ ہم حکمرانوں کے ہم مذہب ہیں۔ ہمارا مذہب، ہمارا رواج، ہمارا طرز معاشرت وہی ہے جو انگریزوں کا ہے۔ ہم اور وہ ایک کلیسا میں ایک خدا کے سامنے سجدہ کرتے ہیں۔ ہم اس ملک کے حاکم بن کر رہنا چاہتے ہیں۔ محکوم بن کر نہیں۔ تمہیں شاید کنور بھرت سنگھ نے یہ کلمہ پڑھایا ہے۔ کچھ دن اور ان کی صحبت میں رہ کر شاید تم بھی یسوع سے منکر ہو جاؤ۔

پربھوسیوک: مجھے تو عیسائیوں میں بیداری کے کوئی خاص آثار نظر نہیں آتے۔

جان سیوک: پربھوسیوک۔ تم نے ایک بڑا سنجیدہ مسئلہ چھیڑ دیا۔ میرے خیال میں ہمارا مفاد انگریزوں سے رشتۂ اخوت قائم کرنے میں ہے۔ انگریز اس وقت ہندوستانیوں کی متفقہ قوت سے متردد ہو رہے ہیں۔ ہم انگریزوں کے دوست بن کر

ان پر اپنی وفاداری کو سکہ جما سکتے ہیں اور من مانی رعایتیں حاصل کر سکتے ہیں۔ افسوس یہی ہے کہ ہماری قوم نے ابھی تک سیاسی میدان میں قدم ہی نہیں رکھا۔ حالانکہ ملک میں ہماری جماعت سب سے زیادہ تعلیم یافتہ ہے مگر سیاسی دائرہ میں اب تک ہم کوئی اثر نہیں ڈال سکے۔ ہندوستانیوں میں مل کر ہم گم ہو جائیں گے۔ کھو جائیں گے۔ ان سے الگ رہ کر خاص اقتدار اور خاص عزت حاصل کر سکتے ہیں۔

یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک چپراسی نے آ کر ایک خط دیا۔ یہ خط مسٹر کلارک حاکم ضلع کا تھا۔ ان کے یہاں ولایت سے کئی مہمان آئے ہوئے تھے۔ کلارک نے ان کی خاطر سے ایک ڈنر دیا تھا اور مسز سیوک کو مع مس صوفیہ سیوک کے اس میں شریک ہونے کے لیے بلایا تھا۔ ساتھ ہی مسز سیوک سے یہ اصرار بھی کیا گیا تھا کہ صوفیہ کو ایک ہفتہ کے لیے ضرور بلا لیجیے۔

چپراسی کے چلے جانے پر مسز سیوک نے کہا۔ ''صوفی کے لیے یہ سنہری موقع ہے۔''

جان سیوک: ہاں۔ ہے تو پر وہ آئے گی کیسے؟

مسز سیوک: اس کے پاس یہ خط بھیج دوں؟

جان سیوک: صوفی اس کو کھول کر دیکھے گی بھی نہیں۔ اسے جا کر بلا کیوں نہیں لاتیں؟

مسز سیوک: وہ تو آتی ہی نہیں۔

جان سیوک: تم نے کبھی بلایا ہی نہیں۔ آتی کیونکر؟

مسز سیوک: وہ آنے کے لیے کیسی شرط لگاتی ہے۔

جان سیوک: اگر اس کی بھلائی چاہتی ہو تو اپنی شرطیں توڑ دو۔

مسز سیوک: وہ گرجا نہ جائے تو بھی زبان نہ کھولوں؟

جان سیوک: ہزاروں عیسائی کبھی گرجا نہیں جاتے اور انگریز تو بہت کم جاتے ہیں۔

مسز سیوک: خداوند یسوع کی توہین کرے تو بھی چپ رہوں؟

جان سیوک: وہ یسوع کی توہین نہیں کرتی۔ جسے خدا نے ذرا بھی عقل دی ہے وہ خداوند یسوع کی دل و جان سے عزت کرے گا۔ ہندو تک یسوع کا نام عزت کے ساتھ لیتے ہیں۔ اگر صوفی یسوع کو اپنا نجات دہندہ خدا کا بیٹا یا خدا نہیں سمجھتی تو اس پر جبر کیوں کیا جائے۔ کتنے ہی عیسائیوں کو اس قسم کے شکوک ہیں خواہ وہ انہیں علانیہ نہ بیان کریں۔ میرے خیال میں اگر کوئی شخص نیک کاموں کو کرتا ہوا زندگی بسر کرتا ہے اور دل میں ویسے ہی خیالات رکھتا ہے تو وہ اس مسیحی سے کہیں بہتر ہے جو مسیح کا نام تو جپتا ہے پر نیت کا برا ہے۔

ایشور سیوک: یا خدا اس خاندان پر اپنا سایہ پھیلا! بیٹا! ایسی باتیں زبان سے نہ نکالو۔ مسیح کا بندہ کبھی راہ راست سے منحرف نہیں ہو سکتا۔ اس پر مسیح کی نوازش رہتی ہے۔

جان سیوک: (بیوی سے) تم کل صبح چلی جاؤ۔ رانی سے ملاقات ہو جائے گی اور صوفی کو بھی ساتھ لیتی آؤ گی۔

مسز سیوک: اب تو جانا پڑے گا۔ جی تو نہیں چاہتا پر جاؤں گی۔ اسی کی ہٹ رہے۔

سورداس شام کو گھر آیا۔ اس نے سارا حال سنا تو نایک رام سے بولا۔ ''تم نے میری دھرتی صاحب کو دے دی؟''

نایک رام: میں نے کیوں دی؟ مجھ سے واسطہ؟

سورداس: میں تو تمہیں کو سب کچھ سمجھتا تھا اور تمہارے ہی بل پر کودتا تھا، پر آج تم نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ اچھی بات ہے۔ میری بھول تھی کہ تمہارے بل پر پھولا ہوا

تھا۔ یہ اسی کا ڈنڈ ہے۔ اب نیائے کے بل پر لڑوں گا۔ بھگوان ہی کا بھروسہ کروں گا۔

نایک رام: بجرنگی۔ جرا (ذرا) بھیرو کو بلا لو۔ انہیں سب باتیں سمجھا دے۔ میں ان سے کہاں تک مگج (مغز) لڑاؤں۔

بجرنگی: بھیرو کو کیوں بلاؤں؟ کیا میں اتنا بھی نہیں کر سکتا۔ بھیرو کو اتنا سر چڑھا دیا۔ اسی سے اس کو اتنا گھمنڈ ہو گیا ہے۔

یہ کہہ کر بجرنگی نے جان سیوک کی ساری تجویزیں کم و بیش طریقہ پر بیان کر دیں اور بولا۔ "بتاؤ جب کارخانہ سے سب کا پھائدہ ہے تو ہم صاحب سے کیوں لڑیں؟"

سورداس: تمہیں بسواس ہو گیا کہ سب کا پھائدہ ہو گا؟

بجرنگی: ہاں ہو گیا۔ ماننے لائق بات ہوتی ہے تو مانی ہی جاتی ہے۔

سورداس: کل تو تم لوگ دھرتی کے پیچھے جان دینے کو تیار تھے۔ مجھ پر شک کر رہے تھے کہ میں نے صاحب سے میل کر لیا۔ آج صاحب کے ایک ہی چکمہ میں پانی ہو گئے۔

بجرنگی: اب تک کسی نے سب باتیں اتنی سپھائی (صفائی) سے نہ سمجھائی تھیں۔ کارخانہ سے سارے محلّہ کا سرے سہر (شہر) کا پھائدہ (فائدہ) ہے۔ مجوروں کی مجوری بڑھے گی۔ دکانداروں کی بکری بڑھے گی۔ ثواب ہم کو۔ جھگڑا نہیں ہے۔ تم کو بھی ہم یہی صلاح دیتے ہیں کہ چوکھے دام مل رہے ہیں۔ دھرتی کو دے ڈالو۔ یوں نہ دو گے تو جابطے (ضابطے) سے لے لی جائے گی۔ اس سے کیا پھائدہ؟

سورداس: ادھرم اور پاپ کتنا بڑھ جائے گا۔ یہ بھی معلوم ہے؟

بجرنگی: دھن سے ادھرم ہوتا ہی ہے پر دھن کو کوئی چھوڑ نہیں دیتا۔

سورداس: تو اب تم لوگ میرا ساتھ نہ دو گے؟ مت دو۔ جدھر نیائے ہے ادھر کسی کی مدد کی اتنی بھی جرورت نہیں ہے۔ میری چیج (چیز) ہے۔ باپ دادوں کی کمائی

ہے۔ کسی دوسرے کو اس پر کوئی اکھتیار نہیں ہے۔ اگر دھرتی گئی تو اس کے ساتھ میری جان بھی جائے گی۔

یہ کہہ کر سورداس اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے جھونپڑے کے دروازہ پر جا کر نیم کے نیچے لیٹ رہا۔

--------اختتام---حصہ اول--------



(13)

ونے سنگھ کے جانے کے بعد صوفیہ کو ایسا معلوم ہونے لگا کہ رانی جانہوی مجھ سے کچھ کشیدہ خاطر ہیں۔ وہ اب اس کو کتاب یا اخبار پڑھنے کے لیے یا خطوط لکھنے کے لیے بہت کم بلاتیں۔ اس کے حرکات و سکنات کو بھی مشتبہ نگاہوں سے دیکھتیں۔ اگر چہ وہ کنایتہً بھی اپنی بدگمانی کا اظہار نہ کرتیں، لیکن صوفیہ کو یہ خیال ہوتا کہ مجھ پر شک کیا جا رہا ہے۔ وہ جب کبھی باغ میں سیر کرنے چلی جاتی یا کہیں گھومنے کو نکل جاتی تو واپس آنے پر اس کو ایسا معلوم ہوتا کہ میری کتابیں الٹ پلٹ دی گئی ہیں۔ یہ بدگمانی اس وقت اور شاق گزرتی جب ڈاکیہ کے آنے پر رانی صاحبہ خود ہی اس کے ہاتھ سے خطوط لیتیں اور نہایت غور سے دیکھتیں کہ صوفیہ کا کوئی خط تو نہیں ہے۔ کئی بار صوفیہ کو اپنے خطوں کے لفافے پھٹے ہوئے ملے۔ وہ ان بدگمانیوں کے راز کو خوب سمجھتی تھی۔ یہ روک تھام صرف اس لیے ہے کہ میرے اور ونے سنگھ کے درمیان خط و کتابت نہ ہونے پائے۔ پہلے رانی صاحبہ صوفیہ سے ونے اور اندو کا تذکرہ اکثر کیا کرتیں۔ اب بھول کر بھی ونے کا نام نہ لیتیں۔ یہ محبت کا پہلا امتحان تھا!

مگر تعجب یہ تھا کہ صوفیہ میں اب وہ خودداری نہ تھی جو ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیتی تھی۔ اب وہ نہایت بردبار ہو گئی تھی۔ رانی سے نفرت کرنے کے بجائے وہ ان کی بدگمانی دور کرنے کے لیے موقع و محل کی تلاش کیا کرتی تھی۔ اس کو رانی صاحبہ کا طرف عمل بالکل قرین انصاف معلوم ہوتا تھا۔ وہ سوچتی۔ ''ان کی دلی تمنا ہے کہ ونے سنگھ کی زندگی ایک معیارانہ زندگی ہو اور میں اس کی تربیت میں مخل نہ ہوں۔ میں انہیں کس طرح سمجھاؤں کہ آپ کی تمنا کو میرے ہاتھوں ذرا بھی جھونکا نہ لگے گا۔ میں تو خود ہی اپنی زندگی کو ایک ایسے مقصد کے لیے قربان کر چکی ہوں جس کے لیے وہ کافی نہیں۔ میں خود ہی کسی خواہش کو اپنے مقصد کے راستے کا کانٹا نہ بناؤں گی۔'' لیکن اس کو ایسا

موقع نہ ملتا تھا۔ جو باتیں زبان پر نہیں آسکتیں، ان کے لیے موقع نہیں ملتا۔

صوفیہ کو اکثر اپنے دل کی کمزوریوں پر افسوس ہوتا۔ وہ اپنی طبیعت کو ادھر سے ہٹانے کے لیے مطالعہ کتب میں محو ہو جانا چاہتی، لیکن جب کتاب سامنے کھلی رہتی اور دل کہیں اور جا پہنچتا تو وہ جھنجھلا کر کتاب بند کر دیتی اور یہ سوچتی۔ ''یہ میری کیا حالت ہے۔ کیا میرا نفس یہ بھیس اختیار کر کے مجھے راہ راست سے ہٹا دینا چاہتا ہے۔ میں جان کر کیوں انجان بنی جاتی ہوں۔'' تب وہ عہد کرتی کہ میں اس کانٹے کو دل سے نکال ڈالوں گی۔

لیکن عشق و محبت کے دلدادگان کا عہد بزدلوں کی تمنائے جنگ کے مشابہ ہے جو حریف کا نعرہ سنتے ہی ہوا ہو جاتا ہے۔ صوفیہ ونے کو تو بھول جانا چاہتی تھی مگر اس کے ساتھ ہی اس کو اندیشہ لگا رہتا تھا کہ کہیں وہ مجھے بھول نہ جائیں۔ جب کئی روز تک ان کا کوئی حال نہ ملا تو اس نے سمجھا۔ ''مجھے بھول گئے۔ ضرور بھول گئے۔ مجھے ان کا پتہ معلوم ہوتا تو شاید ہر روز ایک خط لکھتی۔ روز کئی خط بھیجتی۔ مگر ان کو ایک خط لکھنے کی بھی فرصت نہیں۔ وہ مجھے بھول جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اچھا ہی ہے۔ وہ ایک عیسائی عورت سے کیوں محبت کرنے لگے۔ ان کے لیے کیا ایک سے ایک نہایت خوب صورت، تعلیم یافتہ اور خوش اخلاق راجکماریاں نہیں ہیں۔''

ایک روز ان خیالات نے اس کو اس قدر بیتاب کیا کہ وہ رانی کے کمرہ میں جا کر ونے کے خطوط کو پڑھنے لگی۔ دم کے دم میں اس کے سارے خطوط پڑھ ڈالے۔ دیکھوں میری طرف کوئی اشارہ ہے یا نہیں؟ کوئی فقرہ ایسا ہے جس میں سے محبت کی خوشبو آئے، لیکن ایسا ایک لفظ بھی نہ تھا جس سے کھینچ تان کرنے پر بھی وہ کوئی پوشیدہ بات پیدا کر سکتی۔ ہاں اس کوہستانی علاقہ میں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا ان کا مفصل تذکرہ کیا گیا تھا۔ جوان العمری کو مبالغہ سے انس ہوتا ہے۔ ہم مشکلات پر فتح پا کر نہیں بلکہ ان کی طولانی صراحت سے اپنا وقار دلوں پر قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اگر

معمولی حرارت ہے تو اسے سرسامی بخار کہا جاتا ہے۔ ایک روز پہاڑوں پر چلنا پڑا تو اسے روزانہ پہاڑوں سے سر ٹکرانا بتلایا جاتا ہے۔ ونے سنگھ کے خطوط اسی قسم کی بہادرانہ داستانوں سے معمور تھے۔ صوفیہ پڑھ کر بے قرار ہوگئی۔ وہ اتنی سختیاں جھیل رہے ہیں اور میں یہاں آرام سے پڑی ہوں۔ وہ اسی سراسیمگی کی حالت میں اپنے کمرہ میں آئی اور ونے کو ایک طولانی خط لکھا جس کا ایک ایک لفظ محبت میں ڈوبا ہوا تھا۔ خاتمہ پر اس نے نہایت دردناک الفاظ میں استدعا کی کہ مجھے اپنی خدمت میں آنے کی اجازت دیجیے۔ میں اب یہاں نہیں رہ سکتی۔ اس کا انداز بیان نادانستہ طور پر شاعرانہ ہوگیا۔ خط پورا کرکے وہ اسی وقت قریب کے لیٹر بکس میں ڈال آئی۔

خط چھوڑ دینے کے بعد جب اس کو سکون ہوا تو اسے خیال آیا کہ رانی صاحبہ کے کمرہ میں چھپ کر جانا اور خطوں کو پڑھنا کسی طرح مناسب نہ تھا۔ وہ سارا دن اسی فکر میں پڑی رہی۔ بار بار اپنے کو ملامت کرتی۔ ایشور میں کتنی بدنصیب ہوں۔ میں نے اپنی زندگی سچے مذہب کی تلاش کے لیے وقف کر دی تھی۔ برسوں سچائی کی تحقیقات میں مصروف ہوں مگر نفس کی پہلی ہی ٹھوکر میں نیچے گر پڑی۔ میں کیوں اتنی کمزور ہوگئی ہوں۔ کیا میرا پاک مقصد نفسانی خواہشات کے بھنور میں پڑ کر ڈوب جائے گا۔ میری عادت اتنی بری ہو جائے گی کہ میں کسی کی چیزیں چراؤں گی۔ یہ بات تو کبھی میرے خواب و خیال میں نہ آئی تھی۔ جن کا مجھ پر اتنا اعتبار، اتنا بھروسہ، اتنی محبت، اتنی مہربانی ہے انہیں کے ساتھ میری یہ دغابازی! اگر ابھی یہ حالت تو بھگوان ہی جانے آگے چل کر کیا حالت ہوگی۔ اس سے تو یہ کہیں بہتر ہے کہ زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔ کاش وہ خط جسے میں ابھی ڈال آئی ہوں واپس مل جاتا تو میں اس کو ابھی چاک کر ڈالتی!

وہ اسی تفکر و پشیمانی کی حالت میں بیٹھی ہوئی تھی کہ رانی صاحبہ کمرہ میں آ گئیں۔ صوفیہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنی آنکھیں چھپانے کے لیے زمین کی طرف تاکنے لگی

لیکن آنسو پی جانا آسان نہیں ہے۔ رانی نے کرخت آواز سے پوچھا۔ ''صوفی کیوں روتی ہو؟''

جب ہم اپنی غلطی پر نادم ہوتے ہیں تو سچ بات خود بخود ہمارے منہ سے نکل پڑتی ہے۔ صوفی ہچکچاتی ہوئی بولی۔ ''جی کچھ نہیں...... مجھ سے ایک خطا سرزد ہوگئی ہے۔ آپ سے اس کی معافی چاہتی ہوں۔''

رانی نے زیادہ کرخت لہجہ میں پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟''

صوفی: آج جب آپ سیر کرنے گئی تھیں تو میں آپ کے کمرہ میں چلی گئی تھی۔

رانی: کیا کام تھا؟

صوفی کا چہرہ شرم سے سرخ ہوگیا۔ بولی۔ ''میں نے آپ کی کوئی چیز نہیں چھوئی۔''

رانی: میں تم کو اتنا نیچ نہیں سمجھتی۔

صوفی: ایک....... ایک خط دیکھنا تھا۔

رانی: ونے سنگھ کا؟

صوفیہ نے سر جھکا لیا۔ وہ اپنی نگاہوں میں خود اتنی ذلیل ہوگئی تھی کہ جی چاہتا تھا زمین پھٹ جاتی اور میں اس میں سما جاتی۔ رانی نے حقارت آمیز لہجہ میں کہا۔ ''صوفی! تم مجھ کو احسان فراموش سمجھو گی مگر میں نے تمہیں اپنے گھر میں رکھ کر بڑی غلطی کی۔ ایسی غلطی میں نے کبھی نہ کی تھی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ تم آستین کا سانپ بنو گی۔ اس سے بہت بہتر ہوتا کہ ونے اسی روز آگ میں جل گیا ہوتا۔ تب مجھے اس قدر رنج نہ ہوتا، میں تمہارے طرز عمل کو پہلے نہ سمجھی۔ میری آنکھوں پر پردہ پڑا تھا۔ تم جانتی ہو میں نے کیوں ونے کو اتنی جلدی یہاں سے بھگا دیا۔ تمہاری ہی وجہ سے۔ تمہاری محبت کے حملوں سے بچانے کی غرض سے، لیکن اب بھی تم قسمت کی طرح اس کا دامن نہیں چھوڑتیں۔ آخر تم اس سے کیا چاہتی ہو؟ تمہیں معلوم ہے کہ تم سے اس کا بیاہ نہیں ہوسکتا۔ اگر میں حیثیت اور خاندانی رواج کا لحاظ نہ کروں تو بھی

تمہارے اور ہمارے درمیان مذہب کی دیوار کھڑی ہے۔ اس محبت کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ تم اپنے ساتھ اس کو بھی لے ڈوبو گی اور میری دیرینہ تمناؤں کو خاک میں ملا دو گی۔ میں ونے کو ایسا انسان بنانا چاہتی ہوں جس پر قوم کو فخر ہو۔ جس کے دل میں لگن ہو، ہمت ہو، استقلال ہو۔ جو خطرات کے سامنے منہ نہ موڑے۔ جو قوم کی خدمت کے لیے ہمیشہ سر کو ہتھیلی پر لیے رہے۔ جس میں نفس پروری کا شائبہ بھی نہ ہو۔ جو خود کو دھرم پر قربان کر دے۔ میں اسے سپوت بیٹا، وفادار دوست اور بے غرض خادم بنانا چاہتی ہوں۔ مجھے اس کی شادی کا شوق نہیں۔ اپنے پوتوں کو گود میں کھلانے کی خواہش نہیں۔ ملک میں نفس پرست مردوں اور اولاد پرست عورتوں کی کمی نہیں۔ زمین ان کے بوجھ سے دبی جاتی ہے۔ میں اپنے بیٹے کو سچا راجپوت بنانا چاہتی ہوں۔ آج وہ کسی کی حفاظت کے لیے اپنی جان دے دے تو مجھ سے زیادہ خوش نصیب ماں دنیا میں نہ ہوگی۔ تم میرے اس سنہرے خواب کو پریشان کر رہی ہو۔ میں تم سے سچ کہتی ہوں صوفی! اگر تمہارے احسانات کے بوجھ سے دبی نہ ہوتی تو تمہیں اس حالت میں زہر دے کر راستہ سے ہٹا دینا اپنا فرض سمجھتی۔ میں راجپوتنی ہوں۔ مرنا بھی جانتی ہوں اور مارنا بھی۔ اس سے قبل کہ ونے سے تمہیں خط و کتابت کرتے دیکھوں، میں تمہارا گلا گھونٹ دوں گی۔ میں تم سے التجا کرتی ہوں کہ ونے کو اپنے دام محبت میں پھنسانے کی کوشش نہ کرو ورنہ اس کا نتیجہ برا ہوگا۔ تمہیں ایشور نے فہم و فراست عطا کی ہے۔ عقل سے کام لو میرے خاندان کو یک لخت تباہ مت کرو۔''

صوفی نے روتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اجازت دیجیے۔ آج یہاں سے چلی جاؤں۔''

رانی کچھ نرم ہو کر بولیں۔ ''میں تمہیں جانے کو نہیں کہتی۔ تم میرے سر آنکھوں پر رہو (نادم ہو کر) میری زبان سے اس وقت جو ثقیل الفاظ نکلے ہیں، ان کے لیے مجھے

معاف کر دو۔ بڑھے آدمی زود رنج ہوتے ہیں۔ یہ تمہارا گھر ہے۔ شوق سے رہو۔ ونے اب شاید پھر نہ آئے گا۔ ہاں وہ شیر کا مقابلہ کر سکتا ہے پر میرے غصہ کا مقابلہ نہیں۔ وہ جنگلوں کی خاک چھانے گا لیکن اب گھر نہ آئے گا۔ اگر تمہیں اس سے محبت ہے تو اپنے کو اس کی بہبود کی خاطر قربان کرنے کو تیار ہو جاؤ۔ اب اس کی سلامتی کی صرف ایک ہی تدبیر ہے۔ جانتی ہو وہ کیا ہے؟''

صوفی نے سر ہلا کر کہا۔ ''نہیں۔''

رانی: جاننا چاہتی ہو؟

صوفی نے سر ہلا کر کہا۔ ''ہاں۔''

رانی: قربانی کے لیے تیار ہو؟

صوفی نے پھر سر ہلا کر کہا۔ ''ہاں۔''

رانی: تو تم کسی قابل شخص سے شادی کر لو۔ ونے کو دکھا دو کہ تم اسے بھول گئیں۔ تمہیں اس کی فکر نہیں ہے۔ یہی مایوسی اس کو بچا سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ مایوسی اس کو زندگی سے بیزار کر دے۔ وہ گیان کے حصول کا سہارا لے جو مایوسی کی واحد جائے پناہ ہے، لیکن ایسا امکان ہونے پر بھی اس کے سوا دوسری تدبیر نہیں ہے۔ تم منظور کرتی ہو؟

صوفی رانی کے پیروں پر گر پڑی اور روتی ہوئی بولی۔ ''ان کی بہتری کے لیے..کر سکتی ہوں۔''

رانی نے صوفی کو اٹھا کر گلے لگا لیا اور رقت آمیز لہجہ میں بولیں۔ ''میں جانتی ہوں تم ان کے لیے سب کچھ کر سکتی ہو۔ ایشور تمہیں اس عہد کو پورا کرنے کی طاقت عطا کریں۔''

یہ کہہ کر رانی جانہوی وہاں سے چلی گئیں۔ صوفی ایک کوچ پر بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر زار و قطار رونے لگی۔ اس کا بال بال پشیمانی سے تکلیف پا رہا

تھا۔ اسے رانی پر غصہ نہ تھا۔ اسے ان پر بے حد اعتقاد تھا۔ کتنا بلند اور پاک مقصد ہے؟ دراصل میں ہی دودھ کی مکھی ہوں اور مجھی کو نکل جانا چاہیے، لیکن رانی کا آخری حکم اس کے لیے تلخ ترین لقمہ تھا۔ وہ جوگن بن سکتی تھی لیکن محبت کو بدنام کرنے کے خیال ہی سے اس کو نفرت ہوتی تھی۔ اس کی حالت اس فقیر کی سی تھی، جو کسی باغ میں سیر کرنے جائے اور پھل توڑنے کے جرم میں گرفتار کرلیا جائے۔ ونے کے ایثار نے اسے ان کا عقیدت مند بنادیا۔ عقیدت نے جلد ہی محبت کی شکل اختیار کرلی اور اب وہی محبت اس کو جبراً دوزخ کی تاریکی کی طرف کھینچے لیے جارہی تھی! اگر وہ ہاتھ پیر چھڑاتی ہے تو خوف ہے...وہ اس کے آگے کچھ نہ سوچ سکی۔ سوچنے کی طاقت زائل ہوگئی۔ سارے تفکرات، ساری پشیمانیاں، ساری مایوسی، ساری تکلیف ایک دم سر میں سما کر غائب ہوگئیں!

شام ہوگئی تھی۔ صوفیہ من مارے اداس بیٹھی ہوئی باغ کی طرف ٹکٹکی لگائے تاک رہی تھی جیسے کوئی بیوہ اپنے خاوند کے سوگ میں محو ہو۔ یکایک پربھوسیوک کمرہ میں داخل ہوئے۔

صوفیہ نے پربھوسیوک سے کوئی بات نہ کی۔ چپ چاپ اپنی جگہ پر بت بنی بیٹھی رہی۔ وہ اس حالت میں پہنچ گئی تھی جب ہمدردی سے بھی رغبت نہیں باقی رہتی۔ ناامیدی کا آخری درجہ ترک تعلق ہے۔

لیکن پربھوسیوک اپنی نئی تصنیف سنانے کے لیے اس قدر بیتاب تھے کہ صوفی کے چہرہ کی طرف ان کا دھیان ہی نہ گیا۔ آتے ہی بولے۔ ''صوفی! دیکھو۔ آج رات میں نے یہ نظم لکھی ہے۔ ذرا غور سے سننا۔ میں نے ابھی کنور صاحب کو سنائی۔ وہ نہایت محظوظ ہوئے۔''

یہ کہہ کر پربھوسیوک نے شیریں بیانی کے ساتھ اپنی نظم پڑھنی شروع کی۔ شاعر نے اس دارفانی کے ایک غمزدہ دل کے وہ جذبات منظور کیے تھے جو ستاروں کو دیکھ کر اس

میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ ایک ایک شعر جھوم جھوم کر پڑھتے تھے اور اس کو دو دو تین تین بار دہراتے تھے، لیکن صوفیہ نے ایک بار بھی داد نہ دی۔ گویا اس میں سخن فہمی کا احساس باقی نہیں رہا تھا۔ نظم کو ختم کر کے پربھوسیوک نے پوچھا۔ ''اس کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟''

صوفیہ نے کہا۔ ''اچھی تو ہے۔''

پربھوسیوک: میرے اشعار پر تم نے دھیان نہیں دیا۔ آج تک کسی شاعر نے بھی ستاروں کو ملائک کی ارواح سے تشبیہ نہیں دی ہے۔ مجھے تو یقین ہے کہ اس نظم کی اشاعت ہوتے ہی شعراء کی جماعت میں ہلچل پیدا ہو جائے گی۔

صوفیہ: مجھے تو یاد آتا ہے کہ شیلی اور ورڈسورتھ اس استعارہ کو پہلے ہی استعمال کر چکے ہیں۔ یہاں کے شاعروں نے بھی کچھ ایسے ہی استعارے باندھے ہیں۔ شاید ہیوگو کی ایک نظم کا عنوان بھی یہی ہے۔ ممکن ہے تمہارا تخیل ان کے تخیل سے لڑ گیا ہو۔

پربھوسیوک: میں نے استادوں کا کلام تم سے زیادہ دیکھا ہے، لیکن یہ تشبیہ مجھ کو کہیں بھی نہیں دکھائی دی۔

صوفیہ: خیر، ہوسکتا ہے مجھی کو یاد نہ ہو گا۔ نظم بری نہیں ہے۔

پربھوسیوک: اگر کوئی دوسرا شاعر یہ اعجاز پیدا کرے تو اس کی غلامی کرنے کو تیار ہوں۔

صوفیہ: تو میں کہوں گی کہ تمہاری نگاہ میں اپنی آزادی کی قیمت بہت زیادہ نہیں ہے۔

پربھوسیوک: تو میں بھی یہی کہوں گا کہ سخن فہمی میں کمال حاصل کرنے کے لیے ابھی تمہیں بہت زیادہ مشق کی ضرورت ہے۔

صوفیہ: مجھے اپنی زندگی میں اس سے زیادہ اہم کام کرنے ہیں۔ آج کل گھر کی کیا کیفیت ہے؟

پر بھوسیوک: وہی پرانی کیفیت ۔ میں تو عاجز آ گیا ہوں ۔ پاپا کو اپنے کارخانہ کی دھن لگی ہوئی ہے اور مجھے اس کام سے نفرت ہے ۔ پاپا اور ماما دونوں ہر وقت جھنجھناتے رہتے ہیں ۔ کسی کا منہ سیدھا ہی نہیں ہوتا ۔ کہیں ٹھکانا نہیں ملتا ورنہ اس حرص کے آشیانے میں ایک منٹ بھی نہ رہتا ۔ کہاں جاؤں ۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا ۔

صوفیہ: بڑے تعجب کی بات ہے ۔ اس قدر عالم اور ہنرمند ہو کر بھی تمہیں اپنی گزر بسر کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی ۔ شاید تخیل کی دنیا میں خودداری کے لیے کہیں بھی جگہ نہیں ۔

پر بھوسیوک: صوفی! میں اور سب کچھ کر سکتا ہوں مگر خانگی تفکرات کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا ۔ میں بے فکر، آزاد اور بے لوث رہنا چاہتا ہوں ۔ ایک خوشنما باغ میں کسی گھنے درخت کے نیچے چڑیوں کے نغمے سنتا ہوا فکر شعر میں محو ہو کر پڑا رہوں ۔ یہی میری زندگی کا معیار ہے ۔

صوفیہ: تمہاری زندگی اسی طرح خواب دیکھنے میں گزرے گی ۔

پر بھوسیوک: کچھ ہو ۔ فکر سے نجات حاصل ہے ۔ آزاد تو ہوں ۔

صوفیہ: جہاں ضمیر اور اصولوں کا خون ہوتا ہے، وہاں سے آزادی کوسوں دور بھاگتی ہے ۔ میں اس کو آزادی نہیں کہتی ۔ یہ بے حیائی ہے ۔ والدین کی بے رحمی کم تکلیف دہ نہیں ہوتی بلکہ دوسروں کا ظلم اتنا ناقابل برداشت نہیں ہوتا جتنا کہ والدین کا ۔

پر بھوسیوک: اونہہ ۔ دیکھا جائے گا ۔ سر پر جو پڑے گی، جھیل لوں گا ۔ مرنے سے پہلے ہی کیوں روؤں؟

یہ کہہ کر پر بھو نے پانڈے پور کا واقعہ بیان کیا اور اتنی ڈینگیں ماریں کہ صوفی چڑ کر بولی ۔ ”رہنے بھی دو ایک گنوار کو پیٹ لیا تو کون سا بڑا کام کیا ۔ اپنی نظموں میں تو عدم تشدد کا مجسمہ بن جاتے ہو اور وہاں ذرا سی بات پر اتنا جامہ سے باہر ہو گئے ۔“

پربھوسیوک: گالی سہہ لیتا؟

صوفیہ: جب تم مارنے والے کو بھی مارو گے۔ گالی دینے والے کو بھی مارو گے تو عدم تشدد والے اصول پر کاربند کب ہو گے۔ راہ چلتے تو کسی کو کوئی نہیں مارتا۔ واقعی کسی نوجوان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ نصیحت کرے۔ خواہ اس کی شاعرانہ قوت کتنی ہی زبردست ہو۔ نصیحت کرنا مشاق اور پختہ کار لوگوں ہی کا کام ہے۔ یہ نہیں کہ جس کو ذرا بھی تک بندی آ گئی وہ لگا امن، برداشت اور عدم تشدد کا سبق پڑھانے! جو بات دوسروں کو سکھلانا چاہتے ہو وہ پہلے خود تو سیکھ لو۔

پربھوسیوک: ٹھیک یہی بات ونے نے بھی اپنے خط میں لکھی ہے۔ لو یاد آ گیا۔ یہ تمہارا خط ہے۔ مجھے یاد ہی نہیں رہی تھی۔ یہ تذکرہ نہ چھڑ جاتا تو جیب میں رکھے ہی لوٹ جاتا۔

یہ کہتے ہوئے پربھوسیوک نے ایک لفافہ نکال کر صوفیہ کے ہاتھ میں رکھ دیا۔

صوفیہ نے پوچھا۔ ''آج کل کہاں ہیں؟''

پربھوسیوک: اودے پور کے کوہستانی علاقوں میں گھوم رہے ہیں۔ میرے نام جو خط آیا ہے اس میں تو انہوں نے صاف لکھا ہے کہ میں اس خدمتی کام کے بالکل ناقابل ہوں۔ مجھ میں اتنی قوت برداشت نہیں جتنی ہونی چاہیے۔ شباب کا زمانہ تجربہ حاصل کرنے کا زمانہ ہے۔ پختہ عمری ہی میں کارہائے عامہ میں شامل ہونا چاہیے۔ کسی جوان کو خدمتی کام کرنے کے لیے بھیجنا ویسا ہی ہے جیسے کسی کمسن طبیب کو مریض کی تکلیف رفع کرنے کے لیے بھیجنا۔

پربھوسیوک چلے گئے تو صوفیہ سوچنے لگی۔ یہ خط پڑھوں یا نہ پڑھوں۔ ونے اس کو رانی صاحبہ سے پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں۔ ورنہ یہیں کے پتہ پر نہ بھیجتے۔ میں نے ابھی رانی صاحبہ سے وعدہ کیا ہے کہ ان سے خط و کتابت نہ کروں گی۔ اس خط کو کھولنا روا نہیں۔ رانی صاحبہ کو دکھا دوں۔ اس سے ان کے دل میں میری طرف سے جو

بدگمانی ہے وہ دور ہو جائے گی۔ مگر معلوم نہیں۔ کیا باتیں لکھی ہیں۔ ممکن ہے کوئی ایسی بات ہو جو رانی کے غصہ کو اور بھی تیز کر دے۔ نہیں۔ اس خط کو پوشیدہ ہی رکھنا چاہیے۔ رانی کو سکھانا درست نہیں۔

اس نے پھر سوچا۔ پڑھنے سے کیا فائدہ۔ نہ جانے میرے دل کی کیا کیفیت ہو۔ مجھے اب اپنے اوپر اعتماد نہیں رہا۔ اب اس محبت کے پودے کو بیخ و بن، سے اکھاڑنا ہی ہے تو اسے کیوں سینچوں۔ اس خط کو رانی کے حوالہ کر دینا ہی مناسب ہے۔

صوفیہ نے اور زیادہ سوچ بچار نہ کیا۔ شک ہوا کہ کہیں میں اپنے نفس پر قابو نہ رکھ سکوں۔ چھلنی میں پانی نہیں ٹھہرتا۔

اس نے اسی وقت وہ خط لے جا کر رانی کو دے دیا۔ انہوں نے پوچھا کہ کس کا خط ہے؟ یہ تو ونے کی تحریر معلوم ہوتی ہے۔ تمہارے نام آیا نا؟ تم نے لفافہ کھولا نہیں؟

صوفیہ: جی نہیں۔

رانی نے خوش ہو کر کہا۔ ''میں تمہیں اجازت دیتی ہوں کہ اسے پڑھو۔ تم نے اپنا قول نباہا ہے۔ اس سے میں خوش ہوں۔''

صوفیہ: مجھے معاف کیجیے۔

رانی: میں خوشی سے کہتی ہوں۔ پڑھو۔ دیکھو کیا لکھتے ہیں۔

صوفیہ: جی نہیں۔

رانی نے خط جوں کا توں صندوق میں بند کر دیا۔ خود بھی نہیں پڑھا۔ کیونکہ ایسا کرنا آئین آداب کے خلاف تھا۔ پھر صوفیہ سے بولی۔ ''بیٹی! اب میری تم سے ایک التجا اور ہے۔ ونے کو خط لکھو اور اس میں صاف لکھ دو کہ ہماری اور تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ آئندہ ہم دونوں میں صرف بھائی بہن کا تعلق رہے۔ تمہارے خط سے یہ ظاہر ہونا چاہیے کہ تم ان کی محبت کے بہ نسبت ان کے قومی جذبات کی زیادہ قدر کرتی ہو۔ تمہارا یہ خط میرے اور ان کے والد کے ہزاروں نصائح سے زیادہ موثر ہوگا۔ مجھے

یقین ہے کہ تمہارا خط پاتے ہی ان کی طبیعت بدل جائے گی اور وہ فرض کے راستہ پر مستعدی سے گامزن ہوں گے۔ میں اس مہربانی کے لیے تمام عمر تمہاری ممنون رہوں گی۔" صوفیہ نے مغموم لہجہ میں کہا۔ "آپ کے ارشاد کی تعمیل کروں گی۔"

رانی: نہیں۔ صرف میرے ارشاد کی تعمیل کافی نہیں ہے۔ اگر یہ ظاہر ہوا کہ کسی ترغیب سے لکھا گیا ہے تو اس کا اثر جاتا رہے گا۔

صوفیہ: آپ کو خط لکھ کر دکھلا دوں؟

رانی: نہیں۔ تمہی بھیج دینا۔

صوفیہ جب وہاں سے آ کر خط لکھنے بیٹھی تو اس کو سوجھتا ہی نہ تھا کہ کیا لکھوں۔ سوچنے لگی۔ وہ مجھے بے درد خیال کریں گے۔ اگر لکھ دوں کہ میں نے تمہارا خط پڑھا ہی نہیں تو انہیں کتنا رنج ہوگا۔ کیسے کہوں کہ میں تم سے محبت نہیں کرتی۔

وہ میز پر سے اٹھ کھڑی ہوئی اور طے کر لیا کہ کل لکھوں گی۔ ایک کتاب پڑھنے لگی۔ کھانے کا وقت آ گیا۔ نو بج گئے۔ ابھی وہ منہ ہاتھ دھو کر بیٹھی تھی کہ اس نے رانی کو دروازہ سے اندر کی طرف جھانکتے دیکھا۔ سمجھی کہ کسی کام سے جا رہی ہوں گی۔ پھر کتاب دیکھنے لگی۔ پندرہ منٹ بھی نہ گزرے ہوں گے کہ رانی پھر دوسری طرف سے لوٹیں اور انہوں نے کمرہ میں پھر جھانکا۔

صوفیہ کو ان کا اس طرح منڈلانا نہایت ناگوار معلوم ہوا۔ اس نے سمجھا۔ "یہ مجھے بالکل کاٹھ کی پتلی بنانا چاہتی ہیں کہ بس ان کے اشاروں پر ناچا کروں۔ اتنا تو نہ ہو سکا کہ جب میں نے بند لفافہ ان کے ہاتھ میں رکھ دیا تو مجھے خط پڑھ کر سنا دیتیں۔ آخر میں لکھوں کیا؟ نہیں معلوم کہ انہوں نے اپنے خط میں کیا لکھا ہے؟ دفعتاً اس کو خیال ہوا کہ میرا خط نصیحت کی شکل نہ اختیار کرے۔ وہ اسے پڑھ کر شاید مجھ سے چڑ جائیں۔ اپنے محبت کرنے والوں سے ہم سبق و نصیحت کی باتیں نہیں بلکہ محبت اور دلدہی کی باتیں سننا چاہتے ہیں۔ بڑی خیریت ہوئی۔ ورنہ وہ میری نصیحت آمیز

تحریر کو پڑھ کر نہ جانے اپنے دل میں کیا سمجھتے۔ انہیں خیال ہوتا کہ گرجا میں وعظ سنتے سنتے اس کے جذبات محبت افسردہ و بے حس ہو گئے ہیں۔ اگر وہ مجھے ایسا خط لکھتے تو مجھے کتنا برا معلوم ہوتا۔ آہ میں نے بڑا دھوکا کھایا۔ پہلے میں نے سمجھا تھا کہ ان سے صرف روحانی محبت کروں گی۔ اب معلوم ہو رہا ہے کہ روحانی محبت یا عقیدت صرف مذہبی دنیا کے لیے مخصوص ہے۔ عورت اور مرد میں پاک محبت ہونی غیر ممکن ہے۔ محبت پہلے انگلی پکڑ کر فوراً پہنچا پکڑتی ہے۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ یہ محبت مجھے علم حقیقی کے بلند ترین معیار سے نیچے گرا رہی ہے۔ ہم کو زندگی اس لیے عطا کی گئی ہے کہ پاکیزہ خیالی اور نیک اعمالی سے اس کو اونچے مدارج پر پہنچائیں۔ یہاں تک کہ ایک روز نور ازلی میں محو ہو کر نیست ہو جائیں۔ یہ بھی جانتی ہوں کہ زندگی فانی ہے۔ چند روزہ ہے اور دنیا کی ساری مسرتیں بھی فانی اور چند روزہ ہیں۔ یہ سب جانتے ہوئے بھی پروانہ کی طرح شمع پر گر رہی ہوں۔ اسی لیے کہ محبت میں وہ بے خودی ہے کہ جو عقل، احتیاط اور ارادہ پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ اہل تصوف بھی جو روحانی مسرتوں سے بہرہ اندوز ہوتے رہتے ہیں۔ خواہشات نفسانی سے مبرا نہیں رہ سکتے۔ جیسے کوئی جبراً کھینچے لیے جا رہا ہو۔ اس کو جانے سے منع کرنا کتنی بڑی بے انصافی ہے۔''

دکھی لوگوں کے لیے رات ایک کٹھن تپسیا سے کم نہیں ہے۔ جوں جوں رات گزرتی تھی۔ صوفی کی بے چینی بڑھتی جاتی تھی۔ آدھی رات تک اپنے اندرونی جذبات سے لگاتار مقابلہ کرنے کے بعد اس نے بالآخر مجبور ہو کر اپنے دل کے دروازے عشق و محبت کی خوش فعلیوں کے لیے کھول دیئے۔ جیسے کسی تماشا کا منیجر تماشائیوں کی کثرت سے تنگ آ کر تماشا گاہ کو عوام کے لیے کھول دیتا ہے۔ باہر کا شور اندر کی نغمہ سرائیوں میں مخل ہوتا ہے۔ صوفی نے اپنے کو عشقیہ خیالات کی گود میں ڈال دیا اور بلا کسی ہچک یا رکاوٹ کے ان خیالات سے یوں لطف اندوز ہونے لگی۔ کیوں و نے تم

میرے لیے کیا کیا مصیبتیں جھیلو گے! بے عزتی، ذلت، نفرت، والدین کی مخالفت، تم میرے لیے یہ سب باتیں سہہ لوگے؟ لیکن مذہب؟ وہ دیکھو تمہارا چہرہ اداس ہو گیا۔ تم سب کچھ کرو گے۔ پر مذہب نہیں ترک کر سکتے۔ میری بھی یہی کیفیت ہے۔ میں تمہارے ساتھ فاقہ کر سکتی ہوں۔ ذلت، حقارت، رسوائی سب برداشت کر سکتی ہوں۔ پر مذہب کو کس طرح ترک کروں؟ یسوع کا دامن کیسے چھوڑ دوں؟ عیسائیت کی مجھے پروا نہیں۔ یہ صرف خودغرضیوں کا ایک مجموعہ ہے لیکن اس مقدس روح سے کیونکر منحرف ہو سکتی ہوں جو سراپا عفو و رحم تھی۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ میں یسوع کے دامن سے وابستہ رہ کر بھی اپنی محبت کی خواہشات کو آسودہ کر سکوں۔ ہندو مذہب کے وسیع دامن میں کس کے لیے گنجائش نہیں۔ خدا کا ماننے والا بھی ہندو ہے۔ نہ ماننے والا بھی ہندو ہے۔ ۳۳ کروڑ دیوتاؤں کا ماننے والا بھی ہندو ہے۔ جہاں مہابیر کے بھگتوں کے لیے جگہ ہے۔ مہاتما بدھ کے بھگتوں کے لیے جگہ ہے وہاں، کیا عیسیٰ کے بھگتوں کے لیے جگہ نہیں ہے۔ تم نے مجھے محبت کی نوید دی ہے۔ میں اس کو نامنظور کیوں کروں۔ میں بھی تمہارے ساتھ خدمتی کاموں میں مشغول ہو جاؤں گی۔ تمہارے ساتھ جنگلوں میں پھروں گی۔ جھونپڑیوں میں رہوں گی! آہ۔ مجھ سے بڑی غلطی ہوئی۔ میں نے وہ خط رانی صاحبہ کو ناحق دے دیا۔ میرا خط تھا۔ مجھے اس کے پڑھنے کا پورا حق تھا۔ میرے اور ان کے درمیان میں محبت کا رشتہ ہے، جو دنیا کے اور سبھی رشتوں سے پاکیزہ اور افضل ترین ہے۔ میں اس بارے میں اپنے حق سے دست بردار ہو کر ونے کے ساتھ ناانصافی کر رہی ہوں۔ نہیں میں ان سے دغا کر رہی ہوں میں محبت کو بدنام کر رہی ہوں۔ اور ان کے دلی جذبات کا مضحکہ اڑا رہی ہوں۔ وہ میرا خط پڑھے بغیر ہی پھاڑ کر پھینک دیتے تو مجھے اتنا رنج ہوتا کہ انہیں کبھی معاف نہ کرتی۔ کیا کروں؟ جا کر رانی صاحبہ سے وہ خط مانگ لوں؟ اسے دینے میں ان کو کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ دل میں خواہ کتنا ہی برا مانیں، پر میری

امانت مجھے ضرور لوٹا دیں گی۔ وہ میری ماما کی طرح تنگ دل نہیں ہیں۔ مگر ان سے مانگوں کیوں۔ وہ تو میری چیز ہے۔ کسی اور شخص کا اس پر ذرا بھی اختیار نہیں۔ اپنی چیز لے لینے کے لیے میں کسی دوسرے کی احسان مند کیوں بنوں۔

گیارہ بج رہے تھے۔ گھر میں چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ نوکر چاکر سب سو گئے تھے۔ صوفیہ نے کھڑکی سے باہر باغ کی طرف دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آسمان سے دودھ کی بارش ہو رہی ہے۔ چاندنی خوب چھٹک رہی تھی۔ سنگ مرمر کی دونوں پریاں جو حوض کے کنارے کھڑی تھیں، اس خاموش نغمہ کی نورانی مورتیں سی معلوم ہوتی تھیں جس سے سارا منظر معمور تھا۔

صوفیہ کے دل میں زبردست خواہش ہوئی کہ اسی وقت چل کر اپنا خط لاؤں۔ وہ پختہ ارادہ کر کے اپنے کمرہ سے نکلی اور بے خوفی کے ساتھ رانی صاحبہ کے دیوان خانہ کی طرف چلی۔ وہ اپنے دل کو بار بار سمجھا رہی تھی۔ مجھے خوف کس کا ہے۔ اپنی چیز لینے جا رہی ہوں۔ کوئی پوچھے تو اس سے صاف صاف کہہ سکتی ہوں۔ ونے سنگھ کا نام لینا کوئی جرم نہیں ہے۔

مگر لگاتار تشفی ملنے پر بھی اس کے قدم اتنی احتیاط سے پڑتے تھے کہ برآمدہ کے پختہ فرش پر بھی کوئی آہٹ نہ ہوتی تھی۔ اس کے چہرہ سے وہ بے اطمینانی ظاہر ہو رہی تھی جو نیت فاسد کا نشان ہے۔ وہ سہمی ہوئی نگاہوں سے دہنے بائیں آگے پیچھے تاکتی جاتی تھی۔ ذرا سا بھی کوئی کھٹکا ہوتا تو اس کے پیر خود بخود رک جاتے تھے اور برآمدہ کے ستونوں کی آڑ میں چھپ جاتی تھی۔ راستہ میں کئی کمرے تھے۔ اگرچہ ان میں تاریکی تھی اور روشنی گل ہو چکی تھی تاہم وہ دروازہ پر ایک لمحہ کے لیے رک جاتی تھی کہ کوئی ان میں بیٹھا ہو۔ دفعتاً ایک ٹیریر کتا جسے رانی صاحبہ بہت پیار کرتی تھیں، سامنے سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ صوفی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس نے ذرا بھی منہ کھولا کہ سارے مکان میں ہلچل ہو جائے گی۔ کتے نے اس کی طرف مشتبہ

نگاہوں سے دیکھا اور اپنے فیصلہ کا اظہار کرنا ہی چاہتا تھا کہ صوفیہ نے آہستہ سے اس کا نام لیا اور اسے گود میں اٹھا کر اس کی پیٹھ سہلانے لگی۔ کتا دم ہلانے لگا لیکن اپنی راہ جانے کے بجائے وہ صوفیہ کے ساتھ ہولیا۔ شاید اس کی فطرت بتلا رہی تھی کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ اس طرح پانچ کمروں کے بعد رانی صاحبہ کا دیوان خانہ ملا۔ اس کے دروازے کھلے تھے، لیکن اندر اندھیرا تھا۔ کمرہ میں بجلی کے بٹن لگے ہوئے تھے۔ انگلیوں کی بہت خفیف حرکت سے کمرہ روشن ہوسکتا تھا مگر اس وقت بٹن کا دبانا اسے بارود کے ڈھیر میں دیا سلائی لگانے سے کم خطرناک نہ معلوم ہوتا تھا۔ روشنی سے وہ کبھی اس قدر خوف زدہ نہ ہوئی تھی۔ مشکل تو یہ تھی کہ روشنی کے بغیر وہ اپنے ارادہ میں کامیاب بھی نہ ہوسکتی تھی۔ وہی آب حیات بھی تھی اور زہر ہلاہل بھی۔ اسے غصہ آ رہا تھا کہ کواڑوں میں شیشے کیوں لگے ہوئے ہیں۔ پردے ہیں تو بھی اس قدر باریک کہ آدمی کا منہ دکھائی دیتا ہے۔ گھر نہ ہوا کوئی سجی ہوئی دکان ہوئی۔ بالکل انگریزی نقل ہے اور روشنی ٹھنڈی کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس سے تو کوئی بہت بڑی کفایت نہیں ہو جاتی۔

ہم جب کسی تنگ سڑک پر چلتے ہیں تو ہمیں سواریوں کا آنا جانا بہت ہی تکلیف دہ معلوم ہوتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ ان راستوں پر سواریوں کی آمد ورفت کی روک ہونی چاہیے۔ ہمارا اختیار ہوتا تو ان سڑکوں پر کوئی سواری نہ گزرنے دیتے خصوصاً موٹروں کو، لیکن انہیں سڑکوں پر جب ہم کسی سواری پر بیٹھ کر چلتے ہیں تو قدم قدم پر مسافروں کو ہٹانے کے لیے رک جانے پر جھنجھلاتے ہیں کہ یہ سب پٹری پر کیوں نہیں چلتے۔ خواہ مخواہ بیچ میں دھنسے پڑتے ہیں۔ مشکلات میں پڑ کر گردوپیش کے حالات پر ناخوشی کا اظہار کرنا انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔

صوفیہ کئی منٹ تک بجلی کے بٹن کے پاس کھڑی رہی۔ بٹن دبانے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ سارے صحن میں روشنی پھیل جائے گی۔ لوگ چونک پڑیں گے۔

اندھیرے میں سوتا ہوا آدمی بھی اجالا پھیلتے ہی جاگ پڑتا ہے۔ مجبوراً اس نے میز کو ٹٹولنا شروع کیا۔ دوات لڑھک گئی۔ سیاہی میز پر پھیل گئی اور اس کے کپڑوں پر داغ پڑ گئے۔ اسے یقین تھا کہ رانی نے خط کو اپنے ہینڈ بیگ (دستی بیگ) میں رکھا ہوگا۔ ضروری خطوط اسی میں رکھتی تھیں۔ بڑی مشکل سے اس کو بیگ ملا۔ وہ اس میں سے ایک ایک خط نکال کر اندھیرے میں دیکھنے لگی۔ لفافے زیادہ تر ایک ہی قسم کے تھے۔ نگاہیں کچھ کام سے نہ کر سکیں۔ آخر اس طرح مطلب برآری ہوتے نہ دیکھ کر اس نے بیگ کو اٹھا لیا اور کمرہ سے باہر نکلی۔ سوچا کہ میرے کمرہ میں ابھی تک روشنی ہے وہاں وہ خط بآسانی مل جائے گا۔ اسے لا کر بھی پھر یہیں رکھ دوں گی، لیکن واپس ہوتے وقت وہ اتنی ہوشیاری سے قدم نہ اٹھا سکی۔ آتے وقت وہ قدم قدم پر ادھر ادھر دیکھتی ہوئی آتی تھی۔ اب بڑی تیزی سے چلی جا رہی تھی۔ ادھر ادھر دیکھنے کی فرصت نہ تھی۔ خالی ہاتھ ہونے پر عذر کی گنجائش تھی۔ بھرے ہوئے ہاتھوں کے لیے کوئی عذر یا حیلہ نہ تھا۔

اپنے کمرہ میں پہنچتے ہی صوفیہ نے دروازہ بند کر دیا اور پردے ڈال دیئے۔ گرمی کی شدت سے سارا بدن پسینہ سے تر تھا۔ ہاتھ اس طرح کانپ رہے تھے جیسے رعشہ کا اثر ہو۔ وہ خطوط کو نکال نکال کر دیکھنے لگی اور خطوط کو محض دیکھنا نہ تھا۔ انہیں ان کی جگہوں پر ترتیب کے ساتھ رکھنا بھی تھا۔ خطوط کا ایک دفتر سامنے تھا۔ برسوں کے خطوط بہ حفاظت رکھے ہوئے تھے۔ صوفیہ کو تلاش کرتے گھنٹوں گزر گئے۔ دفتر ختم ہونے پر آ گیا۔ پر وہ چیز نہ ملی۔ اسے اب کچھ کچھ مایوسی ہونے لگی۔ یہاں تک کہ آخری خط بھی الٹ پلٹ کر رکھ دیا گیا۔ اس وقت صوفیہ نے ایک لمبی سانس لی۔ صوفیہ کی حالت اس آدمی کی سی تھی جو کسی میلہ میں اپنے گم شدہ عزیز کو ڈھونڈتا ہو۔ وہ چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا ہے۔ اس کا نام لے کر زور زور سے پکارتا ہے۔ اس کو وہم ہوتا ہے کہ وہ کھڑا ہے۔ لپک کر اس کے پاس جاتا ہے اور شرمندہ ہو

کر واپس آتا ہے۔ بالآخر وہ مایوس ہو کر زمین پر بیٹھ جاتا ہے اور رونے لگتا ہے۔

صوفیہ بھی رونے لگی۔ وہ خط کہاں گیا؟ رانی نے تو اس کو میرے سامنے ہی بیگ میں رکھ دیا تھا۔ ان کے اور سبھی خطوط یہاں موجود ہیں۔ کیا اسے کہیں اور رکھ دیا؟ مگر امید اس گھاس کی مانند ہے جو گرمی کی حدت سے جل جاتی ہے۔ زمین پر اس کا نشان تک نہیں رہتا۔ زمین ایسی صاف سفید ہو جاتی ہے جیسے ٹکسال کا نیا روپیہ، لیکن بارش کی بوند پڑتے ہی پھر جلی ہوئی جڑیں پنپنے لگتی ہیں اور خشک جگہ پر ہریاول لہرانے لگتی ہے۔

صوفیہ کی امید پھر ہری ہوئی۔ کہیں میں کوئی خط چھوڑ تو نہیں گئی۔ اس نے خطوط کو دوبارہ دیکھنا شروع کیا اور زیادہ غور کے ساتھ ایک ایک لفافہ کو کھول کر دیکھنے لگی کہ کہیں رانی نے اسے کسی دوسرے لفافہ میں رکھ دیا ہو۔ جب دیکھا کہ اس طرح تو ساری رات گزر جائے گی تو انہیں لفافوں کو کھولنے لگی جو وزنی معلوم ہوئے۔ آخر یہ شک بھی رفع ہو گیا۔ اس لفافہ کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اب امید کی جڑیں بھی سوکھ گئیں۔ بارش کا قطرہ نہ ملا۔

صوفیہ چارپائی پر لیٹ گئی گویا تھک گئی ہو۔ کامیابی جانفزا ہوتی ہے اور ناکامی جاں گسل۔ امید ایک نشہ ہے اور مایوسی اس نشہ کا خمار۔ نشہ میں ہم گھر سے باہر دوڑتے ہیں اور خمار کے وقت ہم گھر میں آرام کرتے ہیں۔ امید مادہ کی طرف لے جاتی ہے اور مایوسی روح کی طرف۔ امید آنکھیں بند کر دیتی ہے مایوسی آنکھیں کھول دیتی ہے امید سلانے والی تھپکی ہے۔ مایوسی جگانے والا چابک۔

صوفیہ کو اس وقت اپنی اخلاقی بزدلی پر غصہ آ رہا تھا۔ میں نے ناحق اپنی روح کو گناہ گار بنایا۔ کیا میں رانی سے اپنا خط نہ مانگ سکتی تھی۔ انہیں اس کے دینے میں ذرا بھی توقف نہ ہوتا۔ پھر میں نے وہ خط انہیں دیا ہی کیوں۔ رانی صاحبہ کو کہیں میری یہ باتیں معلوم ہو گئیں اور ضرور ہی معلوم ہو جائیں گی تو وہ میری بابت اپنے دل میں کیا

خیال کریں گی۔ غالباً مجھ سے زیادہ ذلیل اور کمینہ شخص دوسرا نہ ہوگا۔

دفعتاً صوفیہ کے کانوں میں جھاڑو لگنے کی آواز آئی۔ وہ چونک پڑی۔ کیا سویرا ہو گیا؟ پردہ اٹھا کر دروازہ کھولا تو دن نکل آیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ اس نے درد آمیز نگاہوں سے دستی بیگ کی طرف دیکھا اور بت کی طرح کھڑی رہ گئی۔ عقل نے جواب دے دیا۔ اپنی حالت اور کام پر ایسا غصہ آرہا تھا کہ گردن پر چھری پھیر لوں۔ کون سا منہ دکھاؤں گی۔ رانی صاحبہ علی الصبح اٹھتی ہیں۔ مجھے ضرور ہی دیکھ لیں گی، لیکن اب اور ہو ہی کیا سکتا ہے۔ یا خدا! تو بیکسوں کا مددگار ہے۔ اب میری لاج تیرے ہی ہاتھ ہے۔ خدا کرے ابھی رانی صاحبہ نہ اٹھی ہوں۔ اس کی دعا میں کتنی عاجزی، کتنی مجبوری، کتنا درد، کتنی عقیدت اور کتنی غیرت تھی۔ شاید اس نے ایسی صاف دلی سے کبھی دعا نہ کی تھی۔

اب ذرا بھی دیر کرنے کی گنجائش نہ تھی۔ اس نے بیگ اٹھالیا اور باہر نکلی۔ غرور کبھی اس قدر پامال نہ ہوگا۔ اس کے منہ میں سیاہی لگی ہوتی جب بھی شاید وہ اس طرح آنکھیں چراتی ہوئی نہ جاتی۔ کوئی شریف آدمی قیدی کی شکل میں بیڑیاں پہنے جاتا ہوا بھی اتنا خجل نہ ہوگا۔ جب وہ دیوان خانہ کے دروازہ پر پہنچی تو اس کا دل یوں دھڑکنے لگا گویا کوئی ہتھوڑا چلا رہا ہو۔ وہ ذرا دیر ٹھٹکی۔ کمرہ میں جھانک کر دیکھا۔ رانی بیٹھی ہوئی تھیں۔ صوفیہ کی اس وقت جو حالت ہوئی اس کا صرف اندازہ ہی کیا جا سکتا ہے۔ وہ گڑ گئی، کٹ گئی۔ سر پر بجلی گر پڑتی یا نیچے کی زمین پھٹ جاتی تو وہ بھی شاید اس بڑی مصیبت کے مقابلہ میں پھولوں کی بارش یا پانی کی چھینٹوں کی طرح خوش گوار معلوم ہوتی۔ اس نے زمین کی طرف تاکتے ہوئے ہینڈ بیگ کو چپکے سے لے جا کر میز پر رکھ دیا۔ رانی نے اس کی طرف دل کو چھید ڈالنے والی نگاہ سے دیکھا۔ اس میں غصہ نہ تھا، رحم نہ تھا۔ حقارت تھی، خالص و زندہ اور بولتی ہوئی۔

صوفیہ لوٹنا چاہتی تھی کہ رانی نے پوچھا۔ ''کیا ونے کے خط کی جستجو تھی؟'' صوفیہ

ساکت و خاموش رہ گئی۔ معلوم ہوا کسی نے جگر پر خنجر چلا دیا۔

رانی نے کہا۔ ’’اسے میں نے علیحدہ رکھ دیا ہے۔ کہو تو منگوا دوں۔‘‘

صوفیہ نے جواب نہ دیا۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ اس کو کمرہ گھومتا ہوا معلوم ہوا۔

رانی نے تیسرا تیر چلایا۔ ’’کیا سچائی کی تحقیقات یہی ہے؟‘‘

صوفیہ غش کھا کر فرش پر گر پڑی۔

(14)

صوفیہ کو ہوش آیا تو وہ اپنے کمرہ میں پلنگ پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کے کانوں میں رانی کے آخری الفاظ گونج رہے تھے۔ کیا سچائی کی تحقیقات یہی ہے؟ وہ اپنے کو اس وقت اتنی حقیر سمجھ رہی تھی کہ گھر کا مہتر بھی اسے گالیاں دیتا تو شاید سر نہ اٹھاتی۔ وہ نفس کے ہاتھوں اس قدر پامال ہو چکی تھی کہ اسے اپنے سنبھلنے کی کوئی امید نظر نہ آتی تھی۔ اسے اندیشہ تھا کہ میرا دل مجھ سے وہ سب کچھ کرا سکتا ہے جس کے محض خیال سے انسان کا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ میں دوسروں پر کتنا ہنستی تھی۔ اپنی مذہبی رغبت پر کتنا فخر کرتی تھی۔ میں تناسخ اور نجات، خدا اور مادہ جیسے پیچیدہ مسائل پر غور و خوض کرتی تھی اور دوسروں کو خواہش اور خود غرضی کا غلام سمجھ کر ذلیل خیال کرتی تھی۔ میں سمجھتی تھی کہ خدا سے قریب تر ہو گئی ہوں۔ دنیا کو ہیچ سمجھتے ہوئے میں اپنے کو نجات کا مستحق خیال کرتی تھی، لیکن آج میری عقیدت کا پردہ فاش ہو گیا۔ آہ وِنے کو یہ باتیں معلوم ہوں گی تو وہ اپنے دل میں کیا سمجھیں گے۔ غالباً میں ان کی نگاہوں میں اتنی گر جاؤں گی کہ وہ مجھ سے بولنا پسند نہ کریں۔ میں بدنصیب ہوں۔ میں نے ان کو رسوا کیا اپنے خاندان کو بدنام کیا۔ اپنے ضمیر کا خون کیا اور اپنے میزبانوں کی فیاضی کی توہین کی۔ میرے سبب مذہب بھی بدنام ہو گیا ورنہ کیا آج مجھ سے یہ پوچھا جاتا، کیا سچائی کی تحقیقات یہی ہے؟

اس نے سرہانے کی طرف دیکھا۔ الماریوں پر مذہبی کتابیں قرینہ سے چنی ہوئی

تھیں۔ کتابوں کے دیکھنے کی ہمت نہ پڑی۔ یہی میرے مطالعہ کا نتیجہ ہے! میں سچ کی کھوج کرنے چلی تھی اور اس بری طرح گری کہ اب اٹھنا مشکل ہے۔

سامنے دیوار پر مہاتما بدھ کی تصویر آویزاں تھی۔ ان کے چہرہ پر کتنا نور تھا۔ صوفیہ کی آنکھیں جھک گئیں۔ ان کی طرف دیکھتے ہوئے اسے ندامت ہوئی تھی۔ بدھ کے زندہ جاوید ہونے کا اسے پہلے کبھی اتنا یقین نہ ہوا تھا۔ تاریکی میں لکڑی کا کنڈا بھی جاندار ہو جاتا ہے۔ صوفی کے دل پر ایسی ہی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔

ابھی نو بجے کا وقت تھا مگر صوفیہ کو گمان ہو رہا تھا کہ شام ہو رہی ہے۔ وہ سوچتی تھی کیا سارے دن سوتی رہ گئی۔ کسی نے مجھے جگایا بھی نہیں۔ کوئی کیوں جگانے لگا۔ یہاں اب میری پروا کس کو ہے اور کیوں ہو۔ میں بدذات ہوں۔ میری ذات سے کسی کو فائدہ نہ پہنچے گا۔ جہاں رہوں گی وہیں آگ لگاؤں گی۔ میں نے بری ساعت میں اس گھر میں قدم رکھا تھا۔ میرے ہاتھوں یہ گھر ویران ہو جائے گا۔ میں ونے کو اپنے ساتھ ڈبو دوں گی۔ ماں کی بددعا کا اثر ضرور ہوگا۔ خدایا آج میرے دل میں ایسے خیالات کیوں پیدا ہو رہے ہیں؟

یکایک مسز سیوک کمرہ میں داخل ہوئیں۔ انہیں دیکھتے ہی صوفیہ کو اپنے سینہ میں جذبات کا ایک سیلاب سا آتا ہوا معلوم ہوا۔ وہ دوڑ کر ماں کے گلے سے لپٹ گئی۔ وہی اب اس کا آخری سہارا تھا۔ یہیں اب اس کو وہ ہمدردی مل سکتی تھی جس کے بغیر اس کا زندہ رہنا دشوار تھا۔ یہیں اب اس کو وہ آرام، وہ سکون، وہ سایہ مل سکتا تھا جس کے لیے اس کی روح تڑپ رہی تھی۔ ماں کی گودی کے سوا یہ روحانی خوشی اور کہاں مل سکتی ہے۔ ماں کے سوا کون اسے چھاتی سے لگا سکتا ہے۔ کون اس کے دل پر مرہم رکھ سکتا ہے۔ ماں کی سخت کلامی اور اس کا دلآزارانہ سلوک یہ سب اسی خوشی کی خواہش کے جوش میں غائب ہو گئے۔ اس کو ایسا معلوم ہوا کہ خدا نے میری بیکسی پر ترس کھا کر ماما کو یہاں بھیجا ہے۔ ماں کی گودی میں اپنے دکھتے ہوئے سر کو رکھنے پر

اس کو ایک بار پھر اس سکون اور تقویت کا احساس ہوا جس کی یاد اس کے دل سے اب تک محو نہ ہوئی تھی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، لیکن ماں کی آنکھوں میں آنسو نہ تھے۔ وہ تو مسٹر کلارک کی نوید کا مژدہ جاں فزا سنانے کے لیے بے قرار ہوئی تھی۔ جوں ہی صوفیہ کے آنسو تھمے مسز سیوک نے کہا۔ "آج تمہیں میرے ساتھ چلنا ہو گا مسٹر کلارک نے تمہیں اپنے یہاں بلا بھیجا ہے۔"

صوفیہ نے کچھ جواب نہ دیا۔ اس کو ماں کی یہ بات بے موقع معلوم ہوئی۔

مسز سیوک نے پھر کہا۔ "جب سے تم یہاں آئی ہو وہ کئی مرتبہ تمہاری خیر و عافیت کا حال دریافت کر چکے ہیں۔ جب ملتے ہیں تمہارا تذکرہ ضرور کرتے ہیں۔ ایسا شریف سویلین میں نے نہیں دیکھا۔ ان کی شادی کسی انگریز گھرانے میں ہو سکتی ہے اور یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ وہ تمہیں ابھی تک یاد کرتے ہیں۔"

صوفیہ نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ ماں کی ثروت پسندی نا قابل برداشت تھی۔ نہ محبت کی باتیں ہیں نہ تشفی کے الفاظ۔ شاید حضرت یسوع نے بھی بلایا ہوتا تو یہ اتنا خوش نہ ہوتیں۔

مسز سیوک بولیں۔ "اب تمہیں انکار نہ کرنا چاہیے۔ توقف سے محبت سرد ہو جاتی ہے اور پھر اس پر کوئی چوٹ نہیں پڑ سکتی۔ ایسا سنہری موقع پھر ہاتھ نہ آئے گا۔ ایک دانا کا قول ہے کہ ہر شخص کو زندگی میں صرف ایک بار اپنی قسمت آزمائی کا موقع ملتا ہے اور وہی اس کے مستقبل کا فیصلہ کر دیتا ہے۔ تمہاری زندگی میں یہ وہی موقع ہے۔ اسے کھو دیا تو ہمیشہ پچھتاؤ گی۔"

صوفیہ نے مغموم ہو کر کہا۔ "اگر مسٹر کلارک نے مجھے مدعو نہ کیا ہوتا تو شاید آپ مجھ کو یاد بھی نہ کرتیں۔"

مسز سیوک نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "میرے دل مین جو کچھ ہے وہ تو خدا ہی جانتا ہے۔ پر ایسا کوئی دن نہیں جاتا کہ میں تمہارے اور پربھو کے لیے خدا سے دعا نہ

کرتی ہوں۔ یہ انہیں دعاؤں کا اثر ہے کہ تمہیں یہ موقع نصیب ہوا ہے۔‘‘

یہ کہہ کر مسز سیوک رانی جانہوی سے ملنے گئیں۔ رانی صاحبہ نے ان کی کوئی خاص عزت نہیں کی۔ اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے بولیں۔ ’’آپ سے بہت دنوں میں ملاقات ہوئی۔‘‘

مسز سیوک نے سوکھی ہنسی ہنس کر کہا۔ ’’ابھی میری واپسی کی ملاقات آپ کے ذمہ باقی ہے۔‘‘

رانی: آپ مجھ سے ملنے کے لیے آئیں کب؟ پہلے بھی صوفیہ سے ملنے آئی تھیں اور آج بھی۔ میں تو آج آپ کو ایک خط لکھنے والی تھی۔ اگر برا نہ مانیے تو ایک بات پوچھوں؟

مسز سیوک: پوچھئے۔ برا کیوں مانوں گی۔

رانی: مس صوفیہ کی عمر تو زیادہ ہوگئی۔ آپ نے اس کے بیاہ کی فکر کی یا نہیں؟ اب تو اس کا جتنی جلدی بیاہ ہو جائے اتنا ہی اچھا۔ آپ لوگوں میں لڑکیاں بہت سیانی ہونے پر بیاہی جاتی ہیں۔

مسز سیوک: اس کی شادی کب کی ہوگئی ہوتی۔ کئی انگریز بے طرح پیچھے پڑے۔ مگر یہ راضی ہی نہیں ہوتی۔ اس کو مذہبی کتب سے اس قدر دلچسپی ہے کہ شادی کو ایک جنجال سمجھتی ہے۔ آج کل حاکم ضلع مسٹر کلارک کے پیغامات آرہے ہیں۔ دیکھوں اب بھی راضی ہوتی ہے یا نہیں۔ آج میں اس کو لے جانے ہی کے ارادہ سے آئی ہوں۔ میں ہندوستانی عیسائیوں سے رشتہ نہیں جوڑنا چاہتی۔ ان کا طرز معاشرت مجھے پسند نہیں ہے اور صوفی جیسی تعلیم یافتہ لڑکی کے لیے کوئی انگریز شوہر ملنے میں ذرا بھی دقت نہیں ہوسکتی۔

رانی: میری رائے میں شادی ہمیشہ اپنے ہم قوم لوگوں میں کرنی چاہیے۔ یورپین لوگ ہندوستانی عیسائیوں کی کچھ بہت وقعت نہیں کرتے اور بے جوڑ شادیوں کا نتیجہ

اچھا نہیں ہوتا۔

مسز سیوک: (غرور سے) ایسا کوئی یورپین نہیں ہے جو میرے خاندان میں شادی کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھے۔ ہم اور وہ ایک ہیں۔ ہم اور وہ ایک ہی خدا کو مانتے ہیں۔ ایک ہی گرجا میں عبادت کرتے ہیں اور ایک ہی نبی کی امت میں ہیں۔ ہمارا اوران کا طرز معاشرت، رسم ورواج، خورد ونوش سب ایک ہیں۔ یہاں انگریزوں کی سوسائٹی میں، کلب میں، دعوتوں میں ہماری ایک سی عزت ہوتی ہے۔ ابھی تین چار روز ہوئے لڑکیوں کو انعام تقسیم کا جلسہ تھا۔ مسٹر کلارک نے خود مجھے اس جلسہ کا صدر بنایا اور میں نے ہی انعامات تقسیم کیے۔ کسی ہندو یا مسلمان لیڈی کو یہ اعزاز نہیں حاصل ہوسکتا۔

رانی: ہندو یا مسلمان جنہیں کچھ بھی اپنی ذات کا خیال ہے، انگریزوں کے ساتھ ملنا جلنا اپنے لیے عزت کا باعث نہیں خیال کرتے۔ یہاں تک کہ ہندوؤں میں جو لوگ انگریزوں کے ساتھ خورد ونوش رکھتے ہیں، انہیں لوگ حقارت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ شادی بیاہ کا تو ذکر ہی کیا۔ سیاسی اقتدار کی بات اور ہے۔ ڈاکوؤں کی ایک جماعت عالموں کی ایک مجلس کو نہایت آسانی سے مغلوب کرسکتی ہے مگر اس سے علماء کی عزت کچھ کم نہیں ہوتی۔ ہر ہندو جانتا ہے کہ حضرت مسیح بدھ مت کے زمانہ میں یہاں آئے تھے اور انہوں نے یہیں تعلیم پائی تھی اور جو علم انہوں نے یہاں حاصل کیا ہے، اسی کی اشاعت مغرب میں کی۔ پھر کیسے ہوسکتا ہے کہ ہندو انگریزوں کو اپنے سے بہتر خیال کریں۔

دونوں عورتوں میں اسی طرح کی نوک جھونک ہوتی رہی۔ دونوں ایک دوسرے کو نیچا دکھانا چاہتی تھیں۔ دونوں ایک دوسرے کی کچھ نیت کو سمجھتی تھیں۔ احسان مندی یا شکر گذاری کے الفاظ کسی کے منہ سے نہ نکلے۔ یہاں تک کہ جب مسز سیوک رخصت ہونے لگیں تو رانی ان کو پہنچانے کے لیے کمرہ کے دروازہ تک بھی نہ گئیں۔

اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے ہاتھ بڑھا دیا اور ابھی مسز سیوک کمرہ ہی میں تھیں کہ وہ اپنا اخبار پڑھنے لگیں۔

مسز سیوک صوفیہ کے پاس گئیں تو وہ تیار تھی۔ کتابوں کے بنڈل بندھے ہوئے تھے۔ کئی خادمائیں ادھر ادھر انعام کے لالچ میں کھڑی تھیں۔ دل مین خوش تھیں کہ کسی طرح بلا ٹلی۔ صوفیہ بہت اداس تھی۔ اس گھر کو چھوڑتے ہوئے اس کو بہت رنج ہو رہا تھا۔ اسے اپنی منزل مقصود کا پتہ نہ تھا۔ اسے کچھ معلوم نہ تھا کہ تقدیر کہاں لے جائے گی۔ کیا کیا اذیتیں اٹھانی پڑیں گی۔ کشتی حیات کس گھاٹ لگے گی۔ اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ونے سنگھ سے پھر ملاقات نہ ہوگی۔ ان سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو رہی ہوں۔ رانی صاحبہ کی اہانت آمیز گفتگو، ان کا شکوہ اور اپنی غلطی سب کچھ بھول گئی۔ دل کے ایک تار سے یہ آواز نکل رہی تھی کہ اب ونے سے پھر ملاقات نہ ہو گی۔ مسز سیوک بولیں۔ ''کنور صاحب سے بھی مل لوں۔''

صوفیہ ڈر رہی تھی کہ کہیں ماما کو رات کے واقعہ کی خبر نہ مل جائے۔ کنور صاحب کہیں مذاق ہی مذاق میں کہہ نہ ڈالیں۔ بولی۔ ''ان سے ملنے میں دیر ہوگی پھر مل لیجیے گا۔''

مسز سیوک: پھر کسے اتنی فرصت ہے۔

دونوں کنور صاحب کے دیوان خانہ میں پہنچیں۔ وہاں اس وقت والنٹیروں کا ہجوم تھا۔ گڑھوال میں سخت قحط پڑا ہوا تھا۔ نہ اناج تھا نہ پانی۔ جانور مر رہے تھے۔ پر انسانوں کو موت بھی نہ آتی تھی۔ ایڑیاں رگڑتے تھے اور سسکتے تھے۔ یہاں سے پچاس والنٹیروں کا ایک دستہ ان غمزدوں کی امداد کرنے کے لیے روانہ ہونے والا تھا۔ اس وقت کنور صاحب ان کا انتخاب کر رہے تھے۔ انہیں ضروری باتیں سمجھا رہے تھے۔ ڈاکٹر گنگولی نے اس بڑھاپے میں ان کا سردار ہونا منظور کر لیا تھا۔ دونوں اصحاب اس قدر مشغول تھے کہ مسز سیوک کی طرف کسی نے دھیان نہ کیا۔ آخر وہ بولیں۔ ''ڈاکٹر صاحب! آپ کا کب جانے کا ارادہ ہے؟''

کنور صاحب نے مسز سیوک کو دیکھا اور بڑے تپاک سے آگے بڑھ کر ہاتھ ملایا۔ خیر و عافیت دریافت کی اور لے جا کر ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ صوفیہ اپنی ماں کے پیچھے جا کر کھڑی ہو گئی۔

کنور صاحب: یہ لوگ گڑھوال جا رہے ہیں۔ آپ نے اخباروں میں پڑھا ہو گا۔ وہاں لوگوں پر کتنی زبردست مصیبت آ پڑی ہے۔

مسز سیوک: خدا ان لوگوں کو اپنے پاک مقصد میں کامیاب کرے۔ ان کے ایثار کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ میں دیکھتی ہوں یہاں ان کی خاصی تعداد ہے۔

کنور صاحب: مجھے اتنی امید نہ تھی۔ ونے کی باتوں پر یقین نہ آتا تھا۔ سوچتا تھا اتنے والنٹیر (خدام وطن) کہاں ملیں گے۔ سبھوں کو نوجوانوں کی پست ہمّتی کا رونا روتے ہوئے دیکھتا تھا۔ ان میں جوش نہیں ہے۔ ایثار نہیں ہے۔ جان نہیں ہے۔ سب اپنے اپنے ذاتی غرض کے نشہ میں متوالے ہو رہے ہیں۔ کتنی ہی سیوا سمتیاں قائم ہوئیں پر ایک بھی سرسبز نہ ہوئی، لیکن اب مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ لوگوں کو ہمارے نوجوانوں کے بارے میں کتنا وہم ہوا تھا۔ اب تک تین سو نام درج ہو چکے ہیں۔ کچھ لوگوں نے تمام عمر قومی خدمت کی انجام دہی کا عہد کیا ہے۔ ان میں کئی اشخاص تو ہزاروں روپے ماہوار کی آمدنی پر لات مار کر آئے ہیں۔ ان لوگوں کا حوصلہ دیکھ کر مجھے بہت کچھ امید ہو گئی ہے۔

مسز سیوک: مسٹر کلارک کل آپ کی بڑی تعریف کر رہے تھے۔ خدا نے چاہا تو آپ کو جلد ہی ''سی آئی ای'' کا خطاب ملے گا اور مجھے آپ کو مبارک باد دینے کا موقع۔

کنور صاحب: (شرما کر) میں اس اعزاز کے قابل نہیں ہوں۔ مسٹر کلارک مجھے اس قابل سمجھتے ہیں تو یہ ان کا حسن ظن ہے۔ مسز سیوک! تیار رہنا۔ کل تین بجے کی میل سے یہ لوگ روانہ ہوں گے۔ پربھو نے بھی آنے کا وعدہ کیا ہے۔

مسز سیوک: صوفی تو آج گھر جا رہی ہے (مسکرا کر) شاید آپ کو عنقریب ہی اس کا کنیادان دینا پڑے۔ مسٹر کلارک جال پھیلا رہے ہیں۔

صوفیہ شرم سے گڑ گئی۔ اس کو ماں کے اوچھے پن پر غصہ آ رہا تھا۔ اس بات کا ڈھنڈورا پیٹنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا یہ سمجھتی ہیں کہ مسٹر کلارک کا نام لینے سے کنور صاحب رعب میں آ جائیں گے۔

کنور صاحب: بڑی خوشی کی بات ہے۔ صوفی دیکھو ہم لوگوں کو اور خصوصاً اپنے غریب بھائیوں کو بھول نہ جانا۔ تمہیں ایشور نے جتنا اچھا دل عطا کیا ہے ویسا ہی اچھا موقع مل رہا ہے۔ ہماری دعائیں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہیں گی۔ تمہارے احسان سے ہم کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ کبھی کبھی ہم لوگوں کو بھی یاد کرتی رہنا۔ مجھے پہلے معلوم نہ تھا ورنہ آج اندو کو ضرور بلا بھیجتا۔ خیر ملک کی حالت تم پر واضح ہے۔ مسٹر کلارک بہت ہی ہونہار آدمی ہیں۔ ایک دن ضرور یہ اس ملک کے کسی صوبہ کے حاکم ہوں گے۔ میں یقین کے ساتھ یہ پیشین گوئی کر سکتا ہوں۔ اس وقت تم اپنے اثر، اختیار اور اپنی قابلیت سے ملک کو بہت کچھ نفع پہنچا سکو گی۔ تم نے اپنے اہالیان ملک کی حالت دیکھی ہے۔ ان کی مفلسی کا تمہیں پورا احساس ہے۔ ان کی حالت کی اصلاح میں اسی احساس سے کام لینا۔

صوفیہ شرم کی وجہ سے کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کی ماں نے کہا۔ ''آپ رانی صاحبہ کو ضرور ساتھ لائیے گا۔ میں کارڈ بھیجوں گی۔''

کنور صاحب: نہیں۔ مسز سیوک! مجھے معاف کیجیے گا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اس تقریب میں شریک نہ ہو سکوں گا۔ میں نے عہد کیا ہے کہ میں حکام سے علاقہ نہ رکھوں گا۔ حکام کی نظر التفات ہم لوگوں کو دانستہ یا نادانستہ طریقہ پر خود پسند اور خود مختار بنا دیتی ہے۔ میں اپنے کو اس آزمائش میں نہیں ڈالنا چاہتا کیونکہ مجھے اپنے اوپر اعتماد نہیں ہے۔ میں اپنی قوم میں حاکم و محکوم، ادنیٰ و اعلیٰ کی تفریق نہیں رکھنا چاہتا۔ ہم

سب محکوم ہیں۔ شاہ بھی محکوم ہے اور گدا بھی۔ جھوٹے اقتدار کے غرور میں اپنا سر نہیں پھرانا چاہتا۔

مسز سیوک: خدا نے آپ کو راجہ بنایا ہے۔ راجوں ہی کے ساتھ راجہ کا میل ہو سکتا ہے۔ انگریز لوگ بابوؤں کو منہ نہیں لگاتے، کیونکہ اس سے یہاں کے راجاؤں کی توہین ہوتی ہے۔

ڈاکٹر گنگولی: مسز سیوک۔ یہ بہت دنوں تک راجہ رہ چکا ہے۔ اب اس کا جی بھر گیا ہے۔ میں اس کا بچپن کا ساتھی ہوں۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ پڑھتے تھے۔ دیکھنے میں یہ مجھ سے چھوٹا معلوم ہوتا ہے۔ پر کئی سال بڑا ہے۔

مسز سیوک: (ہنس کر) ڈاکٹر کے لیے یہ تو کوئی فخر کی بات نہیں ہے۔

ڈاکٹر: ہم دوسروں کا دوا کرنا جانتا ہے۔ اپنا دوا کرنا نہیں جانتا۔ کنور صاحب اسی بکھت (وقت) سے Pessimist (مایوس المزاج) ہے۔ اسی وجہ سے اس کے پڑھنے میں رکاوٹ پڑی۔ اب بھی اس کا وہی حال ہے۔ ہاں اب تھوڑا پھیر پھار ہو گیا ہے۔ پہلے فعل سے بھی مایوسی پسند تھا اور قول سے بھی۔ اب اس کے قول و فعل میں یکسانیت نہیں ہے۔ قول سے تو اب بھی ویسا ہی ہے، پر کام وہ کرتا ہے جسے کوئی پکا Optimist (امید پر بھروسہ رکھنے والا) ہی کر سکتا ہے۔

کنور صاحب: گنگولی! تم میرے ساتھ بے انصافی کر رہے ہو۔ مجھ میں پر امید ہونے کے اوصاف ہی نہیں ہیں۔ ایسا شخص پرماتما کا بھگت ہوتا ہے۔ پکا گیانی۔ پورا رشی۔ اس کو چاروں طرف پرماتما ہی کا جلوہ نظر آتا ہے۔ اسی وجہ سے اس کو مستقبل پر بے اعتمادی نہیں ہوتی۔ میں شروع ہی سے تن آسانیوں کا غلام رہا ہوں۔ وہ روحانی علم نہیں حاصل کر سکا جسے امید کی کنجی کہنا چاہیے۔ میرے لیے ناامیدی (Pessimism) کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ مسز سیوک! ڈاکٹر صاحب کی زندگی کا خلاصہ صرف ایک لفظ ایثار ہے۔ ان پر جتنی مصیبتیں نازل ہوئیں وہ کسی

عارف کامل کو بھی دہریہ بنا کر چھوڑتیں۔ جس شخص کے سات بیٹے جوان ہو ہو کر دنیا سے اٹھ جائیں، لیکن وہ اپنے فرض کی ادائیگی میں ذرا بھی کوتاہی نہ کرے۔ ایسی مثال مشکل ہی سے کہیں ملے گی۔ ان کی ہمت ٹوٹنا تو جانتی ہی نہیں۔ صدمات کی چوٹیں انہیں اور بھی ٹھوس بنا دیتی ہیں۔ میں کم ہمت اور کمزور شخص ہوں۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ کوئی حکمران قوم محکوم قوم کے ساتھ انصاف اور مساوات کا برتاؤ کر سکتا ہے۔ انسانی فطرت کو میں کسی ملک میں کسی وقت بھی اس قدر بے لوث اور بے غرض نہیں پاتا جس قوم نے ایک بار اپنی آزادی کھودی، وہ پھر اس درجہ کو نہیں حاصل کر سکتی تھی۔ غلام ہی اس کی تقدیر ہو جاتی ہے، لیکن ہمارے ڈاکٹر صاحب انسانی فطرت کو اتنا خود غرض نہیں سمجھتے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ خونخوار جانوروں کے دل میں بھی ازلی نور کی شعاعیں موجود رہتی ہیں۔ صرف پردہ ہٹانے کی ضرورت ہے۔ میں انگریزوں کی طرف سے مایوس ہو گیا ہوں۔ برخلاف اس کے ان کو کامل یقین ہے کہ ہندوستان کی نجات انگریزوں ہی کے ذریعہ ہوسکتی ہے اور ہوگی۔

مسز سیوک: (روکھے پن سے) تو کیا آپ یہ نہیں مانتے کہ انگریزوں نے ہندوستان کے لیے جو کچھ کیا ہے وہ شاید کسی قوم نے کسی ملک یا قوم کے ساتھ نہ کیا ہو؟

کنور صاحب: نہیں۔ میں یہ نہیں مانتا۔

مسز سیوک: (تعجب سے) تعلیم کی اتنی اشاعت اور بھی کسی زمانہ میں ہوئی؟

کنور صاحب: میں اسے تعلیم نہیں کہتا جو انسان کو سراپا خود غرض بنا دے۔

مسز سیوک: ریل، تار، ڈاک، جہاز یہ ساری کراماتیں انگریزوں ہی کے ساتھ آئیں۔

کنور صاحب: انگریزوں کے بغیر بھی آسکتی تھیں اور اگر آئی بھی ہیں تو زیادہ انگریزوں ہی کے فائدہ کے لیے۔

مسز سیوک: ایسا قانون پہلے کبھی نہ تھا۔

کنور صاحب: بجا ہے۔ ایسا قانون کہاں تھا جو ناانصافی کو انصاف اور جھوٹ کو سچ ثابت کر دکھائے۔ یہ انصاف نہیں۔ انصاف کا گورکھ دھندا ہے۔

دفعتاً رانی صاحبہ کمرہ میں آئیں۔ صوفیہ کا چہرہ انہیں دیکھتے ہی فق ہو گیا۔ وہ کمرہ کے باہر نکل گئی۔ رانی کے سامنے کھڑی نہ ہو سکی۔ مسز سیوک کو بھی اندیشہ ہوا کہ کہیں چلتے چلاتے رانی سے پھر نہ بات بڑھ جائے۔ وہ بھی باہر چلی گئیں۔ کنور صاحب نے دونوں کو فٹن پر سوار کرایا۔ صوفیہ نے آب دیدہ ہو کر کنور صاحب کو دست بستہ سلام کیا۔ فٹن چل دی۔ آسمان پر کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ فٹن سڑک پر تیزی سے دوڑی چلی جاتی تھی اور صوفیہ رو رہی تھی۔ اس کی حالت اس بچے کی سی تھی جو روٹی کھاتا ہوا مٹھائی والے کی آواز سن کر اس کے پیچھے دوڑے۔ ٹھوکر کھا کر گر پڑے۔ پیسہ ہاتھ سے نکل جائے اور وہ روتا ہوا گھر لوٹ جائے۔

(15)

راجہ مہیندر کمار سنگھ اگرچہ اصولی معاملہ میں حکام سے ذرا بھی نہ دبتے تھے، لیکن فروعی امور میں وہ خواہ مخواہ ان کی مخالفت کرنا محض بیکار ہی نہیں بلکہ قوم کے لیے مضر خیال کرتے تھے۔ ان کو میانہ روی پر جتنا بھروسہ تھا، اتنا پیش دستی پر نہ تھا۔ خصوصاً اس لیے کہ موجودہ حالات گردوپیش کے ہوتے ہوئے جو کچھ خدمت کر سکتے تھے وہ حکام کا اعتماد رکھ کر ہی کر سکتے تھے۔ اس لیے انہیں کبھی کبھی مجبور ہو کر وہ طریقہ اختیار کرنا پڑتا جس سے انتہا پسندوں کو ان پر انگشت نمائی کا موقع مل جاتا تھا۔ ان میں اگر کوئی کمزوری تھی تو یہ کہ وہ عزت کے بھوکے تھے اور ایسے دیگر انسانوں کی طرح وہ اکثر مصلحت کے نقطۂ خیال سے نہیں بلکہ شہرت طلبی کے خیال سے اپنا طرز عمل قائم کرتے تھے۔ پہلے انہوں نے انصاف کا پہلو لیتے ہوئے جان سیوک کو سورداس کی زمین دلانے سے انکار کر دیا تھا مگر اب ان کو اس کے خلاف کام کرنے کے لیے مجبور

ہونا پڑ رہا تھا۔ اپنے ساتھیوں کو سمجھانے کے لیے تو پانڈے پوروالوں کو طاہر علی کے گھر میں گھسنے پر آمادہ ہونا ہی کافی تھا، لیکن دراصل جان سیوک اور مسٹر کلارک کی باہمی رفاقت نے ہی انہیں اپنا پہلا فیصلہ پلٹ دینے کی ترغیب دی تھی، لیکن ابھی انہوں نے بورڈ میں اس تجویز کو پیش نہ کیا تھا۔ یہ شک ہوتا تھا کہ کہیں لوگ مجھ پر ایک دولتمند سوداگر کی جانبداری کا الزام نہ لگائیں۔ ان کی عادت تھی کہ بورڈ میں کوئی تجویز رکھنے سے پہلے وہ اندو سے یا اس کی عدم موجودگی میں اپنے کسی دوست سے مشورہ کرلیا کرتے تھے۔ ان کے سامنے اپنی بات کو ثابت کرتے ہوئے ان کے شکوک کو رفع کرنے کی کوشش کر کے اپنا اطمینان کر لیتے تھے۔ اگرچہ ان کے ارادہ میں اس بحث مباحثہ سے کوئی فرق واقع نہ ہوتا بلکہ وہ اپنی بات پر قائم رہتے۔ تاہم گھنٹہ دو گھنٹہ کے تبادلہ خیالات سے ان کو بہت تسکین ملتی تھی۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ سمتی کے والنٹیر گڑھوال جانے کے لیے اسٹیشن پر جمع ہو رہے تھے۔ اندو نے گاڑی تیار کرنے کا حکم دیا۔ اگرچہ مطلع ابر آلود ہو رہا تھا اور لمحہ بہ لمحہ آسمان سیاہ تر ہوتا جارہا تھا، لیکن والنٹیروں کو رخصت کرنے اسٹیشن پر جانا ضروری تھا۔ رانی صاحبہ نے اس کو بہت اصرار کے ساتھ طلب کیا تھا۔ وہ جانے کو تیار تھی کہ راجہ صاحب اندر آئے اور اندو کو جانے پر تیار دیکھ کر بولے۔ ''کہاں جاتی ہو؟ بادل گھرا ہوا ہے۔''

اندو: سیوا سمتی کے لوگ گڑھوال جارہے ہیں۔ انہیں رخصت کرنے اسٹیشن جا رہی ہوں۔ اماں جی نے بلایا بھی ہے۔

راجہ: پانی ضرور برسے گا۔

اندو: پردہ ڈال لوں گی اور بھیگ بھی گئی تو کیا آخر وہ بھی تو انسان ہیں جو قومی خدمت کے لیے اتنی دور جارہے ہیں۔

راجہ: نہ جاؤ تو کوئی ہرج ہے؟ اسٹیشن پر مجمع زیادہ ہوگا۔

اندو: ہرج کیا ہوگا۔ میں جاؤں یا نہ جاؤں وہ لوگ تو جائیں گے ہی لیکن دل نہیں مانتا۔ وہ لوگ گھر بار چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ نہ جانے کتنی تکلیفیں برداشت کریں گے۔ نہ جانیں کب لوٹیں گے۔ مجھ سے اتنا بھی نہ ہو کہ انہیں رخصت کر آؤں۔ آپ بھی کیوں نہیں چلتے؟

راجہ: (متحیر ہو کر) میں؟

اندو: ہاں ہاں۔ آپ کے جانے میں کوئی ہرج ہے؟

راجہ: میں ایسی جماعتوں میں شریک نہیں ہوتا۔

اندو: کیسی جماعتوں میں؟

راجہ: اسی قسم کی جماعتوں میں۔

اندو: کیا سیوا سمتیوں سے ہمدردی رکھنا بھی قابل اعتراض ہے؟ میں تو سمجھتی ہوں کہ ایسے مبارک کاموں میں شریک ہونا کسی کے لیے بھی شرم یا اعتراض کا سبب نہیں ہو سکتا۔

راجہ: تمہاری اور میری سمجھ میں بہت فرق ہے۔ اگر میں بورڈ کا صدر نہ ہوتا تو میں حکومت کا ایک رکن نہ ہوتا۔ اگر میں ریاست کا مالک نہ ہوتا تو آزادی سے ہر ایک جمہوری تحریک میں حصہ لیتا۔ موجودہ حالت میں میرا کسی ایسی جماعت میں شریک ہونا اس بات کا ثبوت سمجھا جائے گا کہ حکام کو بھی اس جماعت سے ہمدردی ہے۔ میں اس غلط خیال کی اشاعت نہیں کرنا چاہتا۔ سیوا سمتی نوجوانوں کی جماعت ہے اور اگر چہ اس وقت اس نے خدمت عامہ کا معیار اپنے سامنے رکھا ہے اور وہ اسی خدمت کے راستہ پر چلنے کی آرزو رکھتی ہے، لیکن تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ خدمت یا فیض رسانی ایسی شکل اختیار کر لیتی ہے جسے کوئی حکومت مقبولیت کی نظر سے نہیں دیکھ سکتی اور علانیہ یا پوشیدہ طریقوں سے اس کو برباد کر دینے کی کوشش کرنی پڑتی ہے۔ میں۔ اتنی بڑی ذمہ داری اپنے سر نہیں لینا چاہتا۔

اندو: تو آپ اس عہدہ سے سبکدوش کیوں نہیں ہو جاتے؟ اپنی آزادی کا خون کیوں کرتے ہیں؟

راجہ: صرف اس لیے کہ مجھے یقین ہے کہ شہر کا انتظام جتنی خوبی سے میں کر سکتا ہوں اور کوئی نہیں کر سکتا۔ اہل شہر کی خدمت کا ایسا عمدہ اور کمیاب موقع پا کر میں اپنی آزادی کی ذرا بھی پروا نہیں کرتا۔ میں ایک ریاست کا راجہ ہوں اور فطرتاً میری ہمدردی سرکار کے ساتھ ہے۔ مساوات اور جمہوریت کو جائیداد سے دشمنی ہے۔ میں اس وقت تک جمہوریت کا ساتھ نہ دوں گا جب تک میں اپنی جائیداد سے دست بردار ہو جانے کا ارادہ نہ کرلوں۔ میں قول سے جمہوریت کا پیرو بن کر اپنے فعل سے اس کا مخالف نہیں بننا چاہتا۔ قول و فعل میں اتنا زبردست اختلاف ہونا میرے لیے ناقابل برداشت ہے۔ میں ان لوگوں کو فریبی اور مکار سمجھتا ہوں جو اپنی جائیداد سے مستفید ہوتے ہوئے جمہوریت کی دہائی دیتے پھرتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جمہوریت کے دیوتا کے پجاری بن کر وہ کس منہ سے عظیم الشان محلوں میں رہتے ہیں۔ موٹر کشتیوں میں سوار ہو کر دریا کی سیر کرتے ہیں اور دنیا کی نعمتوں کا دل کھول کر لطف اٹھاتے ہیں۔ اپنے کمرہ سے فرش ہٹا دینا اور سادی پوشاک پہن لینا ہی جمہوریت نہیں ہے۔ یہ بے حیائی اور دغابازی ہے۔ اپنے دسترخوان کے بچے کھچے ٹکڑوں کو غریبوں کے سامنے پھینک دینا جمہوریت کا منہ چڑانا ہے، اسے بدنام کرنا ہے۔

یہ حملہ کنور صاحب پر تھا۔ اندو سمجھ گئی۔ تیوریاں بدل گئیں، لیکن اس نے ضبط سے کام لیا اور اس ناخوشگوار قضیہ کو تمام کرنے کے لیے بولی۔ ''مجھے دیر ہو رہی ہے، تین بجنے والے ہیں۔ ساڑھے تین بجے گاڑی چھوٹتی ہے۔ اماں جی سے ملاقات ہو جائے گی۔ ونے کی خیر و عافیت کا حال بھی معلوم ہو جائے گا۔ ایک پنتھ دو کاج ہو گا۔''

راجہ: جن وجوہ سے میرا جانا نامناسب ہے انہیں وجوہ سے تمہارا جانا بھی مناسب نہیں۔ تم جاؤ یا میں جاؤں۔ ایک ہی بات ہے۔

اندو اسی پاؤں اپنے کمرہ میں واپس آئی اور سوچنے لگی، یہ ظلم نہیں تو اور کیا ہے۔ زبردست ظلم! کہنے کو میں رانی ہوں مگر اتنا اختیار بھی نہیں کہ گھر سے باہر جا سکوں۔ مجھ سے تو لونڈیاں ہی اچھی ہیں۔ دل بہت مغموم ہو گیا۔ آنکھیں اشک آلودہ ہو گئیں۔ اس نے گھنٹی بجائی اور لونڈی سے کہا۔ ''گاڑی کھلوا دو۔ میں اسٹیشن نہیں جاؤں گی۔''

مہیندر کمار بھی اس کے پیچھے ہی کمرہ میں آکر بولے۔ ''کہیں سیر کیوں نہ کر آتیں؟''

اندو: نہیں بادل گھرا ہوا ہے۔ بھیگ جاؤں گی۔

راجہ: کیا ناراض ہو گئیں؟

اندو: ناراض کیوں ہوں؟ آپ کی لونڈی ہوں آپ نے حکم دیا نہ جاؤ نہ جاؤں گی۔

راجہ: میں تمہیں مجبور نہیں کرنا چاہتا۔ اگر میری باتوں کو جان لینے کے بعد بھی تمہیں وہاں جانے میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں معلوم ہوتی تو شوق سے جاؤ۔ میرا مقصد صرف تمہاری معقولیت پسندی کی تحریک سے تھا۔ میں انصاف طاقت سے روکنا چاہتا ہوں، حکم کی طاقت سے نہیں۔ بولو اگر تمہارے جانے سے میری بدنامی ہو تو تم جانا چاہو گی؟

یہ چڑیا کے پر کاٹ کر اسے اڑانا تھا۔ اندو نے اڑنے کی کوشش ہی نہ کی۔ اس سوال کا صرف ایک ہی جواب ہو سکتا تھا۔ ''ہرگز نہیں۔ یہ میرے دھرم کے خلاف ہے۔'' لیکن اندو پر اپنی مجبوری اتنی کھل رہی تھی کہ اس نے اس سوال کو سنا ہی نہیں یا سنا بھی تو اس نے ان سنا کر دیا۔ اس کو ایسا معلوم ہوا کہ یہ میرے زخم پر نمک چھڑک

رہے ہیں۔اماں اپنے دل میں کیا کہیں گی۔میں نے بلایا اور نہیں آئی۔کیا دولت کی ہوا لگ گئی۔کس طرح معافی مانگوں۔اگر لکھوں کہ طبیعت ناساز ہے تو وہ ابھی یہاں آ پہنچیں گی اور مجھے شرمندہ ہونا پڑے گا۔آہ اب تو وہاں پہنچ گئی ہوتی۔پربھوسیوک نے بہت پر اثر نظم لکھی ہوگی۔دادا جی کا وعظ بھی معرکہ کا ہوگا۔ایک ایک لفظ محبت اور رغبت میں ڈوبا ہوا! والنٹیر لوگ اپنی خوشنما وردیوں میں کتنے خوبصورت معلوم ہوتے ہوں گے۔

اس قسم کے خیالات نے اندو کو اس قدر خواہش مند بنا دیا کہ وہ ضد کرنے پر آمادہ ہوگئی۔میں تو جاؤں گی۔بدنامی نہیں پتھر ہوگی۔یہ سب مجھے روک رکھنے کے بہانے ہیں۔تم ڈرتے ہو ڈرو۔اپنے کرموں کے پھل بھوگو گے۔میں کیوں ڈروں۔اپنے دل میں یہ خیالات کرتے ہوئے اس نے مصمم لہجہ میں کہا۔''آپ نے مجھے جانے کی اجازت دے دی ہے، میں جاتی ہوں۔''

راجہ نے بے دلی سے کہا۔''تمہاری مرضی جانا چاہتی ہو تو شوق سے جاؤ۔''

اندو چلی گئی تو راجہ صاحب سوچنے لگے۔عورتیں کتنی بے درد، کتنی خود پسند اور کتنی ضدی ہوتی ہیں۔چلی جا رہی ہیں۔گویا میں کچھ بھی نہیں ہوں۔اس کا ذرا بھی خیال نہیں کہ حکام کے کانوں تک یہ خبر پہنچے گی تو وہ مجھے کیا کہیں گے۔اخبارات کے نامہ نگار یہ خبر ضرور ہی لکھیں گے اور وہاں جانے والی عورتوں میں چتاری کی رانی کا نام جلی حروف میں لکھا ہوا نظر آئے گا۔میں جانتا کہ اتنی ضد کریں گی تو منع ہی کیوں کرتا۔خود بھی ساتھ جاتا۔ایک طرف بدنام ہوتا تو دوسری طرف نیک نام۔اب تو دونوں طرف سے گیا۔ادھر بھی برا بنا اور ادھر بھی۔آج معلوم ہوا کہ عورتوں کے سامنے محض صاف گوئی سے کام نہیں چلتا۔وہ راضی رہتی ہیں تو دل جوئی سے!

اندو اسٹیشن کی طرف چلی، لیکن جوں جوں آگے بڑھتی تھی، اس کا دل ایک بوجھ سے دبا جاتا تھا۔میدان میں جسے ہم فتح کہتے ہیں، گھر میں اسی کا نام کج خلقی۔بے

مروتی اور نااہلیت ہے۔ اندو کو اس فتح پر غرور نہ تھا۔ اپنی ضد کا ملال تھا۔ سوچتی جاتی تھی۔ وہ مجھے اپنے دل میں کتنی خودسر و مغرور سمجھ رہے ہوں گے کہ جب یہ ذرا ذرا سی باتوں میں یوں آنکھیں پھیر لیتی ہے، ذرا ذرا سے اختلافات میں یوں لڑنے پر آمادہ ہو جاتی ہے تو کسی نازک موقع پر اس سے ہمدردی و غمگساری کی کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ اماں جی یہ حال سنیں گی تو مجھی کو بھلا برا کہیں گی ۔ بے شک مجھ سے غلطی ہوئی۔ واپس چلوں اور ان سے اپنی اس غلطی کے لیے معافی مانگوں۔ میرے سر پر نہ جانے کیوں بھوت سوار ہو جاتا ہے۔ خواہ مخواہ الجھ پڑی۔ بھگوان! مجھے کب اتنی عقل آئے گی کہ ان کی مرضی پر سر جھکانا سیکھوں گی۔

اندو نے باہر کی طرف سر نکال کر دیکھا۔ اسٹیشن کا سگنل نظر آ رہا تھا۔ عورتوں اور مردوں کا ایک انبوہ اسٹیشن کی طرف دوڑتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ سواریوں کا تانتا لگا ہوا تھا۔ اس نے کوچوان سے کہا۔ ’’گاڑی پھیر دو۔ میں اسٹیشن نہ جاؤں گی۔ گھر واپس چلو۔‘‘

کوچوان نے کہا۔ ’’سرکار! اب تو آ گئے۔ وہ دیکھیے۔ کئی آدمی مجھے اشارتاً کہہ رہے ہیں کہ گھوڑوں کو بڑھاؤ۔ گاڑی پہچانتے ہیں۔‘‘

اندو: کچھ پروا نہیں۔ فوراً گھوڑے پھیر دو۔

کوچوان: کیا سرکار کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی کیا؟

اندو: بک بک مت کرو۔ گاڑی واپس لے چلو۔

کوچوان نے گاڑی پھیر دی۔ اندو نے ایک لمبی سانس لی اور سوچنے لگی۔ سب لوگ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ گاڑی دیکھتے ہی پہچان گئے تھے۔ اماں کتنی خوش ہوئی ہوں گی۔ پر گاڑی کو لوٹتے دیکھ کر انہیں اور دوسرے لوگوں کو کتنا تعجب ہوا ہو گا۔ کوچوان سے کہا۔ ’’ذرا پیچھے منہ پھیر کر دیکھو۔ کوئی آ تو نہیں رہا ہے؟‘‘

کوچوان: حضور۔ کوئی گاڑی تو آ رہی ہے۔

اندو: گھوڑوں کو تیز کر دو۔ سرپٹ چھوڑ دو۔

کوچوان: حضور گاڑی نہیں۔ موٹر ہے۔ صاف موٹر ہے۔

اندو: گھوڑوں کا چابک لگاؤ۔

کوچوان: حضور یہ تو اپنی ہی موٹر معلوم ہوتی ہے۔ ہینگن سنگھ چلا رہے ہیں۔ خوب پہچان گیا۔ اپنی ہی موٹر ہے۔

اندو: پاگل ہو۔ اپنی موٹر کیوں آنے لگی؟

کوچوان: حضور۔ اپنی موٹر نہ ہو تو جو چور کی سزا وہ میری۔ صاف نظر آ رہی ہے۔ وہی رنگ ہے۔ ایسی موٹر اس شہر میں دوسری ہے ہی نہیں۔

اندو: ذرا غور سے دیکھو۔

کوچوان: کیا دیکھوں۔ حضور۔ وہ آ پہنچی۔ سرکار بیٹھے ہیں۔

اندو: خواب تو نہیں دیکھ رہا ہے!

کوچوان: لیجیے حضور۔ یہ برابر آ گئی۔

اندو نے گھبرا کر باہر دیکھا تو سچ مچ اپنی ہی موٹر تھی۔ گاڑی کے برابر پہنچ کر وہ رک گئی اور راجہ صاحب اتر پڑے۔ کوچوان نے گاڑی روک دی۔ اندو نے حیرت سے پوچھا۔ ''آپ کب آ گئے؟''

راجہ: تمہارے آنے کے پانچ منٹ بعد میں بھی چل پڑا۔

اندو: راستہ میں تو کہیں نہیں دکھائی دیئے۔

راجہ: لائن کی طرف سے آیا ہوں۔ ادھر کی سڑک خراب ہے۔ میں نے سمجھا ذرا چکر تو پڑے گا مگر جلد پہنچوں گا۔ تم اسٹیشن کے سامنے سے کیسے لوٹ آئیں؟ کیا بات ہے؟ طبیعت تو اچھی ہے؟ میں تو گھبرا گیا۔ آؤ۔ موٹر پر بیٹھ جاؤ۔ اسٹیشن پر گاڑی آ گئی ہے۔ دس منٹ میں چھوٹ جائے گی۔ لوگ ملنے کے خواہش مند ہیں۔

اندو: اب میں نہ جاؤں گی۔ آپ تو پہنچ ہی گئے تھے۔

راجہ: تمہیں چلنا پڑے گا۔

اندو: مجھے مجبور نہ کیجیے۔ میں نہ جاؤں گی۔

راجہ: پہلے تو تم یہاں آنے کے لیے اتنی بے قرار تھیں۔ اب کیوں انکار کر رہی ہو؟

اندو: آپ کی مرضی کے خلاف آئی تھی۔ آپ نے میری خاطر اپنے اصول کو توڑ دیا تو میں کس منہ سے وہاں جا سکتی ہوں۔ آپ نے مجھے ہمیشہ کے لیے رواداری کا سبق دے دیا۔

راجہ: میں ان لوگوں سے تمہیں لانے کا وعدہ کر آیا ہوں۔ تم نہ چلو گی تو مجھے کتنا محجوب ہونا پڑے گا۔

اندو: آپ خواہ مخواہ اصرار کر رہے ہیں۔ آپ کو مجھ سے ناراض ہونے کا یہ آخری موقع تھا۔ اب پھر اتنی جرأت نہ کروں گی۔

راجہ: انجن سیٹی دے رہا ہے۔

اندو: ایشور کے لیے مجھے جانے دیجیے۔

راجہ نے مایوس ہو کر کہا۔ ''جیسی تمہاری مرضی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اور تمہارے ستاروں میں کوئی فطری نامناسبت ہے جو ہر وقت اپنا اثر دکھلاتی رہتی ہے۔ ''

یہ کہہ کر وہ موٹر پر سوار ہو گئے اور بڑی تیزی سے اسٹیشن کی طرف چلے۔ فٹن بھی آگے بڑھی۔ کوچوان نے پوچھا کہ حضور گئیں کیوں نہیں۔ سرکار برا مان گئے۔

اندو نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ وہ سوچ رہی تھی۔ کیا مجھ سے پھر غلطی ہوئی۔ کیا میرا جانا مناسب تھا۔ کیا وہ سچے دل سے میرے جانے کے لیے اصرار کر رہے تھے یا ایک تازیانہ لگانا چاہتے تھے۔ ایشور ہی جانے۔ وہی عالم الغیب ہے۔ میں کسی کے دل کی بات کیا جانوں۔

گاڑی آہستہ آہستہ آگے بڑھتی جاتی تھی۔ آسمان پر چھائے ہوئے بادل پھٹ

رہے تھے، لیکن اندو کے دل پر چھائی ہوئی گھٹا لمحہ بہ لمحہ زیادہ گھنی ہوتی جا رہی تھی۔

''آہ۔ کیا واقعی ہمارے ستاروں میں کوئی فطری نامناسبت ہے جو قدم قدم پر ہمارے ارادوں کو پامال کرتی رہتی ہے؟ میں کتنا چاہتی ہوں کہ ان کی مرضی کے خلاف ایک قدم بھی نہ چلوں مگر یہ طالع کی نحوست مجھے ہمیشہ زک دیتی ہے۔ اگر وہ صاف دلی سے اصرار کر رہے تھے تو میرا انکار سراسر بیجا تھا۔ آہ انہیں میرے ہاتھوں دکھ پہنچا۔ انہوں نے اپنی جبلی شرافت سے مجھے معاف کر دیا اور میری دل جوئی کے لیے اپنے اصول کی پروا نہ کی۔ سمجھے ہوں گے اکیلی جائے گی تو لوگ خیال کریں گے کہ شوہر کی مرضی کے خلاف آئی ہے ورنہ کیا وہ بھی نہ آتے۔ مجھے اس الزام سے بچانے کے لیے انہوں نے اپنے اوپر اتنا جبر کیا۔ میری حماقت سے وہ کس قدر مایوس ہوئے ہیں ورنہ ان کے منہ سے یہ جملہ کبھی نہ نکلتا۔ میں سچ مچ ابھاگنی ہوں۔''

انہیں افسوس ناک خیالات میں ڈوبی ہوئی وہ چندر بھون پہنچی اور گاڑی سے اتر کر سیدھی راجہ صاحب کے دیوان خانہ میں جا بیٹھی۔ آنکھیں چرا رہی تھی کہ کسی نوکر چاکر سے سامنا نہ ہو جائے۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے چہرہ پر کوئی داغ لگا ہوا ہے۔ جی چاہتا تھا کہ راجہ صاحب آتے ہی آتے مجھ پر بگڑنے لگیں۔ مجھے خوب آڑے ہاتھوں لیں۔ جگر کو طعنوں کے تیروں سے چھلنی بنا دیں۔ یہی ان کی صاف دلی کا ثبوت ہوگا۔ اگر وہ آ کر مجھ سے میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگیں تو سمجھ جاؤں گی کہ میری طرف سے ان کا دل صاف نہیں۔ بلکہ یہ سب محض ظاہر داری ہے۔ وہ اس وقت اپنے شوہر کی سخت گیری کی خواہشمند تھی۔ گرمیوں میں کسان بارش کا نہیں بلکہ حدت کا بھوکا ہوتا ہے۔

اندو کو بہت دیر تک انتظار نہ کرنا پڑا۔ پانچ بجتے بجتے راجہ صاحب آ پہنچے۔ وہ دروازہ پر کھڑی ہو گئی۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ راجہ صاحب اس کو دیکھتے ہی محبت آمیز لہجہ میں بولے۔ ''تم نے آج قومی سرگرمی کا ایک بے مثل نظارہ دیکھنے کا موقع

کھو دیا۔ بڑا ہی دلکش منظر تھا۔ کوئی ہزار آدمیوں نے جس وقت جانے والوں پر پھول برسائے تو ساری زمین پھولوں سے ڈھک گئی۔ والنٹیر وں کا قومی گانا تو اتنا پر اثر کہ تماشائی مست ہو گئے۔ میرا دل قومی غرور سے اچھلنے لگا۔ بار بار یہی افسوس ہوتا تھا کہ تم نہ ہوئیں۔ یہی سمجھ لو کہ میں اس لطف کا اظہار نہیں کر سکتا۔ میرے دل میں سیوا سمتی کے متعلق جتنے شکوک تھے وہ سب رفع ہو گئے۔ یہی جی چاہتا تھا کہ میں بھی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس جماعت کے ساتھ چلا جاتا۔ ڈاکٹر گنگولی کو اب تک میں بالکل بکواسی سمجھتا تھا۔ آج میں ان کا حوصلہ دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ تم نے سخت غلطی کی۔ تمہاری ماتا جی بار بار پچھتاتی تھیں۔''

اندو کو جس بات کا خوف تھا وہ پوری ہوگئی۔ سوچا کہ یہ سب ظاہر داری ہے۔ ان کا دل صاف نہیں ہے۔ یہ مجھے بیوقوف سمجھتے ہیں اور بیوقوف بنانا چاہتے ہیں۔ اس شیریں بیانی کے پردہ میں کتنی تلخی چھپی ہوئی ہے۔ چڑھ کر بولی۔ ''میں جاتی تو آپ کو ضرور برا معلوم ہوتا۔''

راجہ: (ہنس کر) محض اس لیے کہ میں نے تمہیں جانے سے روکا تھا؟ اگر مجھے برا معلوم ہوتا تو میں خود ہی کیوں جاتا؟

اندو: معلوم نہیں۔ آپ کیا سمجھ کر گئے۔ شاید مجھے خفیف کرنا منظور تھا۔

راجہ: اندو۔ اتنی بدگمان نہ ہو۔ سچ کہتا ہوں مجھے تمہارے جانے کا ذرا بھی ملال نہ ہوتا۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ مجھے پہلے تمہاری ضد بری معلوم ہوئی، لیکن جب میں نے غور کیا تو مجھے اپنا طرز عمل بالکل غیر مناسب معلوم ہوا۔ میں نے خیال کیا کہ تمہاری آزادی میں اس حد تک مخل ہونا میری زیادتی ہے۔ اپنی غلطی کا اعتراف کرنے کی غرض سے میں اسٹیشن گیا۔ تمہاری وہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی کہ حکام کے دلوں میں اپنا وقار قائم رکھنے کے لیے اپنی آزادی کا خون کیوں کرتے ہو۔ نیک نام رہنا اچھی بات ہے، لیکن نیک نامی کے لیے سچی باتوں میں دبنا اپنے ضمیر کا خون

کرنا ہے۔ اب تو تمہیں میری باتوں کا یقین ہوا؟

اندو: آپ کی دلیلوں کا جواب میں نہیں دے سکتی، لیکن آپ سے التجا کرتی ہوں کہ جب مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہو تو آپ مجھے تنبیہ کریں اور ملامت کریں۔ جرم اور سزا میں علت اور معلول کا واسطہ ہے اور یہی میری سمجھ میں آتا ہے۔ خطا کار کے سر پر تیل چپڑتے میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ مجھے یہ بات غیر قدرتی معلوم ہوتی ہے۔ اس سے میرے دل میں طرح طرح کے شکوک پیدا ہوتے ہیں۔

راجہ: دیوی روٹھتی ہیں تو لوگ انہیں مناتے ہیں۔ اس میں غیر قدرتی بات کیا ہے؟

دونوں میں دیر تک سوال و جواب ہوتے رہے۔ مہیندر پہلے (صیاد) کی طرح دانہ دکھا کر چڑیا کو پھنسانا چاہتے تھے اور چڑیا ڈر کر اڑ جاتی تھی۔ فریب سے فریب ہی پیدا ہوتا ہے۔ وہ اندو کی تشفی نہ کر سکے۔ تب وہ اس کی تکلیف کے رفع کرنے کا کام وقت پر چھوڑ کر ایک خط پڑھنے لگے اور اندو دل پر بوجھ رکھے ہوئے اندر چلی گئی۔

دوسرے روز راجہ صاحب نے روزنامہ اخبار کھولا تو اس میں رضا کاروں کی رخصتی کا تذکرہ بہ تفصیل شائع ہوا تھا۔ ضمناً راجہ صاحب کی موجودگی پر بھی رائے زنی کی گئی تھی۔ ''اس موقع پر میونسپلٹی کے صدر راجہ مہیندر کمار سنگھ کی موجودگی ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ تعجب ہے کہ راجہ صاحب جیسے معاملہ فہم شخص نے وہاں جانا کیوں ضروری سمجھا؟ راجہ صاحب اپنی ذات کو اپنے عہدہ سے جدا نہیں کر سکتے اور ان کی موجودگی گورنمنٹ کو الجھن میں ڈالنے کا سبب ہو سکتی ہے۔ تجربہ نے یہ بات ثابت کر دی ہے۔ سیوا سمتیوں کا آغاز خواہ کتنے ہی نیک ارادوں کو لے کر ہوا ہو لیکن انجام کار وہ بغاوت اور بدامنی کا مرکز بن جاتی ہیں۔ کیا راجہ صاحب اس کا ذمہ لے سکتے ہیں کہ یہ سیوا سمتی بھی آگے چل کر اپنی پیشرو سمتیوں کے نقش قدم پر نہ چلے گی؟

راجہ صاحب نے اخبار بند کر کے رکھ دیا اور خیال میں غرق ہو گئے۔ ان کے منہ

سے بے اختیار نکل گیا، وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ آج کلب میں جاتے ہی جانتے مجھ پر چاروں طرف سے مشتبہ نگاہیں پڑنے لگیں گی۔ کل ہی کمشنر صاحب سے ملنے جانا ہے۔ انہوں نے اس بارے میں کچھ پوچھا تو کیا کہوں گا؟ اس کم بخت اڈیٹر نے مجھے برا چرکا دیا۔ پولیس والوں کی طرح اس فرقہ میں بھی مروت نہیں ہوتی۔ ذرا بھی رعایت نہیں کرتے۔ میں اس کا منہ بند رکھنے کے لیے، اسے خوش رکھنے کے لیے کتنی کوششیں کیا کرتا ہوں۔ ضروری اور غیر ضروری اعلانات چھپوا کر اس کی مٹھیاں گرم کرتا رہتا ہوں۔ جب کوئی دعوت یا تقریب ہوتی ہے تو سب سے پہلے اسے مدعو کرتا ہوں۔ یہاں تک کہ سال گزشتہ میں اسے میونسپلٹی سے انعام بھی دلا دیا تھا۔ انہیں خاطر داریوں کا یہ صلہ ہے۔ کتے کی دم کو سو برس تک گاڑ رکھو، پھر بھی ٹیڑھی کی ٹیڑھی۔ اب اپنی پوزیشن کو کیونکر صاف کروں؟ اس کے پاس جانا تو درست نہیں۔ کیا کوئی حیلہ سوچوں۔

راجہ صاحب بہت دیر تک اسی شش و پنج میں پڑے رہے۔ کوئی ایسی بات سوچ نکالنا چاہتے تھے جس سے حکام کی نگاہوں میں وقار قائم رہے اور ساتھ ہی عوام کی نگاہوں میں بھی، مگر عقل کچھ کام نہ کرتی تھی۔ کئی بار ارادہ کیا کہ چل کر اندو سے اس گتھی کے سلجھانے میں مدد لوں، پر یہ سمجھ کر کہ کہیں وہ کہہ دے کہ حکام ناراض ہوتے ہیں تو ہونے دو۔ تمہیں ان سے کیا سروکار۔ اگر وہ تمہیں دبائیں تو فوراً استعفے دے دو، تو پھر نکلنے کا کوئی راستہ نہ رہے گا۔ اس سے کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑی۔

وہ تمام رات اسی فکر میں ڈوبے رہے۔ اندو بھی کچھ گم سم سی رہی۔ علی الصبح دو چار احباب آ گئے اور انہوں نے اسی مضمون کا تذکرہ کیا۔ ایک صاحب بولے۔ میں کمشنر سے ملنے گیا تھا تو وہ اسی مضمون کو پڑھ رہے تھے اور رہ رہ کر زمین پر پیر ٹپکتے جاتے تھے۔

راجہ صاحب کے ہوش اور بھی اڑ گئے۔ فوراً انہیں ایک تدبیر سوجھ گئی۔ موٹر تیار

کرائی اور کمشنر کے بنگلہ پر جا پہنچے۔ یوں تو صاحب بہادر راجہ صاحب کو ان کا کارڈ پاتے ہی بلا لیا کرتے تھے۔ آج اردلی نے کہا۔ ”صاحب ایک ضروری کام کر رہے ہیں۔ میم صاحب بیٹھی ہیں۔ آپ ایک گھنٹہ ٹھہریں۔“

راجہ صاحب سمجھ گئے کہ آثار اچھے نہیں ہیں۔ وہیں بیٹھ کر ایک انگریزی رسالہ کی تصاویر دیکھنے لگے۔ وہ کتنی صاف اور خوشنما تصاویر ہیں۔ ہمارے رسالوں میں کتنی بھدی تصویریں ہوتی ہیں۔ فضول ہی کاغذ کو لیپ پوت کر خراب کیا جاتا ہے۔ کسی نے بہت کیا تو **ملک الشعرا** بہار کے جذبات کی بنا پر کسی خوب صورت نازنین کی تصویر بنوا دی اور اس کے نیچے اسی نوعیت کا دوہا لکھ دیا۔ کسی نے پدمان کی کبت پر تصویر بنوا لی۔ بس اس کے آگے کسی کی عقل رسا نہیں ہوتی۔

کسی طرح ایک گھنٹہ گزرا اور صاحب نے بلایا۔ راجہ صاحب اندر گئے تو صاحب کے تیور پر بل پڑے ہوئے نظر آئے۔ ایک گھنٹہ کے انتظار سے جھنجھلا گئے تھے۔ کھڑے کھڑے بولے۔ ”آپ کو فرصت ہو تو میں کچھ کہوں ورنہ پھر کبھی آؤں گا۔“

کمشنر صاحب نے رکھائی سے پوچھا۔ ”میں پہلے آپ سے یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اس اخبار نے آپ پر جو رائے زنی کی ہے، وہ آپ کی نظر سے گذری ہے؟“

راجہ صاحب: جی ہاں دیکھ چکا ہوں۔

کمشنر: آپ اس کا کوئی جواب دینا چاہتے ہیں؟

راجہ صاحب: میں اس کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتا۔ اگر محض اتنی سی بات پر مجھ پر شک کیا جا سکتا ہے اور میری سالہا سال کی وفاداری کا کچھ خیال نہیں کیا جاتا تو مجھے مجبور ہو کر اپنے عہدہ سے استعفیٰ دینا پڑے گا۔ اگر آپ خود وہاں جاتے تو کیا اس کی اتنی جرأت ہوتی کہ آپ کے بارے میں بھی اس قسم کی رائے زنی کرتا۔ یہ میرے ہندوستانی ہونے کی سزا ہے۔ جب تک مجھ پر اس قسم کے بے جا حملے ہوتے رہیں

گے، میں نہیں سمجھ سکتا کہ اپنے فرائض کو کس طرح انجام دے سکوں گا۔

کمشنر نے کسی قدر نرمی سے کہا۔ ''گورنمنٹ کے ہر ایک عملہ کا فرض ہے کہ اپنے اوپر ایسے الزامات لگائے جانے کا موقع نہ دے۔''

راجہ صاحب: میں جانتا ہوں۔ آپ لوگ اس بات کو کبھی نہیں بھول سکتے کہ میں ہندوستانی ہوں۔ اسی طرح میرے بورڈ کے رفقاء کے لیے یہ بھول جانا بالکل ناممکن ہے کہ میں حکومت کا ایک رکن ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ میں بورڈ کے سامنے مسٹر جان سیوک کو پانڈے پور والی زمین دیئے جانے کی تجویز پیش کرنے والا ہوں، لیکن جب تک میں اپنے طرزِ عمل سے یہ بات ثابت نہ کر دوں گا کہ میں نے خود بغیر کسی دباؤ کے صرف رعایا کے مفاد کے لیے یہ تجویز پیش کی ہے، اس وقت اس کی منظوری کی کوئی امید نہیں ہے۔ اسی وجہ سے میں کل اسٹیشن گیا تھا۔

کمشنر کی باچھیں کھل گئیں۔ ہنس ہنس کر باتیں بنانے لگا۔

راجہ صاحب: ایسی حالت میں کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میرا جواب دینا ضروری ہے۔

کمشنر: نہیں نہیں۔ ہرگز نہیں۔

راجہ صاحب: مجھے آپ سے پوری مدد ملنی چاہیے۔

کمشنر: میں حتی الامکان آپ کی مدد کروں گا۔

راجہ صاحب: بورڈ نے منظور بھی کر لیا تو محلّہ والوں کی طرف سے فساد کا اندیشہ ہے۔

کمشنر: کچھ پروا نہیں۔ میں سپرنٹنڈنٹ پولیس کو تاکید کر دوں گا کہ وہ آپ کی مدد کرتے رہیں۔

راجہ صاحب یہاں سے چلے تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا آسمان پر چل رہے ہیں۔ یہاں سے وہ مسٹر کلارک کے پاس گئے اور وہاں بھی اسی حکمت سے کام لیا۔ دوپہر کو گھر آئے۔ ان کے دل میں یہ خیال کھٹک رہا تھا کہ اس بہانہ سے میرا کام تو نکل

گیا، لیکن میں سورداس کے ساتھ کہیں ایسی زیادتی تو نہیں کر رہا ہوں کہ بالآخر مجھے شہر والوں کے سامنے نادم ہونا پڑے۔ اسی معاملہ پر گفتگو کرنے کے لیے وہ اندو کے پاس گئے اور بولے۔ ''تم کوئی ضروری کام تو نہیں کر رہی ہو۔ مجھے ایک معاملہ میں تم سے کچھ مشورہ کرنا ہے۔''

اندو ڈر گئی کہ کہیں مشورہ ہوتے ہوتے تنازع کی نوبت نہ آئے۔ بولی۔ ''کام تو کچھ نہیں کر رہی ہوں، لیکن میں آپ کو کوئی صلاح دینے کے قابل نہیں ہوں۔ ایشور نے مجھ کو اتنی عقل ہی نہیں دی۔ مجھے تو اس نے کھانے سونے اور آپ کو دق کرنے کے لیے بنایا ہے۔''

راجہ صاحب: تمہارے دق کرنے ہی میں تو مزہ آتا ہے۔ بتلاؤ۔ سورداس کی زمین کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ تم میری جگہ ہوتیں تو کیا کرتیں؟

اندو: آخر آپ نے کیا تجویز کیا؟

راجہ صاحب: پہلے تم بتاؤ تو پھر میں بتاؤں گا۔

اندو: میرے رائے میں تو سورداس سے اس کے باپ دادوں کی زمین چھین لینا سراسر انصاف کے خلاف ہوگا۔

راجہ صاحب: تمہیں معلوم ہے کہ سورداس کو اس زمین سے کوئی نفع نہیں پہنچ رہا ہے۔ صرف ادھر ادھر کے مواشی چرا کرتے ہیں۔

اندو: اسے یہ اطمینان تو ہے کہ یہ زمین میری ہے۔ محلّہ والے اس کا احسان تو مانتے ہی ہوں گے۔ اس کی مذہبی خواہش اس کار ثواب سے پوری ہوتی ہوگی۔

راجہ صاحب: لیکن میں شہر کے ایک خاص منتظم کی حیثیت سے ایک شخص کے واقعی یا فرضی فائدہ کے لیے شہر کے ہزاروں روپیہ کا نقصان تو نہیں کر سکتا۔ کارخانہ کھلنے سے ہزاروں مزدوروں کی پرورش ہوگی۔ شہر کی آمدنی میں اضافہ ہوگا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس بے شمار دولت کا ایک حصہ ملک میں رہ جائے گا جو سگریٹ

کے لیے دوسرے ملکوں کے حوالہ کر دینا پڑتا ہے۔

اندو نے راجہ صاحب کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھا۔سوچنے لگی۔ان کا مطلب کیا ہے؟سرمایہ داروں سے تو ان کو کوئی خاص انس نہیں ہے۔یہ تو مشورہ نہیں۔بحث ہے۔کیا حکام کے دباؤ سے انہوں نے زمین کو مسٹر سیوک کے حوالے کر دینے کا فیصلہ کیا ہے اور مجھ سے اپنی تجویز کی تائید کرانی چاہتے ہیں۔ان کی باتوں سے تو کچھ ایسا ہی ظاہر ہو رہا ہے۔بولی۔''اس نقطہ خیال سے تو یہی قرین انصاف ہے کہ سورداس سے وہ زمین چھین لی جائے۔''

راجہ صاحب: بھئی۔اتنی جلدی پہلو بدلنے کی سند نہیں۔اپنی اسی دلیل پر قائم رہو۔میں صرف مشورہ نہیں چاہتا۔میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم اس کے متعلق کیا کیا اعتراضات کر سکتی ہو اور میں ان کا معقول جواب دے سکتا ہوں یا نہیں؟ مجھے تو جو کچھ کام کرنا تھا کر چکا۔اب تم سے بحث کر کے اپنا اطمینان کرنا چاہتا ہوں۔

اندو: اگر میری زبان سے کوئی لفظ خلاف مزاج نکل جائے تو آپ ناراض تو نہ ہوں گے؟

راجہ صاحب: اس کی پروا نہ کرو۔قومی خدمت کا دوسرا نام بے حیائی ہے۔اگر ذرا ذرا سی بات پر ناراض ہونے لگیں تو ہمیں پاگل خانہ جانا پڑے۔

اندو: اگر ایک شخص کے ذاتی مفاد کے لیے آپ شہر کا نقصان نہیں کرنا چاہتے تو کیا سورداس ہی ایسا شخص ہے جس کے پاس دس بیگھے زمین ہو۔شہر میں ایسے لوگ بھی تو ہیں جن کے پاس اس سے کہیں زیادہ زمین ہے۔کتنے ہی ایسے بنگلے ہیں جن کا احاطہ دس بیگھے سے زیادہ ہے۔ہمارے بنگلہ کا احاطہ پندرہ بیگھے سے کم نہ ہوگا۔مسٹر سیوک کے بنگلہ کا بھی پانچ بیگھے سے کم نہیں ہے اور داداجی کا بنگلہ تو پورا ایک گاؤں ہی ہے۔آپ ان میں سے کہیں کی زمین اس کارخانہ کے لیے لے سکتے ہیں۔سورداس کی زمین تو محلّہ کے مویشی چرتے ہیں۔زیادہ نہیں تو ایک محلّہ کا فائدہ تو ہوتا

ہی ہے۔ ان احاطوں تو ایک تنہا شخص کے سوا کسی کا بھی کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ کوئی ان میں سیر بھی نہیں کر سکتا۔ ایک پھول یا پتی بھی نہیں توڑ سکتا۔ اگر کوئی جانور اندر چلا جائے تو اسے فوراً گولی ماردی جائے۔

راجہ صاحب: (مسکرا کر) واقعی دلیل بڑے معرکہ کی ہے۔ قائل ہو گیا۔ میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں، لیکن تمہیں شاید معلوم نہیں کہ تم اس اندھے جو جتنا بے بس و بے کس سمجھتی ہو اتنا نہیں ہے۔ سارا محلّہ اس کی حمایت پر آمادہ ہے۔ یہاں تک کہ لوگ مسٹر سیوک کے گماشتے کے گھر میں گھس گئے۔ ان کے بھائیوں کو مارا۔ آگ لگادی۔ عورتوں تک کی بے عزتی کی۔

اندو: میرے خیال میں ایسا ہونا اس بات کی ایک اور دلیل ہے کہ وہ زمین چھوڑ دی جائے۔ اس پر قبضہ کر لینے سے ایسے واقعات کم نہ ہوں گے۔ زیادہ ہی ہوں گے۔ مجھے تو اندیشہ ہے کہ کہیں خون خرابہ نہ ہو جائے۔

راجہ صاحب: جو لوگ عورتوں کی بے عزتی کی سکتے ہیں وہ کسی رعایت کے مستحق نہیں۔

اندو: جن لوگوں کی زمین آپ چھین لیں گے وہ آپ کے پاؤں نہ سہلائیں گے۔

راجہ صاحب: تعجب ہے کہ تم عورتوں کی بے حرمتی کو معمولی بات سمجھ رہی ہو۔

اندو: فوج کے گورے۔ ریل کے ملازمین روز ہی ہماری بہنوں کی بے حرمتی کرتے رہتے ہیں۔ ان سے تو کوئی نہیں بولتا۔ اس لیے کہ آپ ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔ اگر لوگوں نے جرم کیا ہے تو ان پر مقدمہ چلائیے۔ انہیں سزا دلائیے۔ ان کی جائیداد کیوں ضبط کرتے ہیں۔

راجہ صاحب: تم جانتی ہو۔ مسٹر سیوک کا یہاں کے حکام میں کتنا ربط ضبط ہے۔ مسٹر کلارک تو ان کے دروازہ کے دربان بنے ہوئے ہیں۔ اگر میں ان کی اتنی

خدمت نہ کرسکا تو حکام کا اعتبار مجھ پر سے اٹھ جائے گا۔

اندو: (متفکرانہ لہجہ میں) میں نہیں جانتی تھی کہ چیئرمین اس قدر مجبور و معذور ہوا کرتا ہے۔

راجہ صاحب: اب تو معلوم ہو گیا۔ بتلاؤ۔ اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟

اندو: عہدہ سے مستعفی ہو جانا۔

راجہ صاحب: میرے مستعفی ہو جانے سے زمین نہ بچ سکے گی۔

اندو: آپ تو دکھ پاپ سے بچ جائیں گے۔

راجہ صاحب: ایسی معمولی باتوں کے لیے استعفا دے دینا مضحکہ خیز ہے۔

اندو کو اپنے شوہر کے چیئرمینی پر بہت ناز تھا۔ اس عہدہ کو وہ نہایت اعلیٰ اور قابل احترام سمجھتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ یہاں راجہ صاحب کامل طور پر خود مختار ہیں۔ بورڈ ان کے تحت میں ہے۔ وہ جو چاہتے ہیں، کرتے ہیں۔ مگر اب معلوم ہوا کہ یہ محض اس کا خیال تھا۔ اس کا سارا غرور خاک میں مل گیا۔ اسے آج معلوم ہوا کہ چیئرمین صرف حکام کے ہاتھوں کا کھلونا ہے۔ ان کی مرضی جو چاہے کرے۔ ان کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ بمنزلہ صفر ہے۔ جس کی قیمت دوسرے عدد کے ساتھ ملنے ہی پر ہے۔ راجہ صاحب کی اس عہدہ پرستی سے اس کے دل پر کڑی چوٹ لگی۔ مضحکہ اتنا شرمناک نہیں ہے جتنا بے انصافی برتنا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ نے اس عہدہ کی مشکلات کو جانتے ہوئے بھی اسے کیوں قبول کیا؟ اگر آپ انصاف کے خیال سے سورداس کی زمین چھین لیتے تو مجھے آپ سے کوئی شکایت نہ ہوتی، لیکن صرف حکام کے خوف سے یا بدنامی سے بچنے کے لیے جادۂ انصاف سے منحرف ہونا نہایت اوچھی حرکت ہے۔ آپ کو اہل شہر اور خصوصاً غربا کے حقوق کی حفاظت کرنی چاہیے۔ اگر حکام کسی پر زیادتی کریں تو آپ کو مناسب ہے کہ مظلوموں کی مدد کریں۔ اپنے ذاتی نفع یا نقصان کا خیال نہ کر کے حکام کی مخالفت

کریں۔ سارے شہر میں بلکہ سارے ملک میں تہلکہ مچا دیں۔ خواہ اس کے لیے استعفیٰ ہی نہیں، کسی بڑی سے بڑی مصیبت کا سامنا کرنا پڑے۔ میں سیاسی اصولوں سے واقف نہیں ہوں، لیکن آپ کا جو انسانی فرض ہے، اسے بتلا رہی ہوں۔ میں آپ کو آگاہ کیے دیتی ہوں کہ اگر آپ نے حکام کے دباؤ سے سورداس کی زمین لے لی تو میں چپ چاپ نہ بیٹھی رہوں گی۔ عورت ہوں تو کیا۔ پر دکھا دوں گی کہ زیادہ سے زیادہ طاقتور انسان بھی کسی غریب کو آسانی سے پیروں تلے نہیں روند سکتا۔

یہ کہتے کہتے اندو رک گئی۔ اسے خیال آ گیا کہ میں جوش میں آ کر حد مناسب سے تجاوز کر رہی ہوں۔ راجہ صاحب اس قدر نادم ہوئے کہ کچھ کہنے کے لیے الفاظ نہ ملتے تھے۔ بالآخر ندامت سے بولے۔ ''تمہیں معلوم نہیں کہ قومی خدمت گزاروں کو کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر وہ اپنے فرائض کو بے خوفی سے ادا کرنے لگیں تو جتنی خدمت وہ اب کر سکتے ہیں اتنی بھی نہ کر سکیں۔ مسٹر کلارک اور مسٹر سیوک میں گہرا تعلق ہو جانے کے سبب حالات بالکل تبدیل ہو گئے ہیں۔ مس سیوک جس وقت سے تمہارے مکان سے گئی ہیں، مسٹر کلارک ہمیشہ انہی کے پاس بیٹھے رہتے ہیں۔ اجلاس پر نہیں جاتے۔ کوئی سرکاری کام نہیں کرتے۔ کسی سے ملتے تک نہیں۔ مس سیوک نے ان پر جادو سا ڈال دیا ہے۔ دونوں ساتھ ساتھ سیر کرنے جاتے ہیں اور ساتھ ساتھ تھیٹر دیکھنے جاتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ مس سیوک نے شادی کا وعدہ کر لیا ہے۔''

اندو: اس قدر جلد۔ ابھی اسے ہمارے یہاں سے گئے ایک ہفتہ سے زیادہ نہ ہوا۔''

راجہ صاحب: مسز سیوک نے سب کچھ پہلے ہی طے کر رکھا تھا۔ مس سیوک کے وہاں جاتے ہی عشق کی کارپردازیاں شروع ہو گئیں۔

اندو نے اب تک صوفیہ کو ایک معمولی عیسائی لڑکی سمجھ رکھا تھا۔ اگرچہ وہ ان سے

بہن کا سا برتاؤ کرتی تھی۔ اس کی قابلیت کی قدر کرتی۔ اس سے محبت کرتی تھی، لیکن دل میں اسے اپنے سے کمتر سمجھتی تھی مگر مسٹر کلارک سے اس کی شادی والی بات نے اس کے دلی جذبات کو محرک کر دیا۔ وہ سوچنے لگی۔ مسٹر کلارک سے عقد ہو جانے کے بعد جب صوفیہ مسز کلارک بن کر مجھے ملے گی تو اپنے دل میں مجھے ہیچ سمجھے گی۔ اس کے ارتباط، اخلاق اور الفاظ میں مصنوعی رواداری کی جھلک ہوگی۔ وہ میرے سامنے جتنا ہی جھکے گی، اتنا ہی میرا سر نیچا کرے گی۔ یہ ذلت مجھ سے برداشت نہ ہوگی۔ میں اس سے ہیچ بن کر نہیں رہ سکتی۔ اس کمبخت کلارک کو کیا کوئی یورپین لیڈی نہ ملتی تھی کہ صوفیہ پر گر پڑا۔ کسی ادنیٰ خاندان کا ہوگا۔ کوئی انگریز اس سے اپنی لڑکی کا عقد کرنے پر راضی نہ ہوتا ہوگا۔ و نے اس چھچھوری عورت پر جان دیتا ہے۔ ایشور ہی جانے اب اس غریب کی کیا حالت ہوگی۔ قحبہ ہے اور کیا۔ نسل اور خاندان کا اثر کہاں جائے گا۔ خوب صورت ہے۔ تعلیم یافتہ ہے۔ ہوشیار ہے۔ عقل مند ہے۔ سب کچھ سہی مگر ہے تو عیائن۔ باپ نے لوگوں کو ٹھگ ٹھگا کر کچھ روپیہ اور نام کما لیا ہے۔ اس سے کیا ہوتا ہے۔ میں تو اب بھی اس سے وہی پہلے کا سا برتاؤ کروں گی۔ جب تک وہ خود آگے نہ بڑھے گی ہاتھ نہ بڑھاؤں گی، لیکن میں خواہ کچھ بھی کروں، اس پر اپنی فوقیت کا خواہ کتنا ہی اظہار کروں، اس کے دل میں اس بات کا گھمنڈ تو ضرور ہی ہوگا کہ میری ایک کڑی نگاہ اس کے شوہر کے اعزاز و اقتدار کو خاک میں ملا سکتی ہے۔ ممکن ہے وہ اب اور بھی زیادہ انکسار سے پیش آئے۔ اپنی طاقت کا احساس ہم کو مہذب بنا دیتا ہے۔ اس سے میرا غرور کرنا اور کھنچا دل لگی معلوم ہوگی۔ اس وقت دیکھنے والے اس کو اپنے دل میں ملامت کریں گے۔ اسی میں میری لاج رہ سکتی ہے مگر وہ اتنی کوتاہ اندیش کب ہے۔

بالآخر اندو نے طے کر لیا کہ میں صوفیہ سے ملوں گی ہی نہیں۔ میں اپنے رانی ہونے کا گھمنڈ تو اس سے کر ہی نہیں سکتی۔ ہاں ایک خادم قوم کی بیوی بن کر اپنی

خاندانی شرافت کا غرور دکھا کر اس سے بے اعتنائی کا برتاؤ کر سکتی ہوں۔

یہ سب خیالات ایک لمحہ میں اندو کے دل میں آ گئے۔ بولی۔ ''میں آپ کو کبھی دبنے کی صلاح نہ دوں گی۔''

راجہ صاحب: اروا گر دبنا پڑے۔

اندو: تو اپنے کو بھاگنی سمجھوں گی۔

راجہ صاحب: یہاں تک تو کوئی ہرج نہیں مگر کوئی تحریک تو نہ شروع کرو گی۔ اس لیے پوچھتا ہوں کہ تم نے ابھی مجھے دھمکی دی ہے۔

اندو: میں خاموش نہ بیٹھوں گی۔ آپ دبیں۔ میں کیوں دبوں؟

راجہ صاحب: خواہ میری کتنی ہی بدنامی ہو جائے؟

اندو: میں اسے بدنامی نہیں سمجھتی۔

راجہ صاحب: پھر سوچ لو۔ یہ طے شدہ امر ہے کہ وہ زمین مسٹر سیوک کو ضرور ملے گی۔ میں روکنا بھی چاہوں تو نہیں روک سکتا اور یہ بھی طے شدہ امر ہے کہ تمہیں اس معاملہ میں خاموش ہی رہنا پڑے گا۔

راجہ صاحب اپنی پبلک لائف (عوام سے تعلق رکھنے والی زندگی) میں تحمل اور حسن اخلاق کے لیے مشہور تھے لیکن خانگی زندگی مین وہ اتنے رحم دل نہ تھے۔ اندو کا چہرہ تمتما اٹھا۔ وہ تیز لہجہ میں بولی۔ ''اگر آپ کو اپنا اعزاز پیارا ہے تو مجھے بھی اپنا دھرم پیارا ہے۔''

راجہ صاحب غصہ کے مارے وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔ اندو تنہا رہ گئی۔

ایک ہفتہ تک دونوں کی زبانوں پر مہر سکوت لگی رہی۔ راجہ صاحب کبھی گھر میں آ جاتے تو دو چار باتیں کر کے یوں بھاگتے جیسے پانی میں بھیگ رہے ہوں۔ نہ وہ بیٹھتے ار نہ اندو انہیں بیٹھنے کو کہتی۔ انہیں یہ رنج تھا کہ اس کو میری ذرا بھی پروا نہیں ہے۔ قدم قدم پر میرا راستہ روکتی ہے۔ میں استعفیٰ دے دوں جبھی اس کو تسکین ہو گی۔ اس

کی یہی تمنا ہے کہ ہمیشہ کے لیے دنیا سے منہ موڑ لوں۔ سنسار سے قطع تعلق کروں اور گھر میں بیٹھا ہوا رام نام جپوں۔ حکام سے ملنا چھوڑ دوں۔ ان کی نظروں سے گر جاؤں اور ذلت برداشت کروں۔ میری زندگی کی ساری تمنائیں اور میرے سارے منصوبے اس کی نگاہوں میں ہیچ ہیں۔ وہ دل میں میری نمود طلبی کی خواہش پر ہنستی ہے۔ شاید مجھے کم ظرف، خود غرض اور خود پسند سمجھتی ہے۔ اتنے دنوں تک میرے ساتھ رہ کر بھی اس کو مجھ سے کچھ محبت نہیں۔ کوئی میل نہیں۔ زوجہ اپنے خاوند کی بہی خواہ ہوتی ہے۔ یہ نہیں کہ اس کے کاموں کا مضحکہ اڑائے۔ اس کی بدگوئی کرے۔ اس نے صاف کہہ دیا ہے کہ میں خاموش نہ بیٹھوں گی۔ نہ جانے کیا کرنے کا ارادہ ہے۔ اگر اخباروں میں ایک چھوٹا سا خط بھی چھپوائے گی تو میرا کام تمام ہو جائے گا۔ کہیں کا نہ رہوں گا۔ ڈوب مرنے کا موقع ہوگا۔ دیکھوں یہ ناؤ کیسے پار لگتی ہے۔

ادھر اندو کو افسوس تھا کہ ایشور نے انہیں سب کچھ دیا ہے۔ یہ حکام سے کیوں اتنا دبتے ہیں۔ کیوں اتنی خوشامد کرتے ہیں۔ اپنے اصولوں پر قائم کیوں نہیں رہتے۔ انہیں کیوں خود غرضی کے تحت میں رکھتے ہیں۔ قومی خدمت کا سوانگ کیوں بھرتے ہیں؟ وہ بھی کوئی انسان ہے جس نے نام و نمود کے لیے ایمان اور انصاف کا خون کر دیا ہو۔ ایک وہ بہادر لوگ تھے جو بادشاہوں کے سامنے سر نہ جھکاتے تھے۔ اپنی بات اپنی آن پر مر مٹتے تھے۔ آخر لوگ انہیں کیا کہتے ہوں گے؟ دنیا کو دھوکا دینا سہل ہے۔ انہیں چاہے یہ وہم ہو کہ لوگ مجھے قوم کا سچا خادم سمجھتے ہیں۔ لیکن واقعی بات تو یہ ہے کہ انہیں سبھی لوگ خوب پہچانتے ہیں۔ دل میں سبھی کہتے ہوں گے کتنا بنا ہوا آدمی ہے۔

رفتہ رفتہ اس کے خیالات میں تغیر ہوا۔ یہ ان کا قصور نہیں، میرا قصور ہے۔ میں کیوں ان کا اپنے معیار کے مطابق بنانا چاہتی ہوں؟ آج کل زیادہ تر آدمی اسی قماش کے ہیں۔ انہیں دنیا چاہے کچھ کہے۔ کچھ سمجھے۔ مگر ان کے گھروں میں تو کوئی

مین میکھ نہیں نکالتا۔ بیوی کا فرض ہے کہ شوہر کی رفیق بنے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا عورت کی مرد سے الگ کوئی ذاتی ہستی نہیں ہے؟ اسے تو عقل سلیم قبول نہیں کرتی۔ دونوں اپنے اپنے اعمال کے موافق سزا و جزا کے مستحق ہوتے ہیں۔ دراصل یہ ہماری قسمت کا قصور ہے، ورنہ ہمارے خیالات میں اتنا فرق کیوں ہوتا؟ کتنا چاہتی ہوں کہ آپس میں کوئی نا اتفاقی نہ ہو۔ کتنا پہلو بچاتی ہوں، پر آئے دن کوئی نہ کوئی بدمزگی پیدا ہو ہی جاتی ہے۔ ابھی ایک زخم نہیں بھرنے پایا تھا کہ دوسرا چرکا لگا۔ کیا میری ساری زندگی یوں ہی گزرے گی؟ ہم زندگی میں سکون چاہتے ہیں۔ محبت اور دوستی کے لیے جان دیتے ہیں۔ جس کے سر پر ہمیشہ ننگی تلوار لٹکتی ہو، اسے سکون کہاں۔ اندھیر تو یہ ہے کہ مجھے چپ بھی نہیں رہنے دیا جاتا۔ کتنا کہتی تھی کہ مجھے اس بحث میں نہ ڈالیے۔ ان کانٹوں میں نہ گھسیٹیے مگر انہوں نے نہ مانا۔ اب جو میرے پیروں میں کانٹے چبھ گئے۔ میں درد سے کراہتی ہوں تو کانوں پر انگلی رکھتے ہیں۔ مجھے رونے کی بھی آزادی نہیں ''جبراً سارے اور رونے نہ دے'' والی مثال ہے۔ ایک ہفتہ ہو گیا۔ بات بھی نہ پوچھی کہ مرتی ہے یا جیتی۔ بالکل اسی طرح پڑی ہوں جیسے کسی سرائے میں۔ اس سے تو کہیں اچھا تھا کہ مر جاتی۔ سکھ گیا۔ آرام گیا۔ پلے کی اپڑا۔ رونا اور جھیکنا! جب یہی حال ہے تو کب نبھے گی۔ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ دونوں کے دل ایک دوسرے سے پھر جائیں گے۔ کوئی کسی کی صورت بھی نہ دیکھنا چاہے گا۔

شام ہو گئی تھی۔ اندو کا دل بہت گھبرا رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ ذرا اماں کے پاس چلوں کہ یکایک راجہ صاحب آ کر کھڑے ہو گئے۔ چہرہ سے وحشت برس رہی تھی جیسے گھر میں آگ لگی ہوئی ہو۔ گھبرائی ہوئی آواز میں بولے۔ ''اندو مسٹر کلارک ملنے آئے ہیں۔ ضرور اسی زمین کے متعلق کچھ گفتگو کریں گے۔ اب مجھے کیا صلاح دیتی ہو؟ میں ایک کاغذ لانے کا بہانہ کر کے چلا آیا ہوں۔''

یہ کہہ کر انہوں نے دکھ بھری نگاہوں سے اندو کی طرف دیکھا۔ گویا ساری دنیا کی مصیبت انہی کے سر آ پڑی ہو۔ گویا کوئی دہقانی پولیس کے پنجہ میں پھنس گیا ہو۔ ذرا دم لے کر پھر بولے۔ ''اگر میں نے ان کی مخالفت کی تو مشکل میں پڑ جاؤں گا۔ تمہیں معلوم نہیں کہ ان انگریز حکام کو کتنے اختیارات ہوتے ہیں۔ یوں چاہوں تو اسے نوکر رکھ لوں مگر اس کی ایک شکایت پر میری ساری آبرو پر پانی پھر جائے گا۔ حکام بالا دست اس کے خلاف میری ایک بھی نہ سنیں گے۔ رئیسوں کو اتنی آزادی بھی نہیں جو ایک معمولی کسان کو ہے۔ ہم سب ان کے ہاتھوں کے کھلونے ہیں۔ جب چاہیں زمین پر پٹک کر چکنا چور کر دیں۔ میں اس کی بات ٹال نہیں سکتا۔ مجھ پر رحم کرو۔''

اندو نے ترحمانہ انداز سے دیکھ کر کہا۔ ''مجھے آپ کیا کرنے کو کہتے ہیں؟''

راجہ صاحب: یہی کہ یا تو خاموش رہ کر اس بے انصافی اور ستم کوشی کا تماشا دیکھو یا مجھے اپنے ہاتھوں سے تھوڑا سا سنکھیا کھلا دو۔

راجہ صاحب کی اس بزدلی اور مجبوری پر ان کے خوف زدہ چہرہ اور قابل رحم عاجزی و التجا پر اندو کو رحم آ گیا۔ اس رحم میں ہمدردی یا خاطر داری نہ تھی۔ یہ وہ رحم تھا جو بھکاری کو دیکھ کر کسی فیاض طبع انسان کے دل میں پیدا ہو جاتا ہے۔ سوچنے لگی، ہائے اس خوف کا بھی کوئی ٹھکانا ہے۔ بچے ہوا سے بھی اتنا نہ ڈرتے ہوں گے۔ مان لیا کلارک ناراض ہی ہو گیا تو کیا کرے گا۔ عہدہ سے برطرف نہیں کر سکتا، یہ اس کے اختیار سے باہر ہے۔ ریاست ضبط نہیں کر سکتا۔ واویلا مچ جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ اتنا کر سکتا ہے کہ افسروں سے شکایت کر دے، لیکن اس وقت ان سے بحث کرنا بے فائدہ ہے۔

راجہ صاحب چپکے سے اٹھے اور چلے گئے۔ اسی طرح جیسے کوئی غرض سے باؤلا اسامی مہاجن کے انکار سے مایوس ہو کر اٹھے۔ اندو کی تشفی سے انہیں اطمینان نہ ہوا۔

سوچنے لگے کہ میں اس کی نظروں میں گر گیا۔ میں بدنامی سے اس قدر ڈرتا تھا مگر اب گھر ہی میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہا۔

بولی۔ ''اگر آپ سمجھتے ہیں کہ کلارک سے بحث کرنا میرے لیے مناسب نہیں تو میں خاموش رہوں گی اور آپ کے کام میں دخل اندازی نہ کروں گی۔''

راجہ صاحب کے جاتے ہی اندو نے ایک لمبی سانس لی اور فرش پر لیٹ گئی۔ اس کے منہ سے یکا یک یہ الفاظ نکلے۔ ''ان کی دل سے کیسے عزت کروں؟ انہیں اپنا دیوتا کیسے سمجھوں؟ معلوم نہیں۔ اس ناعقیدت مندی کی مجھے کیا سزا ملے گی۔ میں اپنے شوہر کی پرستش کرنا چاہتی ہوں۔ مگر دل پر میرا قابو نہیں۔ بھگوان! تم مجھے اس کڑی آزمائش میں کیوں ڈال رہے ہو؟''

(16)

اراولی کی پہاڑیوں میں ایک برگد کے درخت کے نیچے ونے سنگھ بیٹھے ہوئے ہیں۔ برسات نے اس سنسان، سخت، خشک اور پتھریلے علاقے میں رونق پیدا کر دی ہے مگر ونے کی نگاہ میں اس قدرتی حسن کی طرف نہیں ہے۔ ان کے دل میں ہر وقت ایک کشمکش قائم رہتی ہے۔ قومی خدمت ان کا مقصد تھا۔ محبت کے کانٹے اس میں رکاوٹ پیدا کر رہے تھے۔ وہ ہر وقت اس مقصد کے آڑے آتے تھے۔ کبھی کبھی وہ درد دل سے بے قرار ہو کر سوچتے ہیں۔ صوفی نے مجھے اس آتش کدہ سے کیوں نکالا؟ بیرونی آگ صرف جسم کو فنا کرتی ہے جو خود ہی فانی ہے مگر اندرونی آگ روح کو خاک سیاہ کر دیتی ہے۔

ونے کو یہاں آئے کئی مہینے ہو گئے مگر ان کی دل کی بے چینی وقت کے ساتھ ہی بڑھتی جاتی ہے۔ وہ غیرت کے سبب آنے کو تو یہاں آ گئے تھے مگر ایک ایک لمحہ ایک ایک مدت کی طرح گزر رہا تھا۔ پہلے انھوں نے یہاں کی تکالیف کی طولانی داستانیں لکھ لکھ کر اپنی ماں کے پاس بھیجیں۔ انہیں یقین تھا کہ اماں جی مجھے بلا لیں

گی مگر وہ مقصد پورا نہ ہوا۔ اتنے ہی میں صوفیہ کا خط مل گیا جس نے ان کے صبر کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو ایک دم ٹھنڈا کر دیا۔ اب ان کے چاروں طرف اندھیرا تھا۔ وہ اس اندھیرے میں چاروں طرف ٹٹولتے پھرتے تھے مگر راستہ نہ ملتا تھا۔ اب ان کی زندگی کا کوئی نصب العین نہیں ہے۔ کوئی مقررہ راستہ نہیں ہے۔ وہ بے ملاح کی ناؤ تھے جسے صرف امواج کے رحم کا بھروسہ ہو۔

لیکن اس تفکر اور تشویش کی حالت میں بھی وہ حتی الامکان اپنے فرض کو ادا کرتے جاتے ہیں۔ جسونت نگر کے علاقہ میں ایک بچہ بھی نہیں ہے جو انہیں نہ پہچانتا ہو۔ دیہات کے لوگ ان کے اتنے معتقد ہو گئے ہیں کہ جوں ہی وہ کسی گاؤں میں جا پہنچتے ہیں، سارا گاؤں ان کی زیارت کے لیے جمع ہو جاتا ہے۔ انہوں نے ان کو اپنی مدد آپ کرنا سکھایا ہے۔ اس علاقہ کے لوگ اب جنگلی جانوروں کو بھگانے کے لیے پولیس کے پاس نہیں دوڑے جاتے بلکہ خود جمع ہو کر انہیں بھگاتے ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر عدالتوں کے دروازے نہیں کھٹکھٹائے جاتے۔ پنچائتوں میں تصفیہ کر لیتے ہیں۔ جہاں کبھی کنوئیں نہ تھے، وہاں اب پختہ کنوئیں تیار ہو گئے ہیں۔ صفائی کی طرف بھی لوگ دھیان دینے لگے ہیں۔ دروازوں پر کوڑا کرکٹ کے ڈھیر نہیں جمع کیے جاتے۔ خلاصہ یہ کہ ہر شخص صرف اپنے لیے نہیں بلکہ دوسروں کے لیے بھی ہے۔ وہ اب اپنے مخالفین سے گھرا ہوا نہیں بلکہ معاونین سے گھرا ہوا سمجھتا ہے۔ اجتماعی زندگی کا پھر احساس پیدا ہو گیا ہے۔

ونے سنگھ کو طبابت میں بھی کافی دخل ہے۔ ان کے ہاتھوں سینکڑوں مریض صحت یاب ہو چکے ہیں۔ کتنے ہی گھر جو باہمی نزاع سے بگڑ گئے تھے پھر آباد ہو گئے ہیں۔ ایسی حالت میں ان کی جتنی خاطر و مدارت کرنے کے لیے لوگ تیار رہتے ہیں، ان کا قیاس کر لینا مشکل نہیں۔ دوسروں کی خدمت کرنے والوں کے نصیبوں میں آرام کہاں۔ ونے کو خشک روٹیوں اور درخت کے سایہ کے علاوہ اور کسی چیز سے سروکار

نہیں ہے۔ اس فقر و استغناء نے انہیں اس نواح میں نہایت ممتاز اور ہر دلعزیز بنا دیا ہے۔

لیکن جوں جوں ان سے رعایا کی عقیدت ہوتی جاتی ہے، اسی نسبت سے ریاست کے حکام ان سے بدگمان ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کے خیال میں رعایا روز بروز سرکش ہوتی جاتی ہے۔ داروغہ جی مٹھیاں اب گرم نہیں ہوتیں۔ کامدار اور دیگر حاکموں کے یہاں مقدمے نہیں جاتے۔ کچھ ہتھے نہیں چڑھتا۔ رعایا میں یہ آثار بغاوت نہیں تو اور کیا ہیں۔ یہی بغاوت کے ننھے پودے ہیں۔ انہیں اکھاڑ دینے ہی میں بہتری ہے۔

جسونت نگر سے روزانہ دربار کوئی نئی اطلاعیں کچھ اصلی کچھ فرضی بھیجی جاتی تھیں اور ونے سنگھ کو ضابطہ کے شکنجہ میں جکڑنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ دربار نے ان اطلاعوں سے بدظن ہو کر کئی جاسوسوں کو ونے سنگھ کی حرکات و سکنات کی دیکھ بھال کے لیے تعینات کر دیا ہے مگر ان کی بے لوث خدمات کسی کو گرفت کا موقع نہیں دیتیں۔

ونے کے پیروں میں بوائیاں پھٹی ہوئی تھیں۔ چلنے میں تکلیف ہوتی تھی۔ برگد کے نیچے ٹھنڈی ہوا لگی تو بیٹھے بیٹھے سو گئے آنکھ کھلی تو دوپہر ڈھل چکی تھی۔ فوراً اٹھ بیٹھے، لکڑی سنبھالی اور آگے بڑھے۔ آج انہوں نے جسونت نگر میں مقام کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ دن بھاگا چلا جاتا تھا۔ سہ پہر کے بعد سورج کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ شام ہوتی جاتی تھی اور ابھی جسونت نگر کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ادھر بوائیوں کے سبب ایک ایک قدم چلنا دوبھر تھے۔ حیران تھے کہ کیا کروں۔ کسی کسان کا جھونپڑا بھی نظر نہ آتا تھا کہ وہیں رات کاٹیں۔ پہاڑوں میں سر شام ہی سے جنگلی جانوروں کی آوازیں سنائی دینے لگتی ہیں۔ اسی حیص بیص میں پڑے ہوئے تھے کہ دفعتاً انہیں دور سے ایک آدمی آتا ہوا نظر پڑا۔ اسے دیکھ کر وہ اتنا خوش ہوئے کہ اپنی راہ چھوڑ کر کئی قدم اس کی طرف چلے۔ نزدیک آنے پر معلوم ہوا کہ ڈاکیہ ہے۔ وہ ونے سنگھ کو

پہچانتا تھا۔ سلام کر کے بولا۔ ''اس چال سے تو آدھی رات تک بھی جسونت نگر نہ پہنچیں گے۔''

ونے: پیروں میں بوائیاں پھٹ گئی ہیں۔ چلنا مشکل ہے۔ تم خوب ملے۔ میں بہت گھبرا رہا تھا کہ تنہا کیسے جاؤں گا..... اب ایک سے دو ہو گئے کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ میرا بھی کوئی خط ہے؟

ڈاکیہ نے ونے سنگھ کے ہاتھ پر ایک خط رکھ دیا۔ رانی صاحبہ کا خط تھا۔ اگرچہ اندھیرا ہو رہا تھا مگر ونے سنگھ نے فرط اشتیاق سے فوراً لفافہ چاک کیا اور خط پڑھنے لگے۔ ایک لمحہ میں انہوں نے اس کو پڑھ ڈالا اور پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر لفافہ میں رکھ دیا۔ ان کے سر میں ایسا چکر آیا کہ گرتے گرتے بچے۔ زمین پر بیٹھ گئے۔ ڈاکیہ نے گھبرا کر پوچھا۔ ''کیا کوئی بری خبر ہے؟ آپ کا منہ پیلا پڑ گیا ہے۔''

ونے سنگھ: نہیں۔ کوئی ایسی خبر نہیں۔ پیروں میں درد ہو رہا ہے۔ شاید میں آگے نہ جا سکوں گا۔

ڈاکیہ: یہاں اس ابھیڑ میں اکیلے کیسے پڑے رہیے گا؟

ونے سنگھ: ڈر کیا ہے؟

ڈاکیہ: ادھر جانور بہت ہیں۔ ابھی کل ایک گائے اٹھا لے گئے۔

ونے سنگھ: مجھے جانور بھی نہ پوچھیں گے۔ تم جاؤ مجھے یہیں چھوڑ دو۔

ڈاکیہ: یہ نہیں ہو سکتا۔ میں بھی یہیں پڑا رہوں گا۔

ونے سنگھ: تم میرے لیے کیوں اپنی جان خطرہ میں ڈالتے ہو؟ چلے جاؤ۔ گھڑی رات گئے تک پہنچ جاؤ گے۔

ڈاکیہ: میں تو جبھی جاؤں گا جب آپ بھی چلیں گے۔ میری جان کی کون حقیقت ہے۔ اپنا پیٹ پالنے کے سوا اور کیا کرتا ہوں۔ آپ کے دم سے تو ہزاروں کا بھلا ہوتا ہے۔ جب آپ کو فکر نہیں ہے تو مجھے اپنی کیا فکر ہے۔

ونے سنگھ: بھائی میں تو مجبور ہوں۔ چلا ہی نہیں جاتا۔

ڈاکیہ: میں آپ کو کندھے پر بٹھا کر لے چلوں گا۔ پر یہاں نہ چھوڑوں گا۔

ونے سنگھ: بھائی! تم بہت دق کر رہے ہو۔ چلو مگر میں آہستہ آہستہ چلوں گا۔ تم نہ ہوتے تو آج میں یہیں پڑ رہتا۔

ڈاکیہ: آپ نہ ہوتے تو میری جان کی خیریت نہ تھی۔ یہ نہ سمجھئے کہ میں صرف آپ کی خاطر اتنی ضد کر رہا ہوں۔ میں اتنا دھرماتما نہیں ہوں۔ اپنی حفاظت کے لیے آپ کو ساتھ لیے چلتا ہوں۔ (آہستہ سے) اس وقت میرے پاس ڈھائی سو روپے ہیں۔ دوپہر کو ایک جگہ سو گیا۔ بس دیر ہو گئی۔ آپ میرے بھاگ سے مل گئے نہیں تو ڈاکوؤں سے جان نہ بچتی۔

ونے سنگھ: یہ تو بڑے جوکھم کی بات ہے۔ تمہارے پاس کوئی ہتھیار ہے؟

ڈاکیہ: میرے ہتھیار آپ ہیں۔ آپ کے ساتھ مجھے کوئی کھٹکا نہیں ہے۔ آپ کو دیکھ کر کسی ڈاکو کی مجال نہیں کہ مجھ پر ہاتھ اٹھا سکے۔ آپ نے ڈکیتوں کو بھی بس میں کر لیا ہے۔

دفعتاً گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز کان میں آئی۔ ڈاکیہ نے گھبرا کر پیچھے دیکھا۔ پانچ سوار بھالے اٹھائے گھوڑے بڑھائے چلے آتے تھے۔ اس کے ہوش اڑ گئے۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ بولا۔ ''لیجیے سب آ ہی پہنچے۔ ان سب کے مارے ادھر راستہ چلنا مشکل ہو گیا ہے۔ بڑے خونی ہیں۔ سرکاری ملازموں کو تو چھوڑنا ہی نہیں جانتے۔ اب آپ ہی بچائیں تو میری جان بچ سکتی ہے۔''

اتنے میں پانچوں سوار سر پر آ پہنچے۔ ان میں ایک نے پکارا۔ ''اے ڈاکیے! ادھر آ۔ تیرے تھیلے میں کیا ہے؟''

ونے سنگھ زمین پر بیٹھے ہوئے تھے لکڑی کے سہارے اٹھے کہ اتنے میں ایک سوار نے ڈاکیہ پر بھالے کا وار کیا۔ ڈاکیہ فوج میں رہ چکا تھا۔ اس نے وار کو تھیلے پر روکا۔

بھالا تھیلے کے پار ہو گیا۔ وہ دوسرا وار کرنے ہی والا تھا کہ ونے سنگھ سامنے آ کر بولے۔ ''بھائیو! یہ کیا اندھیر کرتے ہو؟ کیا تھوڑے سے روپیوں کے لیے ایک غریب کی جان لے لو گے؟''

سوار: جان اتنی پیاری ہے تو روپے کیوں نہیں دیتا؟

ونے سنگھ: جان بھی پیاری ہے اور روپے بھی پیارے ہیں۔ دو میں سے ایک بھی نہیں دے سکتا۔

سوار: تو دونوں ہی دینے پڑیں گے۔

ونے سنگھ: تو پہلے میرا کام تمام کر دو۔ جب تک میں زندہ ہوں تمہارا مقصد نہ پورا ہو گا۔

سوار: ہم سادھوؤں پر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔ سامنے سے ہٹ جاؤ۔

ونے سنگھ: جب تک میری ہڈیاں تمہارے گھوڑوں کے پیروں تلے نہ روندی جائیں گی۔ میں سامنے سے نہیں ہٹوں گا۔

سوار: ہم کہتے ہیں سامنے سے ہٹ جاؤ۔ کیوں ہمارے سر ہتیا (خون ناحق) کا پاپ لگاتے ہو؟

ونے سنگھ: میرا جو دھرم ہے وہ میں کرتا ہوں۔ تمہارا جو دھرم ہو وہ تم کرو۔ گردن جھکائے ہوئے ہیں۔

دوسرا سوار: تم کون ہو؟

تیسرا سوار: بیدھا ہوا ہے۔ مار دو ایک ہاتھ گر پڑے۔ پرائسچت (کفارہ) کر لیں گے۔

پہلا سوار: آخر تم ہو کون؟

ونے سنگھ: میں کوئی ہوں تمہیں اس سے مطلب؟

دوسرا سوار: تم تو ادھر کے رہنے والے نہیں جان پڑتے۔ کیوں بے ڈاکیے! یہ کون

ہے؟

ڈاکیہ: یہ تو نہیں جانتا پر ان کا نام ونے سنگھ ہے۔ دھرماتما اور پراپکاری آدمی ہیں۔ اس علاقہ میں کئی مہینوں سے ٹھہرے ہوئے ہیں۔

ونے سنگھ کا نام سنتے ہی پانچوں سوار گھوڑوں پر سے کود پڑے اور ونے کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ سردار نے کہا۔ ''مہاراج ہمارا اپرادھ چھما کیجیے۔ ہم نے آپ کا نام سنا ہے۔ آج آپ کا درشن پا کر ہمارا جینا سپھل ہو گیا۔ اس علاقہ میں آپ کا جس گھر گھر گایا جا رہا ہے۔ میرا لڑکا گھوڑے سے گر پڑا تھا۔ پسلی کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ جینے کی کوئی امید نہ تھی۔ آپ ہی کے ساتھ کے ایک مہاراج ہیں اندر دت۔ انہوں نے آ کر لڑکے کو دیکھا تو فوراً مرہم پٹی کی اور مہینہ تک روز آ کر اس کی دوا دارو کرتے رہے۔ لڑکا چنگا ہو گیا۔ ہم تو جان بھی دے دوں تو آپ کی ارن نہیں ہو سکتا۔ اب ہم پاپیوں کا اودھار کیجیے۔ ہمیں آگیا دیجیے کہ آپ کے چرنوں کی دھول ماتھے پر لگائیں۔ ہم تو اس لائق بھی نہیں ہیں۔''

ونے نے مسکرا کر کہا۔ ''اب تو ڈاکیے کی جان نہ لوگے؟ ہمیں تم سے ڈر لگتا ہے۔''

سردار: مہاراج! ہمیں شرمندہ نہ کیجیے۔ ہمارا قصور معاف کیجیے۔ ڈاکیہ جی تم آج کسی اچھے کا منہ دیکھ کر اٹھے ہو، نہیں تو اب تک تمہاری جان نکل گئی ہوتی۔ میرا نام سنا ہے نا؟ بیر پال سنگھ میں ہی ہوں جس نے راج کے نوکروں کو نیست و نابود کر دینے کی قسم کھائی ہے۔

ونے سنگھ: راج کے نوکروں پر اتنا ظلم کیوں کرتے ہو؟

بیر پال: مہاراج! آپ کئی مہینوں سے اس علاقہ میں ہیں۔ کیا آپ کو ان لوگوں کی کرتوتیں معلوم نہیں ہیں؟ یہ لوگ رعایا کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں۔ ان میں نہ دیا ہے نہ دھرم۔ ہیں ہمارے ہی بھائی بند، پر ہماری ہی گردن پر چھری چلاتے ہیں۔ کسی نے ذرا صاف کپڑے پہنے اور یہ لوگ اس کے سر ہوئے۔ جسے رشوت نہ

دیجیے وہی آپ کا دشمن ہے۔ چوری کیجیے، ڈاکے ڈالیے، گھروں میں آگ لگائیے، غریبوں کا گلا کاٹیے، کوئی نہ بولے گا۔ بس سرکاری نوکروں کی مٹھیاں گرم کرتے رہیے۔ دن دہاڑے خون کیجیے پر پولیس کی پوجا کر دیجیے۔ آپ بیداغ چھوٹ جائیں گے اور آپ کے بدلے کوئی بے قصور پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔ کوئی فریاد نہیں سنتا، کون سنے، سبھی ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ یہی سمجھ لیجیے کہ خونخوار جانوروں کا ایک غول ہے۔ سب کے سب مل کر شکار کرتے ہیں اور پھر مل جل کر کھاتے ہیں۔ راجہ ہے وہ کاٹھ کا الو۔ اسے ولایت میں جا کر علماء کے سامنے لمبی چوڑی تقریریں کرنے کا خبط ہے۔ میں نے یہ کیا، میں نے وہ کیا۔ بس کوری ڈینگیں مارنا ان کا کام ہے۔ یا تو ولایت کی سیر کرے گا یا وہاں انگریزوں کے ساتھ شکار کھیلے گا۔ سارے دن انہی کی جوتیاں سیدھی کرے گا۔ اس کے سوا اسے کوئی کام نہیں۔ رعایا مرے یا جیے اس کی بلا سے۔ بس خیریت اسی میں ہے کہ عملے جس کل بٹھائیں اسی کل بیٹھیے۔ شکایت نہ کیجیے، زبان نہ ہلائیے، روئیے تو منہ بند کر کے۔ ہم نے مجبور ہو کر اس خونیں راستہ پر قدم رکھا ہے۔ کسی طرح تو ان بدمعاشوں کی آنکھیں کھلیں۔ انہیں معلوم ہو کہ ہمیں بھی سزا دینے والا کوئی ہے۔ یہ حیوان سے انسان بن جائے۔

ونے سنگھ: مجھے یہاں کے حالات سے کچھ تو واقفیت تھی مگر یہ معلوم نہ تھا کہ اتنی بری حالت ہے۔ میں اب خود راجہ صاحب سے ملوں گا اور یہ ساری باتیں ان سے کہوں گا۔

بیرپال: مہاراج کہیں ایسی غلطی بھی نہ کیجیے گا، نہیں تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ یہ اندھیر نگری ہے۔ راجہ میں اتنا ہی گیان ہوتا تو راج کی یہ حالت کیوں ہوتی۔ وہ الٹا آپ کے سر جائے گا۔

ونے سنگھ: اس کی فکر نہیں۔ اطمینان تو ہو جائے گا کہ میں نے اپنا فرض ادا کیا۔ مجھے تم سے بھی کچھ کہنا ہے۔ تمہارا یہ خیال کہ اس قتل و غارت گری سے حکام میں رعایا

پوری آجائے گی، میرے رائے میں محض بے بنیاد اور صرف وہم ہے۔ مرض کو دور کرنے کے لیے مریض ہی کو ختم کر دینا نہ تو قرین مصلحت ہے اور نہ قرین انصاف۔ آگ آگ سے ٹھنڈی نہیں ہوتی۔ پانی سے ٹھنڈی ہوتی ہے۔

بیر پال: مہاراج! ہم آپ سے بحث تو نہیں کر سکتے مگر اتنا جانتے ہیں کہ زہر کا اثر زہر ہی سے زائل ہوتا ہے۔ جب انسان برائی کے انتہائی درجہ پر پہنچ جاتا ہے۔ جب اس میں دیا اور دھرم کا نشان نہیں رہ جاتا۔ جب اس کی انسانیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ جب وہ حیوانیت کے کام کرنے لگتا ہے۔ جب اس میں روحانیت کی روشنی دھندلی پڑ جاتی ہے۔ تب اس کے لیے صرف ایک ہی تدبیر باقی رہ جاتی ہے اور وہ ہے سزائے موت۔ شیر جیسا خونخوار درندہ خدمت سے تابع ہو سکتا ہے مگر خود غرضی کو کوئی خدائی طاقت نہیں مٹا سکتی۔

ونے سنگھ: ایسی طاقت ہے تو۔ ہاں اس کا مناسب استعمال ضروری ہے۔

ونے سنگھ نے ابھی بات بھی پوری نہ کی تھی کہ دفعتاً کسی طرف سے بندوق کی آواز کانوں میں آئی۔ سواروں نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ایک طرف گھوڑے چھوڑ دیئے۔ دم کے دم میں گھوڑے پہاڑوں میں جا کر غائب ہو گئے۔ ونے کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ بندوق کی آواز کہاں سے آئی اور پانچوں سوار کیوں بھاگے؟ ڈاکیے سے پوچھا۔ ”یہ سب کدھر کو جا رہے ہیں۔“

ڈاکیہ: بندوق کی آواز نے کسی شکاری کی خبر دی ہوگی، اسی طرف گئے ہیں۔ آج کسی سرکاری نوکر کی جان پر ضرور بنے گی۔

ونے سنگھ: اگر یہاں کے سرکاری ملازموں کی یہی کیفیت ہے جیسا کہ انھوں نے بیان کیا تو مجھے بہت جلد مہاراج کی خدمت میں جانا پڑے گا۔

ڈاکیہ: مہاراج۔ اب آپ سے کیا پردہ ہے۔ سچ مچ یہی حال ہے۔ ہم لوگ تو ٹکے کے ملازم ٹھہرے۔ چار پیسے اوپر سے نہ کمائیں تو بال بچوں کو کیسے پالیں۔ تنخواہ

ہے سو سال بھر نہیں ملتی لیکن یہاں تو جتنے ہی اونچے عہدہ پر ہے، اس کا پیٹ بھی اتنا ہی بڑا ہے۔

دس بجتے بجتے دونوں آدمی جسونت نگر پہنچ گئے۔ و نے بستی کے باہر ہی ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے اور ڈاکیہ سے جانے کو کہا۔ ڈاکیہ نے ان سے اپنے گھر چلنے کے لیے بہت اصرار کیا۔ جب وہ کسی طرح راضی نہ ہوئے تو اپنے گھر سے ان کے واسطے کھانا بنوا لایا۔ کھانے کے بعد دونوں آدمی اسی جگہ لیٹے۔ ڈاکیہ انہیں تنہا چھوڑ کر گھر نہ گیا۔ وہ تو تھکا ہوا تھا۔ لیٹتے ہی سو گیا۔ پر و نے کو نیند کہاں۔ رانی جی کے خط کا ایک ایک لفظ ان کے دل میں کانٹے کی طرح چبھ رہا تھا۔ رانی نے لکھا تھا کہ تم نے میرے ساتھ اور قوم کے ساتھ دغا کی ہے۔ میں تمہیں کبھی معاف نہ کروں گی۔ تم نے میری تمناؤں کو برباد کر دیا۔ تم اتنی آسانی سے نفس کے غلام بن جاؤ گے۔ اس کا مجھے وہم و گمان بھی نہ تھا۔ تمہارا وہاں رہنا بے فائدہ ہے۔ گھر لوٹ آؤ اور شادی کر کے عیش وعشرت میں زندگی بسر کرو۔ قومی خدمت کے لیے جس طرز عمل کا ہونا ضروری ہے، جس دل و دماغ کا ہونا لابدی ہے، وہ تم نے نہیں پایا اور نہ اسے پا سکو گے۔ شباب کے زمانہ میں ہم لوگ اپنی قابلیتوں کا غلط اندازہ کر لیتے ہیں۔ تم بھی اسی مغالطہ میں پڑ گئے۔ میں تمہیں برا نہیں کہتی، تم شوق سے لوٹ آؤ۔ دنیا میں سبھی اپنی اپنی غرض میں لگے ہیں، تم بھی اسی کے خیال میں محو ہو جاؤ، ہاں اب مجھے تمہارے اوپر وہ گھمنڈ نہ ہوگا جس پر میں پھولی ہوئی تھی۔ تمہارے والد ماجد کو ابھی یہ حال معلوم نہیں ہے۔ وہ سنیں گے تو نہ جانے ان کی کیا حالت ہوگی، لیکن اگر تمہیں یہ بات ابھی معلوم نہیں ہے تو میں بتلائے دیتی ہوں کہ تمہیں اپنی عشق بازیوں کے لیے کوئی دوسرا میدان تلاش کرنا پڑے گا کیونکہ مس صوفیہ کی منگنی مسٹر کلارک سے ہو گئی ہے اور دو چار روز میں شادی بھی ہونے والی ہے۔ یہ اس لیے لکھتی ہوں کہ تمہیں صوفیہ کے بارے میں کسی قسم کا وہم نہ رہے گا اور تمہیں یہ معلوم ہو جائے کہ جس کے

لیے تم نے اپنی زندگی کا اور اپنے والدین کی آرزوؤں کا خون کیا ہے، اس کی نگاہوں میں تمہاری کتنی وقعت ہے۔

ونے سنگھ کے دل میں ایسا جوش پیدا ہوا کہ اس وقت صوفیہ سامنے آ جاتی تو اسے ان الفاظ میں ملامت کرتا یہی میری بے حد دلی محبت کا صلہ ہے؟ تمہارے اوپر مجھے کتنا اعتماد تھا مگر اب معلوم ہوا کہ وہ تمہاری محبت کا اظہار محض ایک تماشا تھا۔ تم میرے لیے آسمان کی دیوی تھیں۔ میں نے تمہیں ایک آسمانی اجالا، ایک روحانی نور سمجھ رکھا تھا۔ آہ میں اپنا مذہب تک تمہارے قدموں پر نچھاور کرنے کو تیار تھا۔ کیا اسی لیے تم نے مجھے آگ کے منہ سے نکالا تھا؟ خیر جو ہوا اچھا ہوا۔ ایشور نے میرے مذہب کی حفاظت کی۔ یہ رنج بھی دور ہو جائے گا۔ میں تمہیں بے فائدہ کوس رہا ہوں۔ تم نے وہی کیا جو اس حالت میں ہر ایک عورت کرتی۔ مجھے رنج اس لیے ہو رہا ہے کہ میں تم سے کچھ اور ہی امید رکھتا تھا۔ یہ میری خام خیالی تھی۔ میں جانتا ہوں کہ میں تمہارے قابل نہیں تھا۔ مجھ میں وہ اوصاف کہاں ہیں جن کی تم قدر کر سکتیں مگر یہ بھی جانتا ہوں کہ جتنی عقیدت مجھے تم سے تھی اور اب بھی ہے اتنی شاید ہی کسی کو ہو سکتی ہو۔ مسٹر کلارک عالم بیدار مغز، قابل اور اوصاف کے مخزن ہی کیوں نہ ہو، لیکن میں نے تمہیں پہچاننے میں دھوکا نہیں کھایا ہے تو تم ان کے ساتھ خوش و خرم نہیں رہ سکو گی۔

مگر اس وقت انہیں اس مایوسی سے کہیں زیادہ رنج اس خیال سے ہو رہا تھا کہ میں اپنی ماں کی نظروں سے گر گیا۔ انہیں کیسے معلوم ہوا؟ کیا صوفی نے میرا خط تو نہیں دکھا دیا؟ اگر اس نے ایسا کیا ہے تو مجھ پر اس سے زیادہ سخت چوٹ نہ کر سکتی تھی۔ کیا عشق بیدرد ہو کر نفرت انگیز بھی ہو جاتا ہے؟ نہیں۔ صوفی پر ایسا شبہ کر کے میں اس کے ساتھ زیادتی نہ کروں گا۔ میں سمجھ گیا۔ اندو کی سادہ مزاجی نے یہ آگ لگائی ہے۔ اس نے ہنسی ہنسی میں ماتا جی سے کہہ دیا ہوگا۔ نہ جانے اسے کبھی عقل آئے گی

یا نہیں۔ اس کی تو دل لگی ہوئی اور یہاں میری جان پر بن گئی۔

یہ سوچتے سوچتے ونے کے دل میں بدلہ کا خیال پیدا ہوا۔ مایوسی میں محبت بھی نفرت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ان کی زبردست خواہش ہوئی کہ صوفی کو ایک طویل خط لکھوں اور اسے خوب طعنے دوں۔ وہ مضمون سوچنے لگے۔ تریا چرتر کی داستانیں کتابوں میں بہت پڑھی تھیں مگر یقین نہ آتا تھا۔ مجھے یہ گمان ہی نہ ہوتا کہ عورت جسے پرماتما نے پاکیزہ، لطیف اور نازک جذبات کا مخزن بنایا ہے، اتنی بیدرد اور کج ادا ہو سکتی ہے مگر یہ تمہارا قصور نہیں ہے یہ تمہارے مذہب کا قصور ہے جس میں وفا کا کوئی معیار نہیں۔ اگر تم نے ہندوؤں کی مذہبی کتب کا مطالعہ کیا ہے تو تم کو ایک نہیں بلکہ ایسی کئی دیویاں ملی ہوں گی جنہوں نے ایک مرتبہ عہد وفا کر لینے پر تمام عمر بیوگی میں گزار دی۔ مسٹر کلارک کی بیوی بن کر تم ایک ہی چھلانگ میں مفتوح سے فاتح قوم کے زمرہ میں داخل ہو جاؤ گی اور بہت ممکن ہے کہ اسی خواہش نے تمہیں میرے دل پر بجلیاں گرانے پر آمادہ کیا ہو۔ مگر تمہاری آنکھیں بہت جلد کھلیں گی اور تمہیں معلوم ہوگا کہ تم نے اپنا وقار بڑھایا نہیں بلکہ کھو دیا ہے۔

اس طرح ونے سنگھ نے خیالی شکوہ و شکایت کے ذریعہ اپنے دل کا غبار خوب نکالا۔ اگر ان زہریلے خیالات کا ذرا بھی علم صوفیہ کو ہو جاتا تو اس دکھیا کی نہ جانے کیا حالت ہوتی۔ شاید اس کی جان ہی پر بن جاتی۔ مگر ونے سنگھ کو خود ہی ایسے خیالوں سے نفرت ہوئی۔ انہوں نے سوچا۔ میرے دل میں ایسے برے خیالات کیوں پیدا ہو رہے ہیں؟ اس کا نازک دل ایسی سخت چوٹیں برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کو مجھ سے محبت تھی۔ میرا دل کہتا ہے کہ وہ اب بھی میری ہمدرد ہے۔ پر میری ہی طرح وہ بھی مذہب، فرض اور رسم و رواج کی زنجیروں سے بندھی ہوئی ہے۔ ممکن ہے کہ اس کے والدین نے اسے مجبور کیا ہو اور اس نے خود کو اپنی مرضی پر قربان کر دیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ماتا جی نے اس کو میرے محبت کے راستہ سے ہٹانے کے لیے یہ تدبیر نکالی

ہو۔ وہ جتنی رحم دل ہیں اتنی غصہ ور بھی۔ میں بلا سمجھے بوجھے صوفیہ پر ایسے جھوٹے الزام لگا کر اپنا اوچھاپن دکھلا رہا ہوں۔

اسی بے قراری کی حالت میں کروٹیں بدلتے بدلتے ونے کی آنکھیں جھپک گئیں۔ کوہستانی علاقوں میں راتیں بڑی سہاونی ہوتی ہیں۔ ایک ہی جھپکی میں تڑکا ہو گیا۔ معلوم نہیں وہ کب تک پڑے سویا کرتے، لیکن پانی کی بوندیں منہ پر پڑیں تو گھبرا کر اٹھ بیٹھے۔ بادل گھرے ہوئے تھے اور ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ جسونت نگر جانے کا ارادہ کر کے اٹھے تھے کہ کئی آدمیوں کو گھوڑے بھگاتے اپنی طرف آتے دیکھا۔ سمجھے شاید بیر پال سنگھ اور اس کے ساتھی ہوں گے۔ مگر قریب آنے پر معلوم ہوا کہ ریاستی پولیس کے آدمی ہیں۔ ڈاکیہ ان کے پاس ہی سویا ہوا تھا۔ پر اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ وہ پہلے ہی اٹھ کر چلا گیا تھا۔

افسر نے پوچھا: ''تمہارا ہی نام ونے سنگھ ہے۔''

ونے سنگھ: جی ہاں۔

افسر: کل رات کو تمہارے ساتھ کئی آدمیوں نے یہاں قیام کیا تھا؟

ونے سنگھ: جی نہیں میرے ساتھ یہاں کے ڈاک خانہ کا صرف ایک ڈاکیہ تھا۔

افسر: تم بیر پال سنگھ کو جانتے ہو؟

ونے سنگھ: اتنا ہی جانتا ہوں کہ مجھے راستہ میں مل گیا تھا۔ وہاں سے کہاں گیا، یہ میں نہیں جانتا۔

افسر: تمہیں یہ معلوم تھا کہ وہ ڈاکو ہے۔

ونے سنگھ: اس نے یہاں کے سرکاری نوکروں کی شان میں اسی ڈاکو لفظ کا استعمال کیا تھا۔

افسر: اس کا مطلب میں یہ سمجھتا ہوں کہ تم کو یہ بات معلوم تھی۔

ونے سنگھ: آپ اس کو جو مطلب بھی چاہیں سمجھیں۔

افسر: اس نے یہاں سے تین میل پر سرکاری خزانہ کی گاڑی لوٹ لی ہے اور ایک سپاہی کو قتل کر ڈالا ہے۔ پولیس کو شک ہے کہ یہ سنگین جرم تمہارے ایماء سے ہوا ہے۔ اس لیے ہم تمہیں گرفتار کرتے ہیں۔

ونے سنگھ: یہ مجھ پر سراسر زیادتی ہے۔ مجھے اس ڈاکہ اور قتل کی ذرا بھی خبر نہیں ہے۔

افسر: اس کا فیصلہ عدالت سے ہوگا۔

ونے سنگھ: کم سے کم مجھے پوچھنے کا حق تو ہے کہ پولیس کے مجھ پر شک کرنے کا کیا سبب ہے؟

افسر: اسی ڈاکیہ کا بیان ہے جو رات کو تمہارے ساتھ یہاں سویا تھا۔

ونے سنگھ: (حیرت سے) یہ اسی ڈاکیہ کا بیان ہے؟

افسر: ہاں اس نے ایک گھڑی رات باقی رہنے کے وقت اس کی اطلاع دی، اب آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ ریاست کی پولیس آپ جیسے بھلے آدمیوں سے کتنی چوکس رہتی ہے۔

فطرت انسانی کتنی پیچیدہ اور ناقابل فہم ہے اس کا ونے کو زندگی میں اول مرتبہ تجربہ ہوا۔ اس قدر اعتقاد و اعتبار کے پردے میں اس قدر فریب اور دغابازی؟

دو سپاہیوں نے ونے سنگھ کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں۔ انہیں ایک گھوڑے پر سوار کر دیا اور جسونت نگر کی طرف چلے۔

(17)

ونے سنگھ چھ ماہ سے جیل میں پڑے ہوئے ہیں۔ نہ ڈاکوؤں کا کچھ پتہ ملتا ہے، نہ ان پر مقدمہ چلایا جاتا ہے۔ حکام کو اب بھی وہم ہے کہ انہی کے یماء سے ڈاکہ پڑا تھا۔ اس لیے وہ ان پر انواع و اقسام کے مظالم کرتے ہیں۔ جب اس طریقہ سے کام چلتا ہوا نہیں دکھائی دیتا تو ترغیب سے کام لیتے ہیں اور پھر وہی پرانا طریقہ

اختیار کرتے ہیں۔ ونے سنگھ پہلے اور قیدیوں کے ساتھ رکھے گئے تھے، لیکن جب قیدیوں کو ان کی طرف مائل ہوتا دیکھا گیا تو اس خوف سے کہ کہیں جیل میں کوئی شورش نہ برپا ہو جائے انہیں سب سے الگ ایک کال کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا۔ کوٹھڑی بہت تنگ تھی۔ ایک بھی کھڑکی نہ تھی۔ دوپہر کو بھی اندھیرا چھایا رہتا تھا۔ بدبو اتنی کہ ناک پھٹتی تھی۔ چوبیس گھنٹوں میں صرف ایک بار دروازہ کھلتا۔ محافظ کھانا رکھ کر پھر دروازہ بند کر دیتا۔ ونے سنگھ کو تکلیف برداشت کرنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ بھوک پیاس سہہ سکتے تھے۔ اوڑھنے اور بچھانے کی انہیں ضرورت نہ تھی۔ اس سے انہیں کوئی خاص تکلیف نہ ہوتی تھی، لیکن تاریکی اور تعفن میں قید رہنا ان کے لیے بالکل نئی سزا تھی۔ اندر ان کا دم گھٹنے لگتا تھا۔ صاف ستھری ہوا میں سانس لینے کے لیے وہ تڑپ تڑپ کر رہ جاتے تھے۔ تازہ ہوا کتنی بیش قیمت ہوتی ہے، اس کا اندازہ انہیں اب ہو رہا تھا۔ مگر ان بدسلوکیوں کے باوجود بھی وہ مغموم اور دل شکستہ نہ ہوتے تھے۔ اس سخت آزمائش ہی میں انہیں قوم کی نجات نظر آتی تھی۔ وہ اپنے دل میں کہتے تھے۔ یہ کٹھن تپسیا بے اثر نہیں جا سکتی۔ جب تک ہم سختیاں اٹھانا نہ سیکھیں گے۔ جب تک ہم عیش و عشرت کو ترک نہ کریں گے، اس وقت تک ہم سے قوم کی کچھ بھلائی نہیں ہو سکتی۔ یہی خیال ان کو ڈھارس دیتا ہے۔

لیکن جب صوفیہ کی بے وفائی کا خیال آ جاتا تو ان کا سارا صبر، حوصلہ اور ایثار، حسرت و یاس کے ہجوم میں غائب ہو جاتا۔ وہ اپنے کو کتنا ہی سمجھاتے کہ صوفیہ نے جو کچھ کیا، مجبور ہو کر کیا ہوگا، لیکن اس دلیل سے ان کی تشفی نہ ہوتی تھی۔ کیا صوفیہ صاف صاف نہ کہہ سکتی تھی کہ میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔ شادی کے بارے میں والدین کی رائے ہمارے یہاں فیصلہ کن ہے لیکن عیسائیوں میں عورت کی منظوری ایک خاص اور ضروری بات سمجھی جاتی ہے۔ اگر صوفیہ کو کلارک سے محبت نہ تھی تو کیا وہ انہیں ٹکا سا جواب نہ دے سکتی تھی۔ دراصل صنف نازک کا رشتۂ محبت بھی نازک ہوتا

ہے جو ایک ہلکے جھٹکے سے ٹوٹ جاتا ہے۔ جب صوفیہ جیسی دور اندیش، آن پر جان دینے والی، اصولوں کی پابند اور نیک دل عورت یوں بے وفائی کر سکتی ہے تو دوسری عورتوں سے کیا امید۔ اس صنف کا اعتبار کرنا ہی فضول ہے۔ صوفی نے مجھے ہمیشہ کے لیے ہوشیار کر دیا۔ ایسا سبق یاد کرا دیا جو کبھی نہ بھولے گا۔ جب صوفیہ دغا کر سکتی ہے تو ایسی کون عورت ہے جس پر اعتبار کیا جا سکے۔ آہ کیا معلوم تھا کہ اتنی بے لوثی، اتنی سادگی، اتنی نیک دلی بھی بالآخر غرض کے سامنے سر جھکائے گی! اب تمام عمر عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھوں گا۔ اس سے یوں دور رہوں گا جیسے کالی ناگن سے، اس سے یوں بچ کر چلوں گا جیسے بڑے نوک دار کانٹے سے۔ کسی سے نفرت کرنا مصلحت اور شرافت کے خلاف ہے مگر اب اس جنس سے نفرت کروں گا۔

اس مایوسی، رنج اور تفکر میں پڑا ہوا کبھی کبھی وہ اتنا مضطرب ہو جاتا کہ جی میں آتا کہ چل کر اس سنگدل کے سامنے دیوار سے سر ٹکرا کر جان دے دوں گا جس میں اسے بھی پشیمان ہونا پڑے۔ میں یہاں آگ کے کنڈ میں جل رہا ہوں۔ دل میں پھپھولے پڑے ہوئے ہیں۔ وہاں کسی کو خبر بھی نہیں۔ سیر و تفریح کا لطف اٹھایا جا رہا ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دے دیتا تو اسے بھی کج ادائی اور بیدردی پر شرم آتی۔ ایشور! مجھے ان بد اندیشیوں کے لیے معاف کرنا۔ میں دل جلا ہوں۔ وہ بھی میری طرح مایوسی کی آگ میں جلتی! کلارک اس کے ساتھ اسی طرح دغا کرتا جس طرح اس نے میرے ساتھ کی ہے۔ اگر میری بد دعا میں کچھ اثر ہے ایک دن ضرور ہی اسے بھی رنج و غم کے آنسو بہاتے ہوئے دیکھوں گا یہ غیر ممکن ہے کہ خون ناحق رنگ نہ لائے۔

لیکن یہ مایوسی سراپا درد انگیز ہی نہ تھی۔ اس میں روحانی ترقی کے آثار بھی پوشیدہ تھے۔ ونے کے دل میں پھر وہی نیک خیالی پیدا ہو گئی جسے محبت کے خیالات نے ناپید کر دیا تھا۔ مایوسی نے غرض کو فنا کر دیا۔

ایک روز ونے سنگھ رات کے وقت لیٹے ہوئے سوچ رہے تھے کہ نہ جانے میرے ساتھیوں پر کیا گزری۔ میری طرح وہ بھی تو آفتوں میں نہیں مبتلا ہو گئے۔ کسی کی کچھ خبر ہی نہیں ملتی۔ یہ سوچ رہے تھے کہ دفعتاً ان کو اپنے سرہانے کی جانب ایک دھماکا سنائی دیا۔ وہ چونک پڑے اور کان لگا کر سننے لگے۔ معلوم ہوا کہ کچھ لوگ دیوار کھود رہے ہیں۔ دیوار پتھر کی تھی مگر بہت پرانی۔ جوڑوں میں لونی لگ گئی تھی۔ پتھر کی سلیں آسانی سے اپنی جگہ چھوڑتی جاتی تھیں۔ ونے سنگھ کو تعجب ہوا۔ ''یہ کون لوگ ہیں۔ اگر چور ہیں تو جیل کی دیوار توڑنے سے انہیں کیا ملے گا۔ شاید سمجھتے ہیں کہ جیل کے داروغہ کا یہی مکان ہے۔'' وہ اسی حیص بیص میں تھا کہ اندر روشنی کی ایک جھلک آئی۔ معلوم ہوا کہ چوروں نے اپنا کام پورا کر لیا۔ وہ نقب کے سامنے جا کر بولے۔ ''تم کون ہو؟ یہ دیوار کیوں کھود رہے ہو؟''

باہر سے آواز آئی۔ ''ہم آپ کے پرانے خادم ہیں۔ میرا نام بیر پال سنگھ ہے۔''

ونے سنگھ نے حقارت سے کہا۔ ''تمہارے لیے کسی خزانہ کی دیواریں نہیں جو جیل کی دیوار کھود رہے ہو؟ یہاں سے چلے جاؤ ورنہ میں شور مچا دوں گا۔''

بیر پال: مہاراج! ہم سے اس دن بڑا اپرادھ ہوا۔ چھما کیجیے۔ ہمیں نہ معلوم تھا کہ صرف چند منٹ ہمارے ساتھ رہنے کے سبب آپ پر آفت آ جائے گی ورنہ ہم سرکاری خزانہ نہ لوٹتے۔ ہمیں رات دن یہی چنتا لگی ہوئی تھی کہ کسی طرح آپ کے درشن کریں اور آپ کو اس آفت سے چھڑائیں۔ آیئے! آپ کے لیے گھوڑا حاضر ہے۔

ونے سنگھ: میں پاپیوں کے ہاتھوں اپنی حفاظت نہیں کرانا چاہتا۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ میں اتنا بڑا الزام سر پر رکھے ہوئے جیل سے بھاگ کر اپنی جان بچاؤں گا تو تم دھوکے میں ہو۔ مجھے اپنی جان اتنی پیاری نہیں ہے۔

بیر پال: خطاوار تو ہم ہیں۔ آپ تو بالکل بے خطا ہیں۔ آپ پر تو حاکموں نے یہ

محض بیجا ظلم کیا ہے۔ ایسی حالت میں آپ کو یہاں سے نکل جانے میں پس و پیش نہ کرنا چاہیے۔

ونے سنگھ: جب تک عدالت مجھے رہا نہ کر دے، میں کسی طرح بھی نہیں جا سکتا۔

بیر پال: یہاں کی عدالتوں سے انصاف کی امید رکھنا چڑیا سے دودھ نکالنا ہے۔ ہم سب کے سب انہی عدالتوں کے مارے ہوئے ہیں۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ میں اپنے گاؤں کا مکھیا تھا، لیکن میری ساری جائیداد صرف اس لیے ضبط کر لی گئی کہ میں نے علاقہ دار کے ہاتھوں سے ایک بے کس نوجوان لڑکی کو بچایا تھا۔ اس کے گھر میں اس کی بڑھیا ماں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ حال ہی میں بیوہ ہو گئی تھی۔ علاقہ دار کی بری نگاہ اس پر پڑ گئی اور وہ لڑکی کو اس کے گھر سے نکال کر لے جانے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے خبر مل گئی۔ رات کو جوں علاقہ دار کے آدمیوں نے بڑھیا کے گھر میں گھسنا چاہا۔ میں اپنے کئی دوستوں ہی کو ساتھ لے کر وہاں جا پہنچا اور ان بدمعاشوں کو مار کر وہاں سے نکال دیا۔ بس علاقہ دار اسی دن سے میرا جانی دشمن ہو گیا۔ مجھ پر چوری کا مقدمہ چلا کر قید کرا دیا۔ عدالت اندھی تھی جیسا علاقہ دار نے کہا ویسا ہی حاکم نے کیا۔ ایسی عدالتوں سے آپ ناحق انصاف کی امید رکھتے ہیں۔

ونے سنگھ: تم لوگ اس دن مجھ سے باتیں کرتے کرتے بندوق کی آواز سن کر ایسا بھاگے کہ مجھے تم پر اعتبار نہیں ہوتا۔

بیر پال: مہاراج! کچھ نہ پوچھیے بندوق کی آواز سنتے ہی ہم پاگل سے ہو گئے۔ ہمیں جب ریاست سے بدلہ لینے کا کوئی موقع ملتا ہے تو ہم اپنے کو بھول جاتے ہیں۔ ہمارے اوپر کوئی بھوت سوار ہو جاتا ہے۔ ریاست نے ہم کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ ہمارے پرکھوں نے اپنے خون سے اس ریاست کی بنیاد ڈالی تھی۔ آج وہی ہمارے خون کی پیاسی ہو رہی ہے۔ ہم آپ کے پاس سے بھاگے تو تھوڑی دور پر اپنے غول کے کئی آدمیوں کو ریاست کے سپاہیوں سے لڑتے پایا۔ ہم پہنچتے ہی

سرکاری آدمیوں پر ٹوٹ پڑے۔ ان کی بندوقیں چھین لیں۔ ایک آدمی کو مار گرایا اور روپیوں کی تھیلیاں گھوڑوں پر لاد کر بھاگ نکلے۔ جب سے سنا ہے کہ آپ ہماری مدد کرنے کے شبہ میں گرفتار کیے گئے ہیں تب سے اسی دوڑ دھوپ میں ہیں کہ آپ کو یہاں سے نکال لے جائیں۔ یہ جگہ آپ جیسے دھرماتما، نڈر اور آزاد آدمیوں کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔ یہاں اسی کا نباہ ہے جو پرلے سرے کا گھاگ، مکار اور بدمعاش ہو اور اپنا کام نکالنے کے لیے برے سے برا طریقہ اختیار کرنے میں ذرا بھی نہ ہچکے۔

ونے سنگھ نے غرور کے ساتھ جواب دیا۔ ''اگر تمہاری باتیں لفظ بہ لفظ سچ ہوں تو بھی میں کوئی ایسا کام نہ کروں گا جس سے ریاست کی بدنامی ہو۔ مجھے اپنے بھائیوں کے ہاتھ سے زہر کا پیالہ پینا منظور ہے مگر رو کر ان کو مصیبت میں ڈالنا منظور نہیں۔ اس ریاست کو ہم نے ہمیشہ فخر کی نگاہ سے دیکھا ہے اور مہاراجہ صاحب کو ہم آج بھی اسی احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ اسی سانگا اور پرتاب کے ورثا میں سے ہیں جنہوں نے ہندو قوم کی حفاظت میں اپنی جانیں تک دے دی تھیں۔ ہم مہاراجہ صاحب کو اپنا محافظ، اپنا خیر اندیش اور چھتری قوم کا سردار سمجھتے ہیں۔ ان کے ملازم سب ہمارے بھائی بند ہیں۔ پھر یہاں کی عدالتوں پر کیوں نہ اعتبار کریں۔ وہ ہمارے ساتھ بے انصافی بھی کریں تو ہم زبان نہ کھولیں گے۔ ریاست کو مطعون کر کے ہم اپنے آپ کو اس درجہ کے نا قابل ثابت کرتے ہیں جو ہماری زندگی کی معراج ہے۔''

بیر پال: دھوکا کھائیے گا۔

ونے سنگھ: اس کی کوئی فکر نہیں۔

بیر پال: میرے سر سے بدنامی کیسے دور ہوگی؟

ونے سنگھ: نیک اعمال سے۔

بیر پال سمجھ گیا۔ اپنے اصولوں سے منحرف نہ ہوں گے۔ پانچوں آدمی گھوڑوں پر سوار ہو گئے اور ایک ہی لمحہ میں موسم سرما کی گھنی کہر نے انہیں اپنے پردہ میں چھپا لیا۔ ٹاپوں کی آواز کچھ دیر تک کانوں میں آتی رہی پھر وہ بھی نہ سنائی دیں۔

اب و نے سوچنے لگے صبح جب لوگ نقب دیکھیں گے تو دل میں کیا خیال کریں گے؟ انہیں یقین ہو جائے گا کہ میں ڈاکوؤں سے ملا ہوا ہوں اور پوشیدہ طریقہ پر بھاگنے کی کوشش کر رہا ہوں، لیکن نہیں جب دیکھیں گے کہ میں بھاگنے کا موقع پا کر بھی نہ بھاگا تو ان کا دل میری طرف سے صاف ہو جائے گا۔ یہ سوچتے ہوئے انہوں نے پتھر کے ٹکڑے چن چن کر نقب بند کرنا شروع کی۔ ان کے پاس صرف ایک ہلکا سا کمبل تھا اور سرما کی سرد ہوا اس شگاف کی راہ سے سن سن کرتی آ رہی تھی۔ کھلے میدان میں شاید انہیں کبھی اتنی سردی نہ معلوم ہوئی تھی۔ ہر ہر رونگٹے میں یہ ہوا سوئی کی طرح چبھ رہی تھی۔ شگاف بند کر کے وہ لیٹ گئے۔

صبح ہوئی تو جیل خانہ میں ہل چل مچ گئی۔ ناظم، علاقہ دار سبھی موقع واردات پر پہنچ گئے۔ تحقیقات ہونے لگی۔ و نے سنگھ نے سارا حال کہہ سنایا۔ افسروں کو بڑی فکر ہوئی کہ کہیں ڈاکو انہیں نکال نہ لے جائیں۔ ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پیروں میں بیڑیاں ڈال دی گئیں۔ یہ طے ہوا کہ ان پر آج ہی مقدمہ چلایا جائے۔ مسلح پولیس انہیں عدالت کی طرف لے چلی۔ ہزاروں آدمیوں کی بھیڑ ساتھ ہو گئی۔ سب لوگ یہی کہہ رہے تھے۔ ''حاکم لوگ ایسے شریف، نیک دل اور پراپکاری شخص پر مقدمہ چلاتے ہیں۔ برا کرتے ہیں۔ بیچارے نے نہ جانے کس بری ساعت میں یہاں قدم رکھا تھا۔ ہم تو ابھاگے ہیں ہی، اپنے پچھلے کرموں کا پھل بھوگ رہے ہیں۔ ہمیں اپنے حال پر چھوڑ دیتے۔ ناحق اس آگ میں کودے۔'' کتنے ہی لوگ رو رہے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ حاکم انہیں سخت سزا دے گا، لمحہ لمحہ تماشائیوں کی تعداد بڑھتی جاتی تھی اور پولیس کو اندیشہ ہو رہا تھا کہ کہیں یہ لوگ بگڑ نہ اٹھیں۔ دفعتا

ایک موٹر آئی اور موٹر ڈرائیور نے پولیس کے افسر کو ایک رقعہ دیا۔ سب لوگ غور سے دیکھ رہے تھے کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے؟ اتنے میں ونے سنگھ موٹر میں سوار کرائے گئے اور موٹر ہوا ہوگئی۔ سب کے سب تاکتے رہ گئے۔

جب موٹر کچھ دور نکل گئی تو ونے نے شوفر (گاڑی چلانے والے) سے پوچھا۔

''مجھے کہاں لیے جاتے ہو؟''

شوفر نے کہا۔ ''آپ کا دیوان صاحب نے بلایا ہے۔''

ونے سنگھ نے کچھ اور نہ پوچھا۔ انہیں اس وقت خوف کے بجائے خوشی تھی کہ دیوان سے ملنے کا اچھا موقع ملا۔ اب ان سے یہاں کے متعلق کافی گفتگو ہوگی۔ سنا ہے قابل آدمی ہیں۔ دیکھوں یہاں کے موجودہ طریقوں کا جواز کیونکر ثابت کرتے ہیں۔

یکایک شوفر نے کہا۔ ''یہ دیوان ایک ہی پاجی ہے۔ رحم کرنا تو جانتا ہی نہیں۔ ایک دن بچہ کو اسی موٹر سے ایسا گراؤں گا کہ ہڈی پسلی کا پتہ نہ چلے گا۔''

ونے سنگھ: ضرور گراؤ ایسے ظالموں کی یہی سزا ہے۔

شوفر نے حیرت سے ونے کی طرف دیکھا۔ اسے اپنے کانوں پر اعتبار نہ ہوا۔ ونے سنگھ کے منہ سے ایسی بات سننے کی اسے امید نہ تھی۔ اس نے سنا تھا کہ وہ اعلیٰ ترین اوصاف کے مخزن ہیں۔ ان کا دل بہت پاک ہے بولا۔ ''تو آپ کی بھی یہی مرضی ہے۔''

ونے سنگھ: کیا کیا جائے۔ ایسے آدمیوں پر اور کسی بات کا تو اثر ہی نہیں ہوتا۔

شوفر: اب تک مجھے یہی اندیشہ ہوتا تھا کہ لوگ مجھے قاتل کہیں گے، لیکن جب آپ جیسے فرشتہ خصلت شخص کی یہی خواہش ہے تو مجھے کیا ڈر۔ بچے بہت رات کو گھومنے نکلا کرتے ہیں۔ ایک ٹھوکر میں تو کام تمام ہو جائے گا۔

ونے سنگھ یہ سن کر ایسا چونکے گویا کوئی خوفناک خواب دیکھا ہو۔ انہیں معلوم ہوا کہ

میں نے ایک نفرت انگیز خیال کی تائید کر کے کتنی بڑی برائی کی ہے۔ان کی سمجھ میں آیا کہ مخصوص آدمیوں کو کتنی احتیاط سے کچھ کہنا چاہیے کیونکہ ان کا ایک ایک لفظ ترغیب وتحریک سے معمور رہتا ہے۔وہ دل میں پچھتا رہے تھے کہ میرے منہ سے ایسی بات نکلی ہی کیوں اور کسی طرح کمان سے نکلے ہوئے تیر کو پھیر لانے کی تدبیر سوچ رہے تھے کہ اتنے میں دیوان صاحب کا گھر آ گیا۔بڑے پھاٹک پر دو مسلح جوان کھڑے ہوئے تھے اور پھاٹک سے ذرا فاصلہ پر دو پیتل کی توپیں رکھی ہوئی تھیں۔پھاٹک پر موٹر رک گئی اور دونوں سپاہی ونے سنگھ کو اندر لے چلے۔دیوان صاحب دیوان خاص میں موجود تھے۔انہوں نے خبر پاتے ہی ونے کو بلا لیا۔

دیوان صاحب کا قد اونچا، بدن گٹھیلا اور رنگ گورا تھا۔ادھیڑ ہو جانے پر بھی ان کے چہرہ کی رونق کسی کھلے ہوئے پھول کی طرح تھی۔تنی ہوئی مونچھیں تھیں۔سر پر مختلف رنگوں کا اودے پوری صافا، بدن پر ایک چست شکاری کوٹ نیچے اودے پوری پاجامہ اور اوپر ایک بھاری اوورکوٹ۔سینہ پر کئی تمغے اور دیگر عزت افزا نشانات موجود تھے۔اودے پوری رسالہ کے ساتھ یورپ کی جنگ عظیم میں شریک ہوئے تھے اور وہاں کئی نازک موقعوں پر اپنی غیر معمولی شجاعت سے فوجی افسروں کو متحیر کر دیا تھا۔یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ اس عہدہ پر مقرر ہوئے تھے۔سردار نیل کنٹھ سنگھ نام تھا۔ایسا وجیہہ شخص ونے کی نظر سے کبھی نہ گزرا تھا۔

دیوان صاحب نے ونے سنگھ کو دیکھتے ہی مسکراتے ہوئے انہیں ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولے۔''یہ زیور تو آپ کے جسم پر بہت زیبا نہیں ہیں، لیکن عوام کی نگاہوں میں ان کی جتنی وقعت ہے اتنی میرے ان تمغوں اور پٹیوں کی ہرگز نہیں ہے۔یہ دیکھ کر میں آپ پر رشک کروں تو کیا نامناسب ہے؟''

ونے سنگھ نے سمجھا تھا کہ دیوان صاحب جاتے ہی جاتے گرج پڑیں گے۔لال پیلی آنکھیں دکھائیں گے۔وہ اس برتاؤ کے لیے تیار تھے اور جو دیوان صاحب کی

یہ ہمدردانہ گفتگو سنی تو پس وپیش میں پڑ گئے۔ اس سخت جواب کے لیے یہاں گنجائش نہ تھی، جسے انہوں نے اپنے دل میں سوچ رکھا تھا۔ بولے۔ ’’یہ تو کوئی ایسی نایاب چیز نہیں ہے جس کے لیے آپ کو رشک کرنا پڑے۔‘‘

دیوان صاحب: (ہنس کر) آپ کے لیے نایاب نہیں، پر میرے لیے نایاب ہی ہے۔ مجھ میں وہ سچی ہمت، وہ سچا حوصلہ نہیں ہے جس کے صلہ میں یہ چیزیں ملتی ہیں۔ مجھے آج معلوم ہوا کہ آپ کنور بھرت سنگھ کے سپوت بیٹے ہیں۔ ان سے میری پرانی ملاقات ہے۔ اب وہ شاید مجھے بھول گئے ہوں۔ کچھ تو اس رشتہ سے کہ آپ میرے پرانے دوست کے بیٹے ہیں اور کچھ اس رشتہ سے کہ آپ نے عین عالم شباب میں نفسانی خواہشات کو ترک کر کے قومی خدمت کا ذمہ لیا ہے۔ میرے دل میں آپ کی خاص عزت و محبت ہے۔ شخصی حیثیت سے میں آپ کی خدمات کو پسندیدہ نگاہوں سے دیکھتا ہوں اور تھوڑے سے وقت میں آپ نے ریاست کو جو نفع پہنچایا ہے اس کے لیے آپ کا ممنون ہوں۔ مجھے خوب معلوم ہے کہ آپ بے قصور ہیں اور ڈاکوؤں سے آپ کا کوئی تعلق نہیں ہوسکتا۔ اس کا مجھے وہم و گمان تک نہیں ہے۔ مہاراجہ صاحب سے بھی آپ کے متعلق ابھی ایک گھنٹہ تک گفتگو ہوئی۔ وہ بھی کھلے دل سے آپ کے مداح ہیں لیکن موجودہ حالات ہمیں آپ سے التجا کرنے پر مجبور کر رہے ہیں کہ بہت اچھا ہو اگر آپ رعایا سے اپنے کو جدا رکھیں۔ مجھے آپ سے یہ کہتے ہوئے دلی افسوس ہوتا ہے کہ اب یہ ریاست آپ کی مہمان داری کا لطف نہیں اٹھا سکتی۔

ونے سنگھ نے اپنے اٹھتے ہوئے غصہ کو ضبط کر کے کہا۔ ’’آپ نے میرے متعلق جس حسن ظن کا اظہار کیا ہے اس کے لیے میں آپ کا ممنون ہوں، لیکن افسوس کہ میں آپ کے حکم کی تعمیل نہیں کرسکتا۔ قومی خدمت میری زندگی کا خاص مدعا ہے اور قوم سے جدا ہو کر میں اپنا عہد نہیں توڑ سکتا۔‘‘

دیوان صاحب: اگر آپ کی زندگی کا خاص مدعا یہی ہے تو آپ کو کسی ریاست میں آنا مناسب نہ تھا۔ ریاستوں کو آپ سرکاری محل سرا سمجھئے جہاں آفتاب کی روشنی کا بھی گزر نہیں ہو سکتا۔ ہم سب اس حرم سرا کے حبشی خواجہ سرا ہیں۔ ہم کسی کی عشق آمیز نگاہوں کو ادھر اٹھنے نہ دیں گے۔ کوئی منچلا جوان ادھر قدم مارنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اگر ایسا ہو تو ہم اپنے عہدہ کے ناقابل خیال کیے جائیں۔ ہماری شوقین مزاج سرکار اپنی حسب خواہش تفریح کے لیے یہاں کبھی کبھی تشریف لاتی ہے۔ حرم سرا کے سوئے ہوئے بھاگ اس دن جاگتے ہیں۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ بیگمات کی دلی تمناؤں کا انحصار ان کی خوبصورتی، ناز و انداز، بناؤ اور سنگار پر ہوا کرتا ہے۔ ورنہ ہماری رسیلی سرکار ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے۔ ہماری سرکار کو مشرقی آرائش و زیبائش پسند ہے۔ ان کا حکم ہے کہ بیگمات کا لباس اور زیور مشرقی ہو، بناؤ سنگار مشرقی ہو، ناز و کرشمہ مشرقی ہو، ان کی آنکھیں شرمیلی ہوں، مغرب کی شوخی ان میں نہ آنے پائے، ان کی رفتار ہنسوں کی چال کی طرح دھیمی ہو۔ مغربی بیگمات کی طرح اچھلتی کودتی نہ چلیں۔ وہ کنیز ہوں، وہی حرم کا داروغہ ہو، وہی حبشی غلام اور وہی اونچی چہار دیواری جس میں پرندہ پر نہ مار سکے۔ آپ نے اس محل سرا میں گھسنے کی جرأت کی ہے۔ یہ بات ہماری عاشق مزاج سرکار کو ایک آنکھ نہیں بھاتی اور آپ تنہا نہیں ہیں بلکہ آپ کے ساتھ خادمانِ قوم کا ایک گروہ ہے۔ اس گروہ کے متعلق طرح طرح کے شکوک پیدا ہو رہے ہیں۔ نادر شاہی حکم ہے کہ جتنی جلد ہو سکے یہ گستاخ گروہ حرم سرا سے دور بھگا دیا جائے۔ یہ دیکھیے، پولیٹیکل ایجنٹ نے آپ کے رفقاء کے کارناموں کی داستان لکھ بھیجی ہے۔ کوئی کوٹہ میں کسانوں کی انجمن قائم کرتا پھر رہا ہے۔ کوئی بیکانیر میں بیگار کی جڑ کھودنے پر آمادہ ہے۔ کوئی میواڑ میں ریاست کے ان ٹیکسوں کی مخالفت کر رہا ہے جو زمانہ قدیم سے وصول ہوتے چلے آئے ہیں۔ آپ لوگ جمہوریت کا ڈنکا بجاتے پھرتے ہیں۔ آپ لوگوں کا کہنا ہے کہ ہر انسان

کو کھانے، پہننے اور آرام سے زندگی بسر کرنے کا مساوی حق ہے۔ اس حرم سرا میں ان خیالات اور اصولوں کی اشاعت کر کے آپ سرکار بہادر کو بدگمان کر دیں گے اور اس کی آنکھیں پھر گئیں تو ہمارا دنیا میں کہیں ٹھکانا نہیں ہے۔ ہم آپ کو عشق و محبت کے گنج میں آگ نہ لگانے دیں گے۔

ہم اپنی کمزوریوں کو طنز کے پردہ میں چھپاتے ہیں۔ دیوان صاحب نے طنزیات کو مستعمل کر کے ونے کی ہمدردی حاصل کرنی چاہی تھی، لیکن ونے سنگھ اتنے بیوقوف نہ تھے۔ وہ چال بھانپ گئے اور بولے۔ ''ہمارا خیال تھا کہ ہم اپنی بے غرضانہ خدمت سے آپ کو اپنا ہمدرد بنالیں گے۔''

دیوان صاحب: اس میں آپ کو پوری کامیابی ہوئی ہے۔ ہم کو آپ سے دلی ہمدردی ہے، لیکن آپ جانتے ہی ہیں کہ ریزیڈنٹ صاحب کی مرضی کے خلاف ہم ایک تنکا بھی نہیں ہلا سکتے۔ آپ ہمارے اوپر رحم کیجیے۔ ہمیں اسی حالت میں چھوڑ دیجیے۔ ہم جیسے گرے ہوؤں کو اٹھانے میں آپ کو نیک نامی کی بجائے بدنامی ہی ملے گی۔

ونے سنگھ: آپ ریزیڈنٹ کی مداخلت بیجا کی مخالفت کیوں نہیں کرتے؟

دیوان صاحب: اس لیے کہ ہم آپ کی طرح بے نفس اور بے لوث نہیں ہیں۔ سرکار کی حفاظت میں ہم من مانے ٹیکس وصول کرتے ہیں، من مانے قانون بناتے ہیں، من مانی سزائیں دیتے ہیں، کوئی چوں نہیں کر سکتا۔ یہی ہماری کارگزاری سمجھی جاتی ہے۔ اسی کے صلہ میں ہم کو بڑے بڑے خطابات ملتے ہیں اور عہدہ کی ترقی ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں ہم مخالفت کیوں کریں۔

دیوان صاحب کی بے غیرتی پر ونے سنگھ نے جھنجھلا کر کہا۔ ''اس سے تو یہ بدرجہا بہتر تھا کہ ریاستوں کا نشان ہی نہ رہتا۔''

دیوان صاحب: اسی لیے تو ہم آپ سے التجا کر رہے ہیں کہ اب کسی اور علاقہ کی

جانب اپنی توجہ مبذول فرمائیے۔

ونے سنگھ: اگر میں جانے سے انکار کروں؟

دیوان صاحب: تو مجھے کمال افسوس کے ساتھ آپ کو اسی عدالت کے سپرد کرنا پڑے گا جہاں انصاف کا خون ہوتا ہے۔

ونے سنگھ: بے گناہ؟

دیوان صاحب: آپ پر ڈاکوؤں کی اعانت کا جرم لگا ہوا ہے۔

ونے سنگھ: ابھی آپ نے کہا ہے آپ کو میری نسبت ذرا بھی شک نہیں ہے۔

دیوان صاحب: وہ میری ذاتی رائے ہے۔ یہ میری منصبی رائے ہے۔

ونے سنگھ: آپ کو اختیار ہے۔

ونے سنگھ پھر موٹر پر بیٹھے تو سوچنے لگے جہاں ایسے ایسے بے غیرت اپنی بدنامیوں پر بغلیں بجانے والے ناخدا ہیں، اس کشتی کو ایشور ہی پار لگائے۔ چلو اچھا ہی ہوا۔ جیل میں رہنے سے ماتا جی کو تو تسکین ہو گی۔ یہاں سے جان بچا کر بھاگتا تو وہ میری طرف سے بالکل مایوس ہو جاتیں۔ اب انہیں معلوم ہو جائے گا کہ ان کا لکھنا بالکل بے اثر نہیں ہوا۔ چلوں اب عدالت کا سوانگ بھی دیکھ لوں۔

(18)

صوفیہ گھر آئی تو اس کا غرور پامال ہو چکا تھا۔ وہ اپنی نگاہوں میں ذلیل ہو چکی تھی۔ اسے اب رانی صاحب پر غصہ آتا تھا نہ اپنے والدین پر۔ غصہ تھا تو صرف اپنے نفس پر، جس کے ہاتھوں اس کی اتنی رسوائی ہو چکی تھی، جس نے اس کو کانٹوں میں گھسیٹا تھا۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ نفس کو پیروں تلے کچل ڈالوں گی۔ اس کا نشان مٹا دوں گی۔ دبدھا میں پڑ کر وہ اپنے نفس کو اپنے اوپر غالب آنے کا موقع نہ دینا چاہتی تھی۔ اس نے ہمیشہ کے لیے اس کا منہ بند کر دینے کا مستحکم ارادہ کر لیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ نفس کا منہ بند کر دینا بہت مشکل ہے، لیکن وہ چاہتی تھی کہ اب اگر نفس جادۂ

فرض سے منحرف ہو تو وہ اپنے اس انحراف پر نادم ضرور ہو۔ جس طرح کوئی تلک لگائے ہوئے وشنو دیوتا کا پجاری شراب کی بھٹی میں جاتے ہوئے جھجکتا ہے اور شرم سے گردن نہیں اٹھا سکتا، اسی طرح اس کا نفس بھی خوش اطواری کی بندشوں میں پڑ کر بری باتوں سے جھجکے۔ اس نفس کشی کے لیے وہ بے وفائی اور مکاری کا الزام سر پر لینے کو تیار تھی۔ تمام عمر مایوسی اور فراق کی آگ میں جلنے کو تیار تھی۔ وہ نفس سے اس ذلت کا بدلہ لینا چاہتی تھی جو رانی کے ہاتھوں اسے برداشت کرنی پڑی تھی۔ اس کا دل شراب پینا چاہتا تھا۔ وہ اسے زہر پلا کر اس کی پیاس بجھانا چاہتی تھی۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ اپنے کو مسٹر کلارک کے سپرد کر دوں گی۔ نفس کشی کا اس کے سوا اور کوئی ذریعہ نہ تھا۔

لیکن باطن میں اس کا وقار کتنا ہی مٹ گیا ہو مگر ظاہر میں وہ اس وقت اپنے انتہائی عروج پر تھی۔ اپنے گھر میں اس کی اتنی خاطر و مدارات کبھی نہ ہوئی تھی۔ مسز سیوک کی آنکھوں میں وہ کبھی اتنی پیاری نہ تھی۔ ان کے منہ سے اس نے کبھی اتنی میٹھی باتیں نہ سنی تھیں۔ یہاں تک کہ اب وہ اس کی مذہبی تحقیقات سے بھی ہمدردی کا اظہار کرتی تھیں۔ عبادت کے معاملہ میں بھی اب اس پر کوئی جبر نہ کیا جاتا تھا۔ وہ اب اپنی مرضی کی مالکہ تھی اور مسز سیوک یہ دیکھ خوشی سے پھولی نہ سماتی تھیں کہ صوفیہ سب سے پہلے گرجا گھر پہنچ جاتی تھی۔ وہ سمجھتی تھیں کہ مسٹر کلارک کی صحبت کا یہ اثر ہے۔

لیکن صوفیہ کے سوا یہ اور کون جان سکتا تھا کہ اس کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔ اس کو روز عشق و محبت کا سوانگ بھرنا پڑتا جس سے اس کو دلی نفرت ہوتی تھی۔ اسے اپنی مرضی کے خلاف مصنوعی جذبات کی نقل کرنی پڑتی تھی۔ اسے عشق و محبت کے وہ الفاظ ہمہ تن گوش ہو کر سننے پڑتے تھے جو اس کے دل پر ہتھوڑوں کی ضرب کی طرح پڑتے تھے۔ اسے ان بیباک اور محبت بھری نگاہوں کا نشانہ بننا پڑتا تھا جن کے سامنے وہ آنکھیں بند کر لینا چاہتی تھی۔ مسٹر کلارک کی باتیں کبھی کبھی اتنی عشقیہ ہوتی

تھیں کہ صوفی کا دل چاہتا تھا کہ اس خودساختہ طرز کا پردہ فاش کردوں۔ اس مصنوعی زندگی کا خاتمہ کردوں، لیکن اس کے ساتھ ہی اسے اپنے دل کے دردوسوز میں ایک حاسدانہ مسرت کا احساس ہوتا تھا۔ پاپی! تیرے یہی سزا ہے۔ تو اسی قابل ہے۔ تو نے مجھے جتنا ذلیل کیا ہے اس کا تجھے کفارہ کرنا پڑے گا۔

اسی طرح وہ ہجراں نصیب رو رو کر زندگی کے دن کاٹ رہی تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ یہ تکلیف کم ہوتی ہوئی نظر نہ آتی تھی۔ صوفیہ نامعلوم طریقہ پر مسٹر کلارک سے کچھ کشیدہ خاطر رہتی تھی۔ دل بہت دبانے پر بھی ان سے نہ ملتا تھا۔ اس کی یہ کشیدگی کلارک کی آتش عشق کو اور بھی مشتعل کر رہی تھی۔ صوفیہ اگر اس حالت میں بھی انہیں منہ نہ لگاتی تھی تو اس کا خاص سبب مسٹر کلارک کی مذہبی رغبت تھی۔ اس کی نگاہ میں مذہب سے بڑھ کر کوئی بری بات نہ تھی۔ وہ اسے تنگ خیالی، نفرت اور غرور کا نشان سمجھتی تھی۔ کلارک دل ہی دل میں سمجھتے تھے کہ صوفیہ کو میں ابھی نہیں پا سکا ہوں اور اس لیے بہت زیادہ مشتاق ہونے پر بھی انہیں صوفیہ سے شادی کے متعلق گفتگو کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ انہیں یقین کامل نہ تھا کہ میری التجا قبول ہوگی، لیکن امید کا تار انہیں صوفیہ کے دامن سے باندھے ہوئے تھا۔

اسی طرح ایک سال سے زیادہ وقت گزر گیا اور مسز سیوک کو اب شک ہونے لگا کہ صوفیہ کہیں ہمیں سبز باغ تو نہیں دکھا رہی ہے۔ آخر ایک روز انہوں نے صوفیہ سے کہا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تو رات دن مسٹر کلارک کے ساتھ بیٹھی کیا کیا کرتی ہے؟ کیا بات ہے؟ کیا وہ شادی کی بات چیت ہی نہیں کرتے؟ یا تو ہی ان سے بھاگی بھاگی پھرتی ہے؟''

صوفیہ شرم سے سرخ ہو کر بولی۔ ''وہ کہنا ہی نہیں چاہتے تو کیا میں ان کی زبان ہو جاؤں؟''

مسز سیوک: یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ عورت چاہے اور پھر بھی مرد نہ کہے۔ وہ تو

آٹھوں پہر موقع کی تاک میں رہتے ہیں۔ تو ہی انہیں پھٹکنے نہ دیتی ہوگی۔

صوفیہ: ماما! ایسی باتیں کر کے مجھے شرمندہ نہ کیجیے۔

مسز سیوک: یہ قصور تمہارا ہی ہے اور اگر تم دو چار دن میں مسٹر کلارک کو شادی کے لیے کہنے کا موقع نہ دو گی تو پھر میں تمہیں رانی صاحبہ کے پاس بھیج دوں گی اور دوبارہ بلانے کا نام نہ لوں گی۔

صوفی کانپ گئی۔ رانی کے پاس لوٹ کر جانے سے مر جانا کہیں بہتر تھا۔ اس نے دل میں ٹھان لیا۔ آج وہ کروں گی جو آج تک کسی عورت نے نہ کیا ہوگا۔ صاف کہہ دوں گی کہ میرے گھر کا دروازہ میرے لیے بند ہے۔ اگر آپ مجھے پناہ دینا چاہتے ہیں تو دیجیے۔ ورنہ میں اپنے لیے کوئی اور راستہ نکالوں۔ مجھ سے محبت کی امید نہ رکھیے۔ آپ میرے شوہر ہو سکتے ہیں۔ معشوق نہیں ہو سکتے۔ یہ سمجھ کر مجھے قبول کرتے ہوں تو کیجیے ورنہ پھر مجھے اپنی صورت نہ دکھایئے گا۔

شام ہو گئی تھی۔ ماگھ کا مہینہ تھا۔ اس پر ہوا اور بادل۔ سردی سے ہاتھ پیر اکڑے جاتے تھے۔ نہ کہیں زمین کا پتہ تھا نہ آسمان کا۔ چاروں طرف کہرا ہی کہرا چھایا ہوا تھا۔ اتوار کا دن تھا۔ عیسائی عورت مرد صاف شفاف کپڑے اور دبیز لبادے پہلے ہوئے ایک ایک کر کے گرجا گھر میں داخل ہو رہے تھے۔ ایک لمحہ میں جان سیوک، مسز سیوک، پربھو سیوک فٹن سے اترے۔ اور لوگ تو فوراً اندر چلے گئے، صرف صوفیہ باہر رہ گئی۔ دفعتاً پربھو سیوک نے باہر آ کر پوچھا۔ ''کیوں صوفی! مسٹر کلارک اندر گئے؟''

صوفیہ: ہاں۔ ابھی گئے ہیں۔

پربھو سیوک: اور تم؟

صوفیہ نے بے کسانہ انداز میں کہا۔ ''میں بھی چلی جاؤں گی۔''

پربھو سیوک: آج تم بہت اداس معلوم ہوتی ہو۔

صوفیہ کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ بولی۔ ''ہاں پربھو۔ آج میں بہت اداس ہوں۔ آج میری زندگی میں سب سے بڑی مصیبت کا دن ہے۔ کیونکہ آج میں کلارک کو اس امر پر مجبور کروں گی کہ وہ مجھ سے شادی کے خواستگار ہوں۔ میرا اخلاقی اور روحانی زوال ہو چکا۔ اب میں اپنے اصولوں پر جان دینے والی، اپنے ضمیر کی آواز کو حکم خدا سمجھنے والی، مذہبی عقائد کو دلیل کی کسوٹی پر پرکھنے والی صوفیہ نہیں ہوں۔ وہ صوفیہ اب دنیا میں نہیں ہے۔ اب میں جو کچھ ہوں اسے اپنی زبان سے کہتے ہوئے مجھے خود شرم آتی ہے۔''

پربھوسیوک شاعر ہونے پر بھی اس خیالی قوت سے بے بہرہ تھے جو دوسروں کے دل میں سما کر ان کی حالت کا احساس کرتی ہے۔ وہ خیالی دنیا میں ہمیشہ گھومتے رہتے تھے اور دنیا کے آرام و تکلیف سے اپنے کو متفکر بنانا انہیں مضحکہ خیز معلوم ہوتا تھا۔ یہ دنیا کے جھمیلے ہیں۔ ان میں کیوں سر کھپائیں۔ انسان کو کھانا اور خوش رہنا چاہیے۔ وہی الفاظ صوفیہ کی زبان سے کئی مرتبہ سن چکے تھے۔ جھنجھلا کر بولے۔ ''تو اس میں رونے دھونے کی کیا ضرورت ہے۔ ماما سے صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتیں؟ انہوں نے تمہیں مجبور تو نہیں کیا ہے۔''

صوفیہ نے حقارت کے لہجہ میں کہا۔ ''پربھو! ایسی باتوں سے دل نہ دکھاؤ۔ تم کیا جانو میرے دل پر کیا گزر رہی ہے۔ اپنی خوشی سے کوئی زہر کا پیالہ تو نہیں پیتا۔ شاید ہی کوئی ایسا دن جاتا ہو کہ میں تم سے اپنی سینکڑوں بار کی کہی ہوئی کہانی نہ کہتی ہوں۔ پھر بھی تم کہتے ہو۔ تمہیں مجبور کس نے کیا؟ تم تو شاعر ہو۔ تم اتنے بے حس کیسے ہو گئے؟ مجبوری کے سوا آج مجھے کون یہاں کھینچ لایا۔ آج میری یہاں آنے کی ذرا بھی خواہش نہ تھی پر یہاں موجود ہوں۔ میں تم سے سچ کہتی ہوں کہ مذہب کی رہی سہی عزت بھی میرے دل سے اٹھ گئی۔ جہلاء کو یہ کہتے ہوئے شرم نہیں آتی کہ مذہب خدا کی برکت ہے۔ میں کہتی ہوں۔ یہ خدائی قہر ہے جو انسانوں کو تباہ برباد کرنے

کے لیے دنیا میں نازل ہوا ہے۔ اسی کے باعث آج میں زہر کا گھونٹ پی رہی ہوں۔ رانی جانہوی جیسی نیک دل عورت کا مجھ سے برگشتہ ہو جانے کا کیا سبب تھا۔ میں اس فرشتہ خصلت انسان سے کیوں بے وفائی کرتی جس کی پرستش آج بھی دل میں کرتی ہوں اور ہمیشہ کرتی رہوں گی؟ اگر یہ سبب نہ ہوتا کہ مجھے اپنی روح کو یہ بے رحمانہ سزا دینی ہی کیوں پڑتی۔ میں اس معاملہ میں جتنا ہی غور کرتی ہوں، اتنی ہی مذہب کے متعلق بے اعتباری زیادہ ہوتی ہے۔ آہ۔ میرے بے وفائی سے و نے کو کتنا رنج ہوا ہوگا۔ اس کے خیال سے میری جان سوکھ جاتی ہے۔ وہ دیکھو مسٹر کلارک بلا رہے ہیں۔ شاید سرمن (وعظ) شروع ہونے والا ہے۔ جانا ہی پڑے گا ورنہ ماما جیتا نہ چھوڑیں گی۔''

پربھو سیوک تو قدم بڑھاتے ہوئے جا پہنچے۔ صوفیہ دو ہی چار قدم چلی تھی کہ یکا یک اسے سڑک پر کسی کے گانے کی آواز آئی۔ اس نے سر اٹھا کر چہار دیواری کے اوپر سے دیکھا کہ ایک اندھا آدمی ہاتھ میں کھنجری لیے یہ گیت گاتا ہوا چلا جا رہا ہے۔

بھئی کیوں رن سے منہ موڑیں
بیروں کا کام ہے مرنا
کچھ نام جگت میں کرنا
کیوں نج مرجادا چھوڑیں
کیوں جیت کی تجھ کو اچھا
کیوں ہار کی تجھ کر چنتا
کیوں دکھ سے ناتا جوڑیں
تو رنگ بھوم میں آیا
دکھلانے اپنی مایا

کیوں دھرم ریت کو توڑیں

صوفیہ نے اندھے کو پہچان لیا۔ سورداس تھا۔ وہ اس گیت کو کچھ اس طرح مست ہو کر گاتا تھا کہ سننے والوں کے دلوں پر چوٹ سی لگتی تھی۔ لوگ راہ چلتے سننے کو کھڑے ہو جاتے تھے۔ صوفیہ محو ہو کر یہ گیت سنتی رہی۔ اسے گیت کے تیسرے پد میں زندگی کا پورا فلسفہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

تو رنگ بھوم میں آیا

دکھلانے اپنی مایا

کیوں دھرم ریت کو توڑیں

بھئی کیوں رن سے منہ موڑیں؟

راگ اتنا سریلا، اتنا شیریں، اتنا جوش افزا تھا کہ سماں بندھ گیا۔ راگ پر کھنجری کی تال اور بھی غضب کرتی تھی۔ جو سنتا تھا۔ سر دھنتا تھا۔

صوفیہ بھول گئی کہ میں گرجا جا رہی ہوں۔ سرمن کی ذرا بھی یاد نہ رہی۔ وہ بڑی دیر تک پھاٹک پر کھڑی اسی سرمن کو سنتی رہی۔ یہاں تک کہ سرمن ختم ہو گیا۔ معتقدین باہر نکل کر چلے۔ مسٹر کلارک نے آہستہ سے صوفیہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک پڑی۔

کلارک: لارڈ بشپ کا سرمن ختم ہو گیا اور تم ابھی تک یہیں کھڑی ہو۔

صوفیہ: اتنی جلد؟ ذرا میں اس اندھے کا گانا سننے لگی۔ سرمن کتنی دیر تک ہوا ہو گا؟

کلارک: نصف گھنٹہ سے کم نہ ہوا ہو گا۔ لارڈ بشپ کے سرمن مختصر ہوتے ہیں مگر نہایت دلکش۔ میں نے ایسا نورانی اور دانش مندانہ سرمن آج تک نہ سنا تھا۔ انگلستان میں بھی نہیں! افسوس کہ تم نہ آئیں۔

صوفیہ: مجھے تعجب ہوا ہے کہ میں یہاں نصف گھنٹہ تک کھڑی رہی۔

اسی اثناء میں مسٹر ایشور سیوک اپنے جملہ متعلقین کے ساتھ آ کر کھڑے ہو گئے۔

مسز سیوک نے کلارک کو مادرانہ محبت سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیوں ولیم۔ صوفی آج کے سرمن کے بارے میں کیا کہتی ہے؟''

کلارک: یہ تو اندر گئی ہی نہیں۔

مسز سیوک نے صوفیہ کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ ''صوفیہ یہ تمہارے لیے شرم کی بات ہے!''

صوفیہ شرمندہ ہو کر بولی۔ ''مجھ سے بڑی غلطی ہوئی۔ میں اس اندھے کا گانا سننے کے لیے ذرا رک گئی۔ اتنے میں سرمن ختم ہو گیا۔''

ایشور سیوک: بیٹی۔ آج کا سرمن آب حیات کی طرح تھا جس نے روح کو آسودہ کر دیا۔ جس نے نہیں سنا وہ تمام عمر پچھتائے گا۔ پربھو مجھے اپنے دامن میں چھپا۔ ایسا سرمن آج تک نہ سنا تھا۔

مسز سیوک: تعجب ہے کہ اس روحانی نغمہ کے سامنے تمہیں یہ دہقانی گیت زیادہ دلکش معلوم ہوا۔

پربھو سیوک: ماما یہ نہ کہیے۔ دہقانی نغموں میں اکثر ایسی تاثیر ہوتی ہے جو مستند شعراء کے کلاموں میں بھی نہیں ہوتی۔

مسز سیوک: ارے یہ تو وہی اندھا ہے جس کی زمین ہم نے لی ہے۔ آج یہاں کیسے آ پہنچا؟ ابھاگے نے روپے نہ لیے۔ اب گلی گلی بھیک مانگتا پھرتا ہے۔

دفعتاً سورداس نے بلند آواز میں کہا۔ ''دہائی ہے! پنچو۔ دہائی ہے! سیوک صاحب و راجہ صاحب نے میری جمین زبردستی چھین لی ہے۔ مجھ دکھیا کی فریاد کوئی نہیں سنتا۔ دہائی ہے!

دربل کو نہ ستائیے جا کی موٹی ہائے
موئی کھال کی سانس سوں سار بھسم ہوئے جائے

کلارک نے مسٹر سیوک سے پوچھا۔ ''اس کی زمین تو معاوضہ دے کر لی گئی تھی نا؟

اب یہ کیسا جھگڑا ہے؟''

مسز سیوک: اس نے معاوضہ نہیں لیا۔ روپے خزانہ میں جمع کر دیئے گئے ہیں۔ بدمعاش آدمی ہے۔

ایک عیسائی بیرسٹر صاحب نے جو چیئر مینی کے لیے راجہ صاحب چتاری کے مقابلہ میں کھڑے ہوئے تھے، سورداس سے پوچھا۔ ''کیوں اندھے کیسی زمین تھی؟ راجہ صاحب نے کیسے لے لی؟''

سورداس: ہجور۔ میرے باپ دادوں کی جمین (زمین) ہے۔ سیوک صاحب وہاں چرٹ بنانے کا کارکھانا کھول رہے ہیں۔ ان کے کہنے سے راجہ صاحب نے وہ جمین مجھ سے چھین لی ہے۔ دہائی ہے سرکار کی۔ دہائی پنچو۔ گریب کی کوئی نہیں سنتا۔

عیسائی بیرسٹر نے کلارک سے کہا۔ ''میرے خیال میں خانگی فائدہ کے لیے کسی کی زمین پر قبضہ کرنا خلاف قانون ہے۔''

کلارک: بہت معقول معاوضہ دیا گیا ہے۔

بیرسٹر: آپ کسی کو معاوضہ لینے کے لیے مجبور نہیں کر سکتے۔ جب تک آپ یہ ثابت نہ کر دیں کہ آپ زمین کو عوام کے فائدے کے لیے لے رہے ہیں۔

''کاشی آئرن ورکس'' کے مالک مسٹر جان برڈ نے جو جان سیوک کے پرانے مخالف تھے کہا۔ ''بیرسٹر صاحب! کیا آپ کو نہیں معلوم ہے کہ سگریٹ کا کارخانہ کھولنا کار ثواب ہے۔ سگریٹ پینے والے آدمی کو بہشت میں داخل ہونے میں ذرا بھی دقت نہیں ہوتی۔''

پروفیسر چارلس سیمین جنہوں نے سگریٹ نوشی کے خلاف ایک پمفلٹ لکھا تھا، بولے۔ ''اگر سگریٹ کے کارخانہ کے لیے سرکار زمین دلا سکتی ہے تو کوئی سبب نہیں کہ چکلوں کے لیے نہ دلائے۔ سگریٹ کے کارخانہ کے لیے زمین پر قبضہ کرنا، اس قانونی دفعہ کا بیجا طور پر استعمال کرنا ہے۔ میں نے اپنے پمفلٹ میں دنیا کے بڑے

بڑے علماء اور حکماء کی رائیں درج کی تھیں۔خرابی صحت کا خاص سبب سگریٹ نوشی کی کثرت ہے۔افسوس کہ اس پمفلٹ کی عوام نے قدر نہ کی۔''

''کاشی ریلوے یونین'' کے سیکرٹری مسٹر نیل منی نے کہا۔''یہ سارے قاعدے سرمایہ داروں کی نفع رسانی کے لیے وضع کیے گئے ہیں اور سرمایہ داروں ہی کو یہ تجویز کرنے کا اختیار دیا گیا ہے کہ ان قواعد کا استعمال کب اور کہاں ہو۔کتے کو کھال کی پاسبانی سپرد کی گئی ہے۔کیوں اندھے تیری کل زمین کتنی ہے؟''

سورداس:ہجور دس بیگھے سے کچھ جیادہ (زیادہ) ہوگی۔سرکار باپ دادوں کی یہی نشانی ہے۔پہلے راجہ صاحب مجھ سے مول مانگتے تھے۔جب میں نے نہ دیا تو جبر جستی (زبردستی) چھین لی۔ہجور۔اندھا اپاہج ہوں۔آپ کے سوائے کس سے پھریاد (فریاد) کروں۔کوئی سنے گا تو سنے گا نہیں بھگوان تو سنیں گے۔

جان سیوک اب یہاں ایک لمحہ بھی نہ ٹھہر سکے۔باتوں باتوں میں جھگڑا ہو جانے کا اندیشہ تھا اور اتفاق سے ان کے سبھی مخالفین یکجا ہو گئے تھے۔مسٹر کلارک بھی صوفیہ کے ساتھ اپنی موٹر پر آ بیٹھے۔راستہ میں جان سیوک نے کہا۔''کہیں راجہ صاحب نے اس اندھے کی فریاد سن لی تو ان کے ہاتھ پاؤں پھول جائیں گے۔''

مسز سیوک:پاجی آدمی ہے۔اسے پولیس کے حوالہ کیوں نہیں کرا دیتے۔

ایشور سیوک:نہیں بیٹا۔ایسا بھول کر بھی نہ کرنا ورنہ اخبار والے اس بات کا تبنگڑ بنا کر تمہیں بدنام کر دیں گے۔یسوع!میرا منہ اپنے دامن میں چھپا اور اس نابکار کی زبان بند کر دے!

مسز سیوک:دو چار روز میں آپ ہی خاموش ہو جائے گا۔ٹھیکہ داروں نے ٹھیکہ کر لیا نا؟

جان سیوک:ہاں۔کام تو آج کل میں شروع ہو جانے والا ہے مگر اس موذی کو چپ کرانا سہل نہیں ہے۔محلّہ والوں کو تو میں نے توڑ لیا۔وہ سب اس کی مدد نہ کریں

گے۔ مگر مجھے امید تھی کہ اس طرف سے مدد نہ پا کر اس کی ہمت ٹوٹ جائے گی۔ یہ امید پوری نہ ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے بڑے جیوٹ کا آدمی ہے۔ آسانی سے قابو میں آنے والا نہیں ہے۔ راجہ صاحب کا میونسپل بورڈ میں اب وہ زور نہیں رہا ورنہ کوئی اندیشہ نہ تھا۔ انہیں پورے سال بھر تک ممبران بورڈ کی خوشامد کرنی پڑی۔ تب جا کر یہ تجویز منظور کرا سکے۔ ایسا نہ ہو کہ ممبر لوگ پھر کوئی چال چلیں۔

اتنے میں راجہ مہیندر کمار کی موٹر سامنے آ کر رکی۔ راجہ صاحب بولے۔ ''آپ سے خوب ملاقات ہوئی۔ میں آپ کے بنگلہ سے واپس آ رہا ہوں۔ آیئے ہم اور آپ سیر کر آئیں۔ مجھے آپ سے کچھ ضروری بات چیت کرنی ہے۔''

جب جان سیوک موٹر پر بیٹھ گئے تو باتیں ہونے لگیں۔ راجہ صاحب نے کہا۔ ''آپ کا سورداس تو ایک ہی بدمعاش نکلا۔ کل سے سارے شہر میں گھوم گھوم کر گاتا ہے اور ہم لوگوں کو بدنام کرتا ہے۔ اندھے گانے میں اچھے ہوتے ہی ہیں۔ اس کا راگ بہت لوچدار ہے۔ بات کی بات میں اسے ہزاروں آدمی گھیر لیتے ہیں۔ جب خوب مجمع ہو جاتا ہے تو وہ دہائی دیتا ہے اور ہم لوگوں کو بدنام کرتا ہے۔''

جان سیوک: ابھی گرجا میں آ پہنچا تھا۔ بس ہی دہائیاں دیتا تھا۔ پروفیسر سیمین مسٹر نیل منی وغیرہ کو تو آپ جانتے ہی ہیں۔ یہ لوگ اس کو اور بھی اکسا رہے ہیں۔ شاید ابھی وہیں کھڑا ہو۔

راجہ صاحب: مسٹر کلارک سے کوئی بات چیت نہیں ہوئی؟

جان سیوک: موجود تو وہ بھی تھے۔ ان کی رائے ہے کہ اندھے کو پاگل خانہ بھیج دیا جائے۔ میں منع نہ کرتا تو وہ اسی وقت تھانہ دار کو لکھتے۔

راجہ صاحب: آپ نے بہت اچھا کیا کہ منع کر دیا۔ اسے پاگل خانہ یا جیل خانہ بھیج دینا آسان ہے، لیکن عوام کو یہ یقین دلانا مشکل ہے کہ اس کے ساتھ ناانصافی نہیں کی گئی۔ مجھے تو اس کی دوہائیوں تہائیوں کی پروا نہیں؟ مگر آپ جانتے ہیں کہ

ہمارے کتنے دشمن ہیں۔ اگر اس کا یہی رویہ رہا تو دس پانچ دن میں ہم سارے شہر میں نکو بن جائیں گے۔

جان سیوک: اقتدار اور بدنامی کا تو چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس کی فکر نہ کیجیے۔ مجھے تو یہ افسوس ہے کہ میں نے محلّہ والوں کو قابو میں لانے کے لیے بڑے بڑے وعدے کر لیے۔ جب اندھے پر کسی کا کچھ اثر ہی نہ ہوا تو میرے سارے وعدے بیکار ہو گئے۔

راجہ صاحب: اجی آپ کی تو جیت ہی جیت ہے۔ ہر طرف سے گیا تو میں۔ اتنی زمین آپ کو دس ہزار سے کم میں نہ ملتی۔ دھرم سالا بنوانے میں آپ کے اسی قدر روپے لگیں گے۔ مٹی تو میری خراب ہوئی۔ شاید زندگی میں یہ پہلا موقع ہے کہ میں عوام کی نگاہوں سے گرتا ہوا نظر آتا ہوں۔ چلیے ذرا پانڈے پور تک تو چلیں۔ ممکن ہے محلّہ والوں کے سمجھانے کا اب بھی کچھ اثر ہو۔

موٹر پانڈے پور کی طرف چلی۔ سڑک خراب تھی۔ راجہ صاحب نے انجینیر کو تاکید کر دی تھی کہ سڑک کی مرمت کا بندوبست کر دیا جائے مگر ابھی تک کہیں کنکر بھی نظر نہ آتا تھا۔ انھوں نے اپنی نوٹ بک میں درج کیا کہ جواب طلب کیا جائے۔ چنگی گھر پہنچے تو دیکھا کہ وہاں کا منشی آرام سے پلنگ پر لیٹا ہوا ہے اور سڑک پر کئی گاڑیاں روکنے کے لیے کھڑی ہیں۔ منشی جی نے دل میں یہ تجویز کر لیا ہے کہ فی گاڑی ایک روپیہ لیے بغیر روانہ نہ ہونے دوں گا، ورنہ انھیں رات بھر یہیں کھڑا رکھوں گا۔ راجہ صاحب نے وہاں جاتے ہی گاڑی والوں کو روانہ دلا دیا اور منشی کے رجسٹر میں یہ بات نوٹ کر دی۔ پانڈے پور پہنچے تو اندھیرا ہو چلا تھا۔ موٹر رو کی۔ دونوں صاحب اتر کر مندر میں گئے۔ نایک رام لنگی چڑھائے بھنگ گھوٹ رہے تھے۔ دوڑے ہوئے آئے۔ بجرنگی ناند میں پانی بھر رہا تھا۔ آ کر کھڑا ہو گیا۔ سلام بندگی کے بعد جان سیوک نے نایک رام سے کہا۔ ''اندھا تو بہت بگڑا ہوا ہے۔''

نایک رام: سرکار بگڑا تو اتنا ہے کہ جس دن سے ڈونڈی پٹی اس دن سے گھر نہیں آیا۔ سارا دن شہر میں گھومتا ہے۔ بھجن گاتا ہے اور دوہائی دیتا ہے۔

راجہ صاحب: تم لوگوں نے اسے کچھ سمجھایا نہیں؟

نایک رام: گریب پرور! اپنے سامنے کسی کو کچھ سمجھتا ہی نہیں۔ دوسرا آدمی ہو تو مار پیٹ کی دھمکی سے سیدھا ہو جائے مگر اسے تو ڈر جیسے چھو کر نہیں گیا۔ اسی دن سے گھر نہیں آیا۔

راجہ صاحب: تم لوگ اسے سمجھا بجھا کر یہاں لاؤ۔ ساری دنیا چھان ڈالی اور ایک جاہل کو قابو میں نہیں لا سکتے؟

نایک رام: سرکار سمجھانا بجھانا تو میں نہیں جانتا۔ حکم ہو تو ہاتھ پیر توڑ کر بٹھا دوں۔ آپ ہی چپ ہو جائے گا۔

راجہ صاحب: چھی چھی۔ کیسی باتیں کرتے ہو! میں دیکھتا ہوں یہاں پانی کا نل نہیں ہے۔ تم لوگوں کو تو بہت تکلیف ہوتی ہوگی۔

مسٹر سیوک: آپ یہاں نل پہنچانے کا ٹھیکہ لے لیجیے۔

نایک رام: بڑی دیا ہے گریب پرور نل آ جائے تو کیا کہنا۔

راجہ صاحب: تم لوگوں نے کبھی اس کے لیے درخواست ہی نہیں دی۔

نایک رام: سرکار یہ بستی حد سے باہر ہے۔

راجہ صاحب: کوئی ہرج نہیں نل لگا دیا جائے گا۔

اتنے میں ٹھاکر دین نے آ کر کہا۔ ''سرکار میری بھی کچھ خاطری ہو جائے۔'' یہ کہہ کر اس نے چاندی کے ورق میں لپٹے ہوئے پان کے بیڑے دونوں صاحبوں کی خدمت میں پیش کیے۔ مسٹر سیوک کو انگریزی وضع رکھنے پر بھی پان سے نفرت نہ تھی۔ شوق سے کھا لیا۔

راجہ صاحب نے منہ میں پان رکھتے ہوئے بولے۔ ''کیا یہاں لالٹینیں نہیں

ہیں؟ اندھیرے میں تو بڑی تکلیف ہوتی ہوگی۔''

ٹھاکردین نے نایک رام کی طرف پرمعنی نگاہوں سے دیکھا۔گویا کہہ رہا تھا کہ میرے بیڑے نے رنگ جما دیا۔بولا۔''سرکار۔ہم لوگوں کی کون سنتا ہے۔اب ہجور کی نگاہ ہوگئی ہے تو لگ ہی جائے گی۔بس اور کہیں نہیں۔اسی مندر پر ایک لالٹین لگا دی جائے۔سادھو مہاتما آتے ہیں تو اندھیرے میں انہیں تکلیف ہوتی ہے۔لالٹین سے مندر کی سوبھا بڑھ جائے گی۔سب کو آسیر باد دیں گے۔''

دونوں آدمی موٹر پر بیٹھنے ہی والے تھے کہ سوبھاگی ایک سرخ ساڑھی پہنے گھونگٹ نکالے آکر ذرا فاصلہ پر کھڑی ہوگئی۔گویا کچھ کہنا چاہتی ہے۔راجہ صاحب نے پوچھا۔''یہ کون ہے؟ کیا کہنا چاہتی ہے؟''

نایک رام: سرکار! ایک پاسن ہے۔کیا ہے سوبھاگی؟ کچھ کہنے آئی ہے؟

سوبھاگی: (آہستہ سے) کوئی سنے گا؟

راجہ صاحب: ہاں ہاں کہہ کیا کہتی ہے؟

سوبھاگی: کچھ نہیں مالک۔یہی کہنے آئی تھی کہ سورداس کے ساتھ بڑا انیائے (بے انصافی) ہوا ہے۔اگر ان کی پھریاد (فریاد) نہ سنی گئی تو وہ مر جائیں گے۔

جان سیوک: ان کے مر جانے کے ڈر سے سرکار اپنا کام چھوڑ دے؟

سوبھاگی: ہجور! سرکار کا کام پرجا کا پالنا ہے کہ اجاڑنا؟ جب سے یہ دھرتی نکل گئی ہے، اسے نہ کھانے کی سدھ ہے نہ پینے کی۔ہم گریب عورتوں کا تو وہی ایک سہارا ہے۔نہیں تو محلّہ کے مرد کبھی عورتوں کو جیتا نہ چھوڑتے اور مردوں کی تو ملی بھگت ہے۔مرد چاہے عورت کے انگ انگ، پور پور کاٹ ڈالے۔اس کو کوئی منع نہیں کرتا۔چور چور موسیرے بھائی ہو جاتے ہیں۔وہی ایک بیچارہ سورداس تھا جو ہم گریبوں کی پیٹھ پر کھڑا ہو جاتا تھا۔

بھیرو بھی آکر کھڑا ہو گیا تھا۔بولا۔''ہجور! سورداس نہ ہوتا تو یہ سرکار کے سامنے

کھڑی نہ ہوتی۔ اس نے جان پر کھیل کر اس کی جان بچائی تھی۔''

راجہ صاحب: آدمی جیوٹ کا معلوم ہوتا ہے۔

نایک رام: جیوٹ کیا ہے سرکار، بس یہ سمجھئے کہ ہتیا کے بل جیتتا ہے۔

راجہ صاحب: بس یہ بات تم نے بہت ٹھیک کہی۔ ہتیا ہی کے بل جیتتا ہے۔ چاہوں تو آج پکڑوا دوں مگر سوچتا ہوں اندھا ہے۔ اس پر کیا غصہ دکھاؤں۔ تم لوگ اس کے پڑوسی ہو۔ تمہاری بات کچھ نہ کچھ سنے گا ہی۔ تم لوگ اسے سمجھاؤ۔ نایک رام! ہم تم سے تاکید کر کے کہے جاتے ہیں۔

ایک گھنٹہ رات جا چکی تھی۔ کہرا اور بھی گھنا ہو گیا تھا۔ دکانوں کے چراغوں کے چاروں طرف کوئی موٹا کاغذ سا پڑا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ دونوں اصحاب رخصت ہوئے مگر دونوں ہی فکر میں محو تھے۔ راجہ صاحب سوچ رہے تھے کہ دیکھیں لالٹین اور نل کا کچھ اثر ہوتا ہے یا نہیں۔ جان سیوک کو فکر تھی کہ کہیں مجھے جیتی ہوئی بازی نہ کھونی پڑے۔

(19)

صوفیہ اپنے تفکرات میں اس قدر محو تھی کہ سورداس کو بالکل بھول سی گئی تھی۔ اس کی فریاد سن کر اس کا دل کانپ اٹھا۔ اس غریب آدمی پر اتنا زبردست ظلم۔ اس کا دردمند دل اسے برداشت نہ کر سکا۔ سوچنے لگی۔ سورداس کو اس مصیبت سے کیونکر نجات دلاؤں؟ اگر پاپا سے کہوں تو وہ ہرگز نہ سنیں گے۔ انہیں اپنے کارخانہ کی ایسی دھن سوار ہے کہ وہ اس بارے میں میری زبان سے ایک لفظ بھی سننا پسند نہ کریں گے۔

بہت سوچ بچار کے بعد اس نے طے کیا کہ چل کر اندو سے عرض کروں۔ اگر وہ راجہ صاحب سے زور دے کر کہے گی تو ممکن ہے کہ راجہ صاحب مان جائیں۔ باپ سے مخالفت کرتے اسے بہت افسوس ہوتا تھا، لیکن اس کی مذہبی نگاہ میں رحم کی عظمت اس قدر مسلمہ تھی جس کے مقابلہ میں باپ کے نفع یا نقصان کی کوئی وقعت نہ تھی۔ وہ

جانتی تھی کہ راجہ صاحب غریب نواز ہیں اور انہوں نے سورداس پر صرف مسٹر کلارک کی خاطر سے یہ ظلم کیا ہے۔ جب انہیں معلوم ہو جائے گا کہ میں اس کام کے لیے ان کی ذرا بھی ممنون نہ ہوں گی تو شاید وہ اپنے فیصلہ کی نظر ثانی پر آمادہ ہو جائیں۔ یہاں جوں ہی بات کھلے گی، سارا گھر میرا دشمن ہو جائے گا مگر اس کی کیا پروا۔ اس خیال سے میں اپنا فرض تو نہیں ترک کر سکتی۔

اسی حیص بیص میں تین روز گزر گئے تھے۔ روز علی الصبح وہ اندو سے ملنے کو چلی۔ سواری کرایہ کی تھی۔ وہ سوچتی جاتی تھی کہ میں جوں ہی قدم اندر رکھوں گی، اندو دوڑ کر گلے لپٹ جائے گی اور شکایت کرے گی کہ اتنے دنوں بعد کیوں آئیں؟ ممکن ہے وہ آج مجھے آنے بھی نہ دے۔ وہ راجہ صاحب کو ضرور رضامند کر لے گی۔ نہ جانے پاپا نے راجہ صاحب کو کیونکر چکمہ دیا۔

یہی سوچتے سوچتے وہ راجہ صاحب کے مکان پر پہنچ گئی۔ اندو کو خبر دی۔ اس کو یقین تھا کہ اندو خود آ کر اسے لے جائے گی، لیکن پندرہ منٹ تک انتظار کرنے پر ایک خادمہ آئی اور اسے اندر لے گئی۔

صوفیہ نے جا کر دیکھا کہ اندو اپنی نشست گاہ میں دوشالہ اوڑھے انگیٹھی کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی ہے۔ صوفیہ نے اندر قدم رکھا تو بھی اندو کرسی سے نہ اٹھی۔ صوفیہ نے ہاتھ بڑھایا تو بھی بے رخی سے ہاتھ بڑھا دینے کے سوا اندو منہ سے کچھ نہ بولی۔ صوفیہ نے سمجھا اس کی طبیعت ناساز ہے۔ بولی "سر میں درد ہے کیا؟"

اس کی سمجھ ہی میں نہ آتا تھا کہ بیماری کے سوا اس بے اعتنائی کا اور بھی کوئی سبب ہو سکتا ہے۔

اندو نے دھیمی آواز میں کہا۔ "نہیں اچھی تو ہوں۔ اس ٹھنڈ میں تو تمہیں بڑی تکلیف ہوئی؟"

صوفیہ خوددار عورت تھی۔ اندو کی اس بے اعتنائی سے اس کے دل پر چوٹ سی لگی۔

پہلے تو یہ خیال ہوا کہ الٹے قدم واپس جاؤں مگر یہ سوچ کر کہ ایسا کرنا بہت مضحکہ خیز ہو گا۔اس نے ہمت کر کے ایک کرسی کھینچی اور اس پر بیٹھ گئی۔

صوفیہ: آپ سے ملے ایک سال سے زیادہ ہو گیا۔

اندو: ہاں مجھے آنے جانے کی فرصت کم رہتی ہے۔منڈیاہوں کی رانی صاحبہ ایک مہینہ میں تین مرتبہ آ چکی ہیں۔پر میں ایک دفعہ بھی نہیں جا سکی۔

صوفیہ دل میں ہنستی ہوئی طنز سے بولی۔''جب رانیوں کو یہ بات نہیں حاصل ہوتی تو میں کس شمار میں ہوں۔کیا کچھ ریاست کا کام بھی دیکھنا پڑتا ہے؟''

اندو: کچھ نہیں بلکہ سب کچھ۔راجہ صاحب کو قومی کاموں سے فرصت ہی نہیں ملتی تو گھر کا کام دیکھنے والا بھی تو کوئی چاہیے۔میں بھی دیکھتی ہوں کہ جب انہی کاموں کے بدولت ان کی وہ عزت ہے جو بڑے سے بڑے حکام کو بھی نہیں ملتی تو ان سے زیادہ چھیڑ چھاڑ نہیں کرتی۔

صوفیہ ہنوز نہ سمجھ سکی کہ اندو کی ناراضگی کا سبب کیا ہے۔بولی۔''آپ بڑی خوش نصیب ہیں کہ اس طرح ان کے نیک کاموں میں شریک ہو سکتی ہو۔راجہ صاحب آج سارے میں نیک نام ہو رہے ہیں۔مگر برا نہ مانیے گا کبھی کبھی وہ بھی منہ دیکھی کر جاتے ہیں اور بڑوں کے سامنے چھوٹوں کا خیال نہیں کرتے۔''

اندو: غالباً یہ ان کی پہلی شکایت ہے جو میرے کان تک پہنچی ہے۔

صوفیہ: ہاں بدقسمتی سے یہ کام میرے ہی سر پڑا۔سورداس کو تو آپ جانتی ہی ہیں۔راجہ صاحب نے اس کی زمین پاپا کو دے دی ہے۔اندھا بے چارہ آج کل کوچہ کوچہ دوہائی دیتا پھرتا ہے۔باپ کے خلاف ایک لفظ بھی منہ سے نکالنا میرے لیے باعث شرم ہے۔یہ میں خوب سمجھتی ہوں۔پھر بھی یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتی کہ اس موقع پر راجہ صاحب کو ایک بیکس شخص پر زیادہ رحم کرنا چاہیے تھا۔

اندو نے صوفیہ کی طرف متنفرانہ نظروں سے دیکھ کر کہا۔''آج کل باپ سے بھی

ان بن ہے کیا؟''

صوفیہ نے غرور سے کہا۔ ''انصاف اور فرض کے سامنے باپ، لڑکا یا شوہر کی جانبداری نہ کی جائے تو کوئی شرم کی بات نہیں ہے۔''

اندو: تو تمہیں پہلے اپنے آپ ہی کو ٹھیک راستہ پر لانا چاہیے تھا۔ راجہ صاحب نے جو کچھ کیا تمہاری خاطر سے کیا اور تمہی ان پر الزام رکھتی ہو۔ یہ کتنے افسوس کی بات ہے۔ انہیں مسٹر سیوک، مسٹر کلارک یا دنیا کے کسی اور شخص سے دبنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر اس وقت انہوں نے تمہارے پاپا کا خیال نہ کیا ہوتا تو شاید سب سے پہلے تمہی ان پر احسان فراموشی کا الزام عاید کرتیں۔ سورداس پر یہ ستم اس لیے ڈھایا گیا کہ تم نے ایک نازک موقع پرونے کی حفاظت کی ہے۔ اور تم اپنے پاپا کی بیٹی ہو۔

صوفیہ یہ سخت الفاظ سن کر تلملا گئی۔ بولی۔ ''اگر میں جانتی کہ میری ناچیز خدمت کا صلہ اس طرح دیا جائے گا تو شاید ونے سنگھ کے نزدیک نہ جاتی۔ معاف کیجیے۔ مجھ سے سخت غلطی ہوئی کہ تمہارے پاس یہ شکایت لے کر آئی۔ سنا کرتی تھی کہ امراء کے مزاج میں تلون ہوتا ہے۔ آج اس کی تصدیق ہوگئی۔ لیجیے جاتی ہوں مگر اتنا کہے جاتی ہوں کہ خواہ پاپا میری صورت سے بھی بیزار ہو جائیں لیکن میں اس معاملہ میں ہرگز خاموش نہ بیٹھوں گی۔''

اندو: کچھ نرم ہو کر بولی۔ ''آخر تم راجہ صاحب سے کیا چاہتی ہو؟''

صوفیہ: کیا ثروت سے عقل بھی کم ہو جاتی ہے۔

اندو: میں پیادہ سے وزیر نہیں بنی ہوں۔

صوفیہ: افسوس کہ آپ نے اب تک میرا مطلب نہ سمجھا۔

اندو: افسوس کرنے سے تو مطلب میری سمجھ میں نہ آئے گا۔

صوفیہ: میں چاہتی ہوں کہ سورداس کی زمین اس کو لوٹا دی جائے۔

اندو: تم جانتی ہو۔ اس میں راجہ صاحب کی کتنی سبکی ہوگی۔

صوفیہ: بیکسی بے انصافی سے بہتر ہے۔

اندو: یہ بھی جانتی ہو کہ جو کچھ ہوا وہ تمہارے...... مسٹر کلارک کی ترغیب سے ہوا؟

صوفیہ: یہ تو نہیں جانتی کیونکہ اس بارے میں میری ان سے کبھی بات چیت نہیں ہوئی، لیکن جانتی بھی تو راجہ صاحب کی بدنامی کے خیال سے پہلے راجہ صاحب ہی سے منت سماجت کرنا ٹھیک سمجھتی۔ اپنی غلطی اپنے ہی ہاتھوں درست ہو جائے تو یہ اس سے کہیں بہتر ہے کہ کوئی دوسرا اسے درست کرے۔

اندو کو چوٹ لگی۔ سمجھی کہ یہ مجھے دھمکی دے رہی ہے۔ مسٹر کلارک کے بل پر اتنا گھمنڈ! تن کر بولی۔ ''میں نہیں سمجھتی کہ کسی سرکاری افسر کو بورڈ کے فیصلہ میں بھی دخل دینے کا مجاز ہے اور چاہے ایک غریب اندھے پر ظلم کیوں نہ کرنا پڑے۔ راجہ صاحب اپنے فیصلہ کو بحال رکھنے کے لیے کوئی بات اٹھا نہ رکھیں گے۔ حقیر انصاف کے مقابلہ میں راجہ کی عزت کہیں زیادہ وقعت کی چیز ہے۔''

صوفیہ نے دردناک لہجہ میں کہا۔ ''اسی حقیر انصاف کے لیے صدق پسند لوگوں نے سر کٹا دیے ہیں۔''

اندو نے کرسی کے بازو پر ہاتھ ٹیک کر کہا۔ ''انصاف کا سوانگ بھرنے کا زمانہ اب نہیں رہا۔''

صوفیہ نے کچھ جواب نہ دیا۔ اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی۔ ''اس تکلیف دہی کے لیے معاف فرمایئے گا۔''

اندو انگیٹھی کی آگ کو اکسانے لگی۔ اس نے صوفیہ کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

صوفیہ وہاں سے چلی تو اندو کی کج خلقی سے اس کا نازک دل زخمی ہو رہا تھا۔ سوچتی جاتی تھی کہ وہ شگفتہ رو، خلیق اور خوش مزاج اندو کہاں ہے؟ کیا دولت وثروت سے انسان کا مزاج بھی اتنا بگڑ جاتا ہے؟ میں نے تو آج تک اس کا دل دکھانے والی

بات نہیں کہی۔ کیا میں ہی کچھ اور ہو گئی ہوں یا وہی کچھ اور ہو گئی ہے؟ اس نے مجھ سے سیدھے منہ بات بھی نہیں کی۔ بات کرنا تو دور، اس نے اور صلواتیں سنائیں۔ میں اس پر کتنا اعتبار کرتی تھی۔ میں سمجھتی تھی کہ دیوی ہے۔ آج اس کی اصلی صورت نظر آئی، لیکن میں اس کی ثروت کے سامنے کیوں سر جھکاؤں۔ اس نے بلا سبب اور بلاواسطہ میری تحقیر کی۔ شاید رانی صاحب نے اس کے کان بھرے ہوں، لیکن شرافت بھی تو کوئی چیز ہے۔

صوفیہ نے اسی وقت اس توہین کا پورا بلکہ پورے سے بھی زیادہ بدلہ لینے کا تہیہ کر لیا۔ اس نے یہ خیال نہ کیا کہ ممکن ہے اس وقت کسی سبب سے اس کا دل مغموم رہا ہو یا کسی حادثہ کے باعث اس کے سکون میں فرق آ گیا ہو۔ اس نے سوچا۔ ایسی ناشائستگی، ایسی بدسلوکی کے لیے سخت سے سخت دماغی تکلیف، بڑے سے بڑے مالی نقصان، شدید سے شدید جسمانی درد کا عذر بھی کافی نہیں۔ اسے اپنی امارت کا غرور ہے۔ میں دکھا دوں گی کہ یہ آفتاب کی ذاتی روشنی نہیں بلکہ ماہتاب کی عارضی ضیا ہے۔ اس کو معلوم ہو جائے گا کہ راجہ اور رئیس سب کے سب حکمران قوت کے ہاتھوں کے کھلونے ہیں جنہیں وہ اپنی مرضی کے موافق بناتی یا بگاڑتی رہتی ہے۔

دوسرے ہی روز صوفیہ نے اپنی چال چلنا شروع کر دی۔ مسٹر کلارک سے اس کی محبت بڑھنے لگی۔ نفرت کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن گئی۔ اب ان کی محبت بھری باتوں کو سر جھکا کر سنتی۔ ان کی گردن میں ہاتھ ڈال کر کہتی کہ تم نے یہ محبت کرنا کس سے سیکھا؟ دونوں اب ہمیشہ ساتھ نظر آتے۔ صوفیہ دفتر میں بھی صاحب بہادر کا گلا نہ چھوڑتی بار بار خط بھیجتی۔ ''جلد آؤ۔ میں تمہاری راہ دیکھ رہی ہوں۔'' اور سارا عشق و محبت کا کھیل صرف اس لیے تھا کہ اندو سے ہتک کا انتقام لے سکوں۔ انصاف کوشی کا اب اس کو ذرا بھی خیال نہ تھا۔ وہ صرف اندو کو گھمنڈ توڑنا چاہتی تھی۔

ایک روز مسٹر کلارک کو پانڈے پور کی طرف سیر کرانے لے گئی۔ جب موٹر گودام

کے سامنے سے ہو کر گزری تو اس نے اینٹ اور کنکر ڈھیروں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''پاپا نہایت عجلت سے کام کر رہے ہیں۔''

کلارک: ہاں مستعد آدمی ہیں۔ مجھے تو ان کی محنت و جفاکشی پر رشک ہوتا ہے۔

صوفی: پاپا نے دھرم، ادھرم کا خیال نہیں کیا۔ کوئی مانے یا نہ مانے میں تو یہی کہوں گی کہ اندھے کے ساتھ بے انصافی ہوئی۔

کلارک: ہاں بے انصافی تو ہوئی۔ میرا جی تو بالکل نہ چاہتا تھا۔

صوفی: تو آپ نے کیوں اپنی منظوری دے دی۔

کلارک: کیا کرتا؟

صوفی: نامنظور کر دیتے۔ صاف لکھ دینا چاہیے کہ اس کام کے لیے کسی کی زمین ضبط نہیں کی جا سکتی۔

کلارک: تم ناراض ہو جاتیں؟

صوفی: ہرگز نہیں۔ آپ، آپ نے شاید مجھے اب تک نہیں پہچانا۔

کلارک: تمہارے پاپا تو ضرور ہی ناراض ہو جاتے۔

صوفی: میں اور پاپا ایک نہیں ہیں۔ میرے اور ان کے خیالات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

کلارک: اتنی عقل ہوتی تو اب تک تمہیں کب کا اپنا ہی بنا لیا ہوتا۔ میں تمہارے مزاج یا اصولوں سے واقف نہ تھا۔ میں نے سمجھا کہ شاید یہ منظوری میرے لیے نفع بخش ہو۔

صوفی: تو خلاصہ یہ کہ میں ہی اس ناانصافی کا سبب ہوں۔ راجہ صاحب نے مجھے خوش کرنے کے لیے بورڈ میں یہ تجویز پیش کی۔ آپ نے بھی مجھی کو خوش رکھنے کے لیے یہ منظوری دے دی۔ آپ صاحبوں نے میری مٹی ہی پلید کر دی۔

کلارک: تم میرے اصولوں سے واقف ہو۔ میں نے اپنے اوپر بہت جبر کر کے یہ

تجویز منظور کی ہے۔۔

صوفی: آپ نے اپنے اوپر جبر نہیں کیا ہے بلکہ میرے اوپر کیا ہے اور آپ کو اس کا کنارہ کرنا ہوگا۔

کلارک: میں نہ جانتا تھا کہ تم اتنی انصاف پسند ہو۔

صوفی: میری تعریف کر دینے سے اس گناہ کا کنارہ نہ ہوگا۔

کلارک: میں اندھے کو کسی دوسرے گاؤں میں اتنی ہی زمین دلا دوں گا۔

صوفی: کیا اسی کی زمین اسی کو واپس نہیں دی جا سکتی۔

کلارک: مشکل ہے۔

صوفیہ: ناممکن تو نہیں ہے۔

کلارک: ناممکن سے کچھ ہی کم ہے۔۔

صوفی: تو سمجھ گئی۔ ناممکن نہیں ہے۔ آپ کو یہ کنارہ کرنا ہی ہوگا۔ کل ہی اس تجویز کو منسوخ کر دیجیے۔

کلارک: پیاری تمہیں معلوم نہیں۔ اس کا کیا نتیجہ ہوگا۔

صوفیہ: مجھے اس کی فکر نہیں۔ پاپا کو برا لگے گا، لگے۔ راجہ صاحب کی سبکی ہوگی، ہو۔ میں کسی کے نفع یا عزت کے خیال سے اپنے اوپر گنہ کا بوجھ کیوں لوں؟ کیوں خدائی سزا کی مستوجب بنوں؟ آپ لوگوں نے میری مرضی کے خلاف میرے سر پر ایک گناہ عظیم کا بار رکھ دیا ہے۔ میں اسے برداشت نہیں کر سکتی۔ آپ کو اندھے کی زمین لوٹا دینی ہوگی۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ سید طاہر علی نے صوفیہ کو موٹر پر بیٹھے جاتے ہوئے دیکھا۔ فوراً آ کر سامنے کھڑے ہو گئے اور سلام کیا۔ صوفی نے موٹر روک کر پوچھا۔ ''کہیے منشی جی۔ عمارت بننے لگی؟''

طاہر: جی ہاں۔ کل داغ بیل پڑے گی، پر مجھے یہ بیل منڈھے چڑھتی نظر نہیں

آتی۔

صوفیہ: کیوں۔ کیا کوئی واردات ہوگئی؟

طاہر: حضور جب سے اس اندھے نے شہر میں آہ وفریاد شروع کی ہے، اس وقت سے عجیب مصیبت کا سامنا ہو گیا۔ محلّہ والے تو اب نہیں بولتے مگر شہر کے شہدے لچے روزانہ آ کر مجھے دھمکیاں دیتے ہیں۔ کوئی گھر میں آگ لگانے پر آمادہ ہوتا ہے۔ مجھے لوٹ لینے کو دوڑتا ہے اور کوئی مجھے مار ڈالنے کی دھمکی دیتا ہے۔ آج صبح کئی سو آدمی لاٹھیاں لیے آ گئے اور گودام کو گھیر لیا۔ کچھ لوگ سیمنٹ اور چونہ کے ڈھیروں کو بکھیرنے لگے اور کئی آدمی پتھر کی سلوں کو توڑنے لگے۔ میں تنہا کیا کر سکتا تھا۔ یہاں کے مزدور خوف کے مارے جان لے کر بھاگے۔ قیامت کا سامنا تھا۔ معلوم ہوتا تھا۔ اب آن کی آن میں محشر برپا ہو جائے گا۔ دروازہ بند کئے بیٹھا اللہ اللہ کر رہا تھا کہ کسی طرح یہ ہنگامہ فرو ہو۔ بارے دعا قبول ہوئی۔ عین اسی وقت وہ اندھا نہ جانے کدھر سے آ نکلا اور بجلی کی طرح کڑک کر بولا ''بھائیو! تم لوگ او دھم مچا کر مجھے کیوں کلنک لگا رہے ہو؟ آگ لگانے سے میرے دل کی آگ نہ بجھے گی۔ لہو بہانے سے میرا دل شانت نہ ہوگا۔ آپ لوگوں کی دعا سے یہ آگ اور یہ جلن شانت ہوگی۔ پرماتما سے کہیے میرا دکھ مٹائیں۔ بھگوان سے بنتی کیجیے میرا سنکٹ ہریں۔ جنہوں نے مجھ پر جلم (ظلم) کیا ہے، ان لوگوں کے دل میں دیا دھرم جاگے۔ بس میں آپ لوگوں سے اور کچھ نہیں چاہتا۔''

اتنا سنتے ہی کچھ لوگ تو ہٹ گئے مگر کتنے ہی لوگ بگڑ کر بولے۔ ''تم دیوتا ہو تو بنے رہو۔ ہم دیوتا نہیں ہیں۔ ہم تو جیسے کے ساتھ تیسا کریں گے۔ انہیں بھی تو غریبوں پر ظلم کرنے کا مزہ مل جائے۔'' یہ کہہ کر وہ لوگ پتھروں کو اٹھا کر پٹکنے لگے۔ اس وقت اس اندھے نے وہ کام کیا جو اولیا ہی کر سکتے ہیں۔ حضور مجھے تو یہ یقین کامل ہو گیا کہ یہ کوئی فرشتہ ہے۔ اس کی باتیں ابھی تک کانوں میں گونج رہی ہیں۔ اس کی

تصویر ابھی تک آنکھوں میں کھنچی ہوئی ہے۔ اس نے زمین سے ایک بڑا پتھر اٹھالیا اور اسے اپنی پیشانی کے سامنے رکھ کر بولا۔ "اگر تم لوگ اب بھی میری بنتی نہ سنو گے، تو اسی دم اس پتھر سے سر ٹکرا کر جان دے دوں گا۔ مجھے مر جانا منظور ہے، پر یہ اندھیر نہیں دیکھ سکتا۔" اس کے منہ سے ان الفاظ کا نکلنا تھا کہ چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ جو جہاں تھا وہ وہیں بت بن گیا۔ ذرا دیر میں لوگ آہستہ آہستہ رخصت ہونے لگے اور کوئی نصف گھنٹہ میں سارا مجمع غائب ہو گیا۔ پھر سورداس اٹھا اور لاٹھی ٹیکتا ہوا جدھر سے آیا تھا ادھر ہی چلا گیا۔ حضور مجھے تو پورا یقین ہے کہ وہ انسان نہیں۔ کوئی فرشتہ ہے۔"

صوفیہ: اس کو کسی سے ان مفسدوں کی یورش کی خبر مل گئی ہوگی۔

طاہر: حضور میرا تو قیاس ہے کہ اسے علم غیب ہے۔

صوفیہ: (مسکرا کر) آپ نے پاپا کو اس کی اطلاع نہیں دی؟

طاہر: حضور جب سے موقع ہی نہیں ملا۔ خود بال بچوں کو تنہا چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ آدمی سب پہلے ہی بھاگ گئے تھے۔ اسی فکر میں کھڑا تھا کہ حضور کی موٹر نظر آئی۔

کلارک: یہ اندھا ضرور کوئی غیر معمولی انسان ہے۔

صوفیہ: تم اس سے دو چار باتیں کر کے دیکھو۔ اس کے روحانی اور فلسفیانہ خیالات معلوم کر کے دنگ رہ جاؤ گے۔ فقیر بھی ہے اور فلسفی بھی۔ کاش ہم اس کے فلسفہ پر عمل کر سکتے تو یقیناً یہ زندگی آرام سے گزرتی۔ جاہل ہے۔ بالکل ان پڑھ، لیکن اس کا ایک ایک فقرہ علماء کی بڑی بڑی کتب سے زیادہ وزن دار ہے۔

موٹر چلی تو صوفیہ بولی: "آپ لوگ ایسے سادھوؤں پر بھی ظلم کرنے سے باز نہیں آتے جو اپنے دشمنوں پر ایک کنکر بھی اٹھا کر نہیں پھینکتا۔ حضرت یسوع میں بھی تو یہی بہترین صفت تھی۔"

کلارک: پیاری۔ اب شرمندہ نہ کرو۔ اس کی تلافی ضرور ہوگی۔

صوفیہ: راجہ صاحب اس کی پرزور مخالفت کریں گے۔

کلارک: اوہ۔ ان میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں ہے۔ وہ جو کچھ کرتے ہیں، ہمارا رخ دیکھ کر کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے انہیں کبھی ناکامی نہیں ہوتی۔ ہاں ان میں یہ خاص صفت ہے کہ وہ ہماری تجاویز میں کچھ ترمیم کرکے اپنا کام بنا لیتے ہیں اور انہیں عوام کے سامنے ایسی ہوشیاری سے پیش کرتے ہیں کہ عوام کی نگاہوں میں ان کی وقعت زیادہ ہو جاتی ہے۔ ہندوستانی رئیسوں اور مدبروں میں اپنے پر بھروسہ رکھنے والی قوت کی بہت کمی ہے۔ وہ ہماری مدد سے وہ کر سکتے ہیں جو ہم نہیں کر سکتے۔ مگر بلا ہماری مدد کے وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔

موٹر سگرا آ پہنچی۔ صوفیہ اتر پڑی۔ کلارک نے اسے محبت آمیز نگاہوں سے دیکھا۔ ہاتھ ملایا اور چلے گئے۔

(20)

مسٹر کلارک نے موٹر سے اترتے ہی اردلی کو حکم دیا کہ ڈپٹی صاحب کو فوراً ہمارا سلام دو۔ ناظر، اہلمد اور اہلکاروں کو بھی طلب کیا گیا۔ سب کے سب گھبرا گئے۔ یہ آج خلاف معمول طلبی کیسی؟ کسی غلطی کی گرفت تو نہیں کی گئی؟ کسی نے رشوت کی شکایت تو نہیں کر دی؟ بے چاروں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

ڈپٹی صاحب برہم ہو کر بولے۔ ''میں کوئی صاحب کا ذاتی ملازم نہیں ہوں کہ جب چاہا طلب کر لیا۔ کچہری کے وقت کے اندر جتنی بار چاہیں طلب کریں، لیکن یہ کون سی بات ہے کہ جب جی میں آیا سلام بھیج دیا۔'' ارادہ کیا کہ نہ جاؤں پر اتنی ہمت کہاں کہ صاف صاف انکار کر دیں۔ بیماری کا حیلہ کرنا چاہا مگر اردلی نے کہا۔ ''حضور اس وقت نہ چلیں گے تو صاحب سخت ناراض ہوں گے۔ کوئی بہت ضروری کام ہے۔ جبھی تو موٹر سے اترتے ہی آپ کو سلام دیا۔''

آخر ڈپٹی صاحب کو مجبوراً جانا پڑا۔ چھوٹے عملوں نے ذرا بھی چون و چرا نہ کیا۔

اردلی کی صورت دیکھتے ہی حقہ چھوڑا۔ چپکے سے کپڑے پہنے۔ بچوں کو دلاسا دیا اور حکم حاکم مرگ مفاجات سمجھ کر رواں دواں بنگلہ پر جا پہنچے۔ صاحب کے سامنے جاتے ہی ڈپٹی صاحب کا سارا غصہ کافور ہو گیا۔ اشاروں پر دوڑنے لگے۔ مسٹر کلارک نے سورداس کے زمین والے مقدمہ کی مسل منگوائی۔ اسے نہایت غور سے پڑھوا کر سنا۔ پھر ڈپٹی صاحب سے راجہ مہیندر کمار کے نام ایک پروانہ لکھایا جس کا مطلب یہ تھا۔ ''پانڈے پور میں سگریٹ کے کارخانہ کے لیے جو زمین لی گئی ہے وہ قانونی دفعہ کے منشاء کے خلاف ہے اس لیے میں اپنے حکم کو منسوخ کرتا ہوں۔ مجھے اس معاملہ میں دھوکا دیا گیا ہے اور ایک شخص کے ذاتی نفع کے لیے قانون کا ناجائز استعمال کیا گیا۔''

ڈپٹی صاحب نے دبی زبان سے اعتراض کیا۔ ''حضور۔ اب آپ کو اس حکم کے منسوخ کر دینے کا اختیار نہیں کیونکہ سرکار نے اس کی تصدیق کر دی ہے۔''

مسٹر کلارک نے یہ سخت لہجہ میں کہا۔ ''ہمیں سرکار ہیں۔ ہم نے وہ قانون بنایا ہے۔ ہم کو سب اختیار ہے۔ آپ ابھی راجہ صاحب کو پروانہ لکھ دیں۔ کل لوکل گورنمنٹ کو اس کی نقل بھیج دیجیے گا۔ ضلع کے مالک ہم ہیں۔ صوبہ کی سرکار نہیں۔ یہاں بلوہ ہو جائے گا تو ہم کو اس کا انتظام کرنا پڑے گا۔ صوبہ کی سرکار یہاں دوڑی نہ آئے گی۔''

عمال تھرا اٹھے۔ ڈپٹی صاحب کو دل میں کوسنے لگے۔ یہ کیوں خواہ مخواہ دخل دیتے ہیں۔ انگریز ہیں کہیں غصہ میں آ کر مار بیٹھے تو اس کا کیا ٹھکانا۔ ضلع کا بادشاہ ہے۔ جو چاہے کرے۔ ہم سے کیا واسطہ۔

ڈپٹی صاحب کا سینہ بھی دہل گیا۔ پھر زبان نہ کھلی۔ پروانہ تیار ہو گیا۔ صاحب نے اس پر دستخط کیے۔ اسی وقت ایک اردلی پروانہ لے کر راجہ صاحب کے پاس جا پہنچا۔ ڈپٹی یہاں سے اٹھے تو مسٹر جان سیوک کو اس حکم سے مطلع کر دیا۔

جان سیوک کھانا کھا رہے تھے۔ یہ خبر سنی تو بھوک غائب ہوگئی۔ بولے۔ ''یہ مسٹر کلارک کو کیا سوجھی؟'' مسز سیوک نے صوفیہ کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''تو نے انکار تو نہیں کر دیا؟ ضرور کچھ گول مال کیا ہے۔''

صوفیہ نے سر جھکا کر کہا۔ ''بس آپ کا غصہ مجھی پر رہتا ہے۔ جو کچھ کرتی ہوں میں ہی کرتی ہوں۔''

ایشور سیوک: خداوند یسوع! مجھ گناہ گار کو اپنے دامن میں چھپا! میں آخر تک منع کرتا رہا کہ بڑھے کی زمین نہ لو مگر کون سنتا ہے۔ دل میں کہتے ہوں گے کہ یہ تو سٹھیا گیا ہے مگر میں نے دنیا دیکھی ہے۔ راجہ ڈر کر کلارک کے پاس گیا ہوگا۔

پربھو سیوک: میرا بھی یہی خیال ہے۔ راجہ صاحب نے خود مسٹر کلارک سے کہا ہو گا۔ آج کل ان کا شہر میں نکلنا مشکل ہو رہا ہے۔ اندھے نے سارے شہر میں ہل چل مچا دی ہے۔

جان سیوک: میں سوچ رہا تھا کہ کل حفظ امن کے لیے پولیس کا دستہ مانگوں گا۔ ادھر یہ گل کھلا۔ کچھ عقل کام نہ کرتی کہ کیا بات ہوگئی۔

پربھو سیوک: میں تو سمجھتا ہوں ہمارے لیے اس زمین کو چھوڑ دینا ہی بہتر ہو گا۔ آج سورداس نہ پہنچ جاتا تو گودام کی خیریت نہ تھی۔ ہزاروں روپے کا سامان خراب ہو جاتا۔ یہ فساد رفع ہونے والا نہیں ہے۔

جان سیوک نے ان کا مضحکہ اڑاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں بہت اچھی بات ہے۔ ہم سب مل کر اس اندھے کے پاس چلیں اور اس کے قدموں پر سر جھکائیں۔ آج اس کے خوف سے زمین چھوڑ دوں۔ کل چمڑے کی آڑھت چھوڑ دوں اور اس کے بعد منہ چھپا کر یہاں سے کہیں چلا جاؤں۔ کیوں۔ یہی صلاح ہے نا؟ پھر امن ہی امن ہے۔ نہ کسی سے لڑائی نہ جھگڑا۔ یہ صلاح تمھیں مبارک ہو۔ دنیا امن کی جگہ نہیں بلکہ کارزار کی جگہ ہے۔ یہاں دلیروں اور بہادروں کی فتح ہوتی ہے۔ کمزور اور بزدل

مارے جاتے ہیں ۔مسٹر کلارک اور راجہ مہیندر کمار کی ہستی ہی کیا ہے ۔ساری دنیا بھی اب اس زمین کو میرے ہاتھوں سے نہیں چھین سکتی ۔ میں سارے شہر میں ہل چل مچا دوں گا اور ہندوستان بھر کو ہلا ڈالوں گا۔ حکام کی خودمختارانہ روش کی یہ مثال ملک کے سبھی اخباروں میں شائع ہوگی ۔کونسلوں اور مجلسوں میں ایک نہیں ہزار ہزار آوازوں کے ذریعہ مشتہر کی جائے گی اور اس کی گونج انگریزی پارلیمنٹ تک پہنچے گی ۔ یہ قومی حرفت اور تجارت کا سوال ہے ۔ اس معاملہ میں کل ہندوستان کے کارخانہ دار کیا ہندوستانی اور کیا انگریز میرے معاون و مددگار رہوں گے اور سرکار ایسی نافہم نہیں ہے کہ وہ کارخانہ داروں کی مشترکہ آواز پر کان بند کر لے ۔ یہ سرمایہ کی حکومت کا دور ہے ۔ یورپ میں بڑی بڑی سلطنتیں سرمایہ داروں کے اشاروں پر بنتی بگڑتی رہتی ہیں ۔کسی گورنمنٹ کی مجال نہیں کہ ان کی مرضی کے خلاف عمل کرے ۔تم نے مجھے سمجھا کیا ہے ۔میں وہ ملایم چارہ نہیں ہوں جسے کلارک اور مہیندر چر جائیں گے ۔''

پربھوسیوک تو ایسے سٹ پٹائے کہ پھر زبان نہ کھلی ۔ چپکے سے اٹھ کر چلے گئے ۔ صوفیہ بھی ایک لمحہ کے لیے سناٹے میں آ گئی ۔پھر سوچنے لگی اگر پاپا نے اس معاملہ میں کچھ تحریک کی بھی تو اس کا نتیجہ کہیں برسوں میں ظاہر ہوگا اور یہی کون کہہ سکتا ہے کہ اس کا کیا نتیجہ ہوگا۔ابھی سے اس کی کیوں فکر کروں ۔ اس کے گلابی ہونٹوں پر فاتحانہ غرور کی مسکراہٹ نمودار ہوئی ۔ اس وقت وہ اندو کے چہرے کا اڑا ہوا رنگ دیکھنے کے لیے اپنا سب کچھ نچھاور کر سکتی تھی ۔ ''کاش میں وہاں موجود ہوتی دیکھتی کہ اندو کے چہرے پر کیسی جھینپ ہے ۔خواہ ہمیشہ کے لیے قطع تعلق ہو جاتا مگر اتنا ضرور کہتی کہ دیکھا اپنے راجہ صاحب کا اقتدار و اختیار ۔بس اسی پر اتنا اتراتی تھیں؟ مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ کلارک اتنی عجلت کریں گے ۔''

کھانے سے فارغ ہو کر وہ اپنے کمرہ میں چلی گئی اور رانی اندو کی خفت کا خیال کر کے بے حد لطف اٹھانے لگی ۔ راجہ صاحب بدحواس، چہرے کا رنگ اڑا ہوا، آ کر اندو

کے پاس بیٹھ جائیں گے۔ اندو دیوی لفافہ دیکھیں گی۔ آنکھوں پر اعتبار نہ ہوگا۔ پھر روشنی تیز کر کے دیکھیں گی۔ تب راجہ کے آنسو پونچھیں گی۔ ''آپ ناحق اس قدر غمگین ہوتے ہیں۔ آپ اپنی طرف سے شہر میں منادی کرا دیجیے کہ ہم نے سورداس کی زمین سرکار سے لڑ کر واپس دلا دی۔ سارے شہر میں آپ کے انصاف کی دھوم مچ جائے گی۔ لوگ سمجھیں گے آپ نے رائے عامہ کی قدر کی ہے۔ خوشامدی ٹٹو کہیں کا! چال سے ولیم کو الو بنانا چاہتا تھا۔ ایسی منہ کی کھائی ہے کہ یاد ہی کرے گا۔ خیر آج نہ سہی کل، پرسوں، ترسوں کبھی تو اندو سے ملاقات ہوگی ہی۔ کہاں تک منہ چھپائیں گی؟ ''

یہ سوچتے سوچتے صوفیہ میز پر بیٹھ گئی اور اس واقعہ پر ایک ہنسی کا ڈراما لکھنے لگی۔ سمند فکر کے لیے حسد تازیانہ کا کام دیتا ہے۔ صوفیہ نے آج تک کبھی ایسا ڈراما نہ لکھا تھا مگر اس وقت حسد کے اثر سے اس نے ایک گھنٹہ کے اندر چار منظروں کا ایک مضحکہ انگیز ڈراما لکھ دیا۔ ایسی ایسی چوٹ کرنے والی اور دل میں چٹکیاں لینے والی پھبتیاں قلم سے نکلیں کہ اسے اپنے ذہن کی رسائی پر خود ہی متحیر ہونا پڑا۔ اسے ایک بار یہ خیال آیا کہ میں کیا حماقت کر رہی ہوں۔ فتح پا کر ہارے ہوئے دشمن کا منہ چڑانا پرلے سرے کا کمینہ پن ہے، لیکن حسد نے اس کو مطمئن کر دینے کے لیے دلیل ڈھونڈ نکالی۔ ایسے فریبی، دغاباز، عزت کے بھوکے رعایا کے دوست بن کر اس کے حلق پر چھری پھیرنے والے خوشامدی رئیسوں کی یہی سزا ہے۔ یہی ان کا واحد مصلح ہے۔ عوام الناس کی نگاہوں میں ذلیل ہو جانے کا خوف ہی انہیں راہ راست پر قائم رکھ سکتا ہے۔ رسوائی کا خوف نہ ہو تو وہ شیر ہو جائیں۔ اپنے سامنے کسی کو کچھ نہ سمجھیں۔

پربھو سیوک میٹھی نیند سو رہے تھے۔ آدھی رات گزر چکی تھی۔ یکا یک صوفیہ نے آ کر جگایا۔ وہ چونک کر اٹھ بیٹھے اور یہ سمجھ کر کہ شاید اس کے کمرہ میں چور گھس آئے

ہیں، دروازہ کی طرف دوڑے۔ گودام کا واقعہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ صوفیہ نے ہنستے ہوئے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور پوچھا۔ ''کہاں بھاگے جاتے ہو؟''

پربھو سیوک: کیا چور ہیں؟ لالٹین جلا لوں۔

صوفیہ: چور نہیں ہیں۔ ذرا میرے کمرہ میں چلو۔ تمہیں ایک چیز سناؤں۔ ابھی لکھی ہے؟

پربھو سیوک: واہ اتنی سی بات کے لیے نیند خراب کر دی۔ کیا پھر سویرا نہ ہوتا۔ کیا لکھا ہے؟

صوفیہ: ایک مضحکہ خیز ڈراما ہے۔

پربھو سیوک: مضحکہ خیز ڈراما؟ تم نے ایسا ڈراما لکھنے کی کب سے مشق کی؟

صوفیہ: آج ہی بہت ضبط کیا کہ صبح سناؤں گی پر نہ رہا گیا۔

پربھو سیوک صوفیہ کے کمرہ میں گئے اور ایک ہی لمحہ میں دونوں نے قہقہے لگانے شروع کیے۔ لکھتے وقت صوفیہ کو جن فقرات پر ذرا بھی ہنسی نہ آئی تھی، انہی کو پڑھتے وقت اس کی ہنسی روکے نہ رکتی تھی۔ جب کوئی ہنسانے والی بات آجاتی تو صوفی پہلے ہی ہنس پڑتی۔ پربھو سیوک منہ کھولے ہوئے اس کی طرف تاکتا۔ بات کچھ سمجھ میں نہ آتی مگر اس کی ہنسی پر وہ بھی ہنستا اور جونہی بات سمجھ میں آجاتی تو یہی ہنسی قہقہہ کی شکل اختیار کر لیتی۔ دونوں کے چہرے سرخ ہو گئے۔ آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے۔ یہاں تک کہ جبڑوں میں درد ہونے لگا۔ ڈراما کے ختم ہوتے ہوتے قہقہہ کی جگہ کھانسی نے لے لی۔ خیریت تھی کہ دروازے دونوں طرف سے بند تھے ورنہ رات کے سناٹے میں سارا بنگلہ ہل جاتا۔

پربھو سیوک: نام بھی خوب رکھا۔ راجہ مچھیندر سنگھ۔ مہیندر راو رمچھیندر کی تک ملتی ہے۔ پلپلی صاحب کے ہنٹر کھا کر مچھیندر سنگھ کا جھک جھک کر سلام کرنا خوب رہا۔ کہیں راجہ صاحب زہر نہ کھا لیں۔

صوفیہ: ایسا حیادار نہیں ہے۔

پربھو سیوک: تم ہنسی کے ناٹک لکھنے میں مشاق ہو۔

ذرا دیر بعد دونوں اپنے اپنے کمرہ میں سوئے۔ صوفیہ علی الصباح اٹھی اور مسٹر کلارک کا انتظار کرنے لگی اسے یقین تھا کہ وہ آتے ہی ہوں گے۔ ان کو ساری باتیں بالتفصیل معلوم ہوں گی۔ ابھی محض افواہ سنی ہے۔ ممکن ہے راجہ صاحب گھبرائے ہوئے ان کے پاس اپنا دکھڑا رونے کے لیے گئے ہوں، لیکن آٹھ بج گئے اور کلارک کا کہیں پتہ نہ تھا۔ وہ بھی تڑکے ہی آنے کو تیار تھے، پر آتے ہوئے شرماتے تھے کہ کہیں صوفیہ یہ نہ سمجھے کہ مجھ پر احسان جتانے آئے ہیں۔ اس سے زیادہ اس بات کا خوف تھا کہ وہاں لوگوں کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ یا تو مجھے دیکھ کر لوگ دل ہی دل میں جلیں گے یا کھلے الفاظ میں مجھے متہم کریں گے۔ سب سے زیادہ خوف ایشور سیوک کا تھا کہ کہیں کافر ملعون یا شقی نہ کہہ بیٹھیں۔ بزرگ آدمی ہیں۔ ان کی باتوں کا جواب ہی کیا۔ انہیں وجوہات سے وہ آتے ہوئے ہچکچاتے تھے اور دل میں دعا کر رہے تھے کہ صوفیہ ہی ادھر آ نکلے۔

نو بجے تک کلارک کا انتظار کرنے کے بعد صوفیہ بیتاب ہوگئی۔ ارادہ کیا کہ میں ہی چلوں۔ اسی وقت یکا یک مسٹر جان سیوک آ کر بیٹھ گئے اور صوفیہ کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھ کر بولے۔ ''صوفی! مجھے تم سے ایسی امید نہ تھی۔ تم نے میرے سارے منصوبے خاک میں ملا دیئے۔''

صوفیہ: میں نے! میں نے کیا کیا؟ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔

جان سیوک: میرا مطلب یہ ہے کہ تمہاری ہی ترغیب سے مسٹر کلارک نے اپنا پہلا حکم منسوخ کر دیا ہے۔

صوفیہ: آپ کو وہم ہے۔

جان سیوک: میں نے بلا ثبوت کے آج تک کسی پر الزام نہیں لگایا۔ میں ابھی اندو

دیوی سے مل کر آ رہا ہوں۔ انہوں نے اس کا ثبوت دیا کہ یہ تمہاری ہی کرتوت ہے۔

صوفیہ: آپ کو یقین ہے کہ اندو نے مجھ پر جو الزام لگایا ہے وہ صحیح ہے؟

جان سیوک: اس کو غلط سمجھنے کے لیے میرے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔

صوفیہ: اسے صحیح سمجھنے کے لیے اگر اندو کا کہنا کافی ہے تو اسے غلط سمجھنے کے لیے میرا کہنا کیوں کافی نہیں ہے؟

جان سیوک: سچ بات یقین کو پیدا کرتی ہے۔

صوفیہ: یہ میری بدقسمتی ہے کہ میں اپنی باتوں میں وہ نمک مرچ نہیں لگا سکتی، لیکن میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ اندو نے ہمارے اور ولیم کے درمیان میں مغائرت پیدا کرنے کے لیے یہ سوانگ رچایا ہے۔

جان سیوک نے شبہ میں پڑ کر کہا۔ ''صوفی! میری طرف دیکھ! کیا تو سچ کہہ رہی ہے؟''

صوفیہ نے لاکھ کوشش کی کہ اپنے والد کی طرف بے خوف آنکھوں سے دیکھے، لیکن اس کی آنکھیں خود بخود جھک گئیں۔ باطنی احساس زبان کو بگاڑ سکتا ہے مگر اعضاء پر اس کا زور نہیں چلتا۔ زبان چاہے خاموش ہو جائے مگر آنکھیں بولنے لگتی ہیں۔ مسٹر جان سیوک نے اس کی پر ندامت آنکھیں دیکھیں اور کبیدہ خاطر ہو کر بولے۔ ''آخر تم نے کیا سمجھ کر یہ کانٹے بوئے؟''

صوفیہ: آپ میرے ساتھ سخت ناانصافی کر رہے ہیں۔ آپ کو ولیم ہی سے یہ بات صاف کر لینی چاہیے۔ ہاں میں اتنا ضرور کہوں گی کہ تمام شہر میں بدنام ہونے کی بہ نسبت میں اس زمین کا آپ کے قبضہ سے نکل جانا کہیں بہتر خیال کرتی ہوں۔

جان سیوک: اچھا تو تم نے میری نیک نامی کے لیے یہ چال چلی ہے؟ میں تمہارا بہت ممنون ہوں، لیکن یہ خیال تمہیں بہت دیر بعد سوجھا۔ عیسائی قوم یہاں صرف

اپنے مذہب کے سبب اتنی بدنام ہے کہ اس سے زیادہ بدنام ہونا غیر ممکن ہے۔ عوام کا بس چلے تو آج ہمارے سارے گرجے مٹی کے ڈھیر بن جائیں۔ انگریزوں سے لوگوں کو اتنی چڑ نہیں ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ انگریزوں کا طرز معاشرت ان کے خیالات و اطوار سب ان کی ذاتی چیزیں ہیں۔ یعنی ان کے ملک وقوم کے ہیں، لیکن جب کوئی ہندوستانی خواہ وہ کسی مذہب کا ہو انگریزی وضع اختیار کرتا ہے تو لوگ اس کو بالکل گیا گزرا سمجھ لیتے ہیں۔ وہ نیکی و بدی کی بندشوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اس سے کسی کو بھلے کاموں کی امید نہیں ہوتی اور نہ اس کے برے کاموں پر کسی کو تعجب ہوتا ہے۔ میں یہ کبھی نہ مانوں گا کہ تم نے میری آبرو قائم رکھنے کے لیے یہ کوشش کی ہے۔ تمہارا مقصد صرف میرے تجارتی منصوبوں کو برباد کرنا ہے۔ مذہبی تحقیقات نے تمہاری عملی فراست کو ڈانواں ڈول کر دیا ہے۔ تمہیں اتنی سمجھ بھی نہیں ہے کہ نفس کشی اور فیض رسانی محض ایک معیار ہے۔ شعراء کے لیے، معتقدین کے دل بہلاؤ کے لیے اور ناصحوں کی تصاویر کو مزین کرنے کے لیے۔ مسیح، بدھ اور موسیٰ کے پیدا ہونے کا وقت اب نہیں رہا۔ دولت یا ثروت مطعون ہونے پر بھی انسانی خواہشات کی معراج ہے اور رہے گی۔ خدا کے لیے تم مجھ پر اپنے مذہبی اصولوں کو نہ آزماؤ۔ میں تم سے اخلاق اور مذہب کا سبق نہیں پڑھنا چاہتا۔ تم سمجھتی ہو کہ خدا نے عدل و راستی و رحم کا تمہیں کو اجارہ دار بنا دیا ہے اور دنیا میں جتنے اہل دولت و ثروت ہیں وہ سب کے سب بے انصاف، خودسر اور بے رحم ہیں لیکن مشیت ایزدی کی قائل ہو کر بھی تمہارا خیال ہے کہ دنیا میں نابرابری اور تفریق کا سبب صرف انسان کی خودغرضی ہے تو مجھے یہی کہنا پڑے گا کہ تم نے مذہبی کتب کا مطالعہ آنکھیں بند کر کے کیا ہے، ان کا مطلب نہیں سمجھا۔ تمہاری اس بدسلوکی سے مجھے جتنا رنج ہو رہا ہے، اسے بیان کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں اور گو میں ولی یا درویش نہیں ہوں لیکن یاد رکھنا کہ کبھی نہ کبھی تم کو اپنے والد سے دشمنی کرنے کا خمیازہ اٹھانا پڑے گا۔

''بددعا غصہ کی انتہائی حد ہے۔ اس کا پھل تم ایشور سے پاؤ گے۔'' یہ جملہ تیغ و سنان سے بھی زیادہ مہلک ہوتا ہے۔ جب ہم سمجھتے ہیں کہ کسی برے کام کی سزا دینے کے لیے دنیاوی طاقت کافی نہیں ہے۔ اس وقت ہم خدائی طاقت کو محرک کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سے کمتر کوئی سزا بھی ہمیں مطمئن نہیں کر سکتی۔

مسٹر جان سیوک اس طرح کوس کر اٹھ گئے، لیکن صوفیہ کو اس سخت کلامی سے ذرا بھی ملال نہ ہوا۔ اس نے اس قرض کو بھی اندو کے کھاتہ میں درج کر دیا اور اس کے جذبہ انتقام نے زیادہ خوفناک صورت اختیار کر لی۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ اس پر مذاق ڈراما کو آج ہی شائع کروں گی۔ اگر ایڈیٹر نے نہ چھاپا تو میں خود ہی کتابی صورت میں چھپواؤں گی اور عوام میں مفت تقسیم کروں گی۔ ایسی کالک لگ جائے کہ پھر کسی کو منہ نہ دکھا سکے۔

ایشور سیوک نے جان سیوک کی نا ملایم باتیں سنیں تو بہت ناراض ہوئے۔ مسز سیوک کو بھی یہ برتاؤ برا معلوم ہوا۔ ایشور سیوک نے کہا۔ ''نہ جانے تمہیں اپنے نفع نقصان کی تمیز کب ہوگی۔ بنی ہوئی بات کو نباہنا مشکل نہیں ہے، بگڑی ہوئی بات کو بنانا مشکل ہے۔ تمہیں اس موقع پر اس قدر صبر و سنجیدگی سے کام لینا تھا کہ جتنا نقصان ہو چکا ہے۔ اس کی تلافی ہو جائے۔ گھر کا ایک گوشہ گر پڑے تو سارا گھر گرا دینا عقل مندی نہیں ہے۔ زمین گئی تو کوئی ایسی تدبیر سوچو کہ اس پر پھر تمہارا قبضہ ہو، یہ نہیں کہ زمین کے ساتھ اپنی عزت و آبرو سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو۔ جا کر راجہ صاحب کو مسٹر کلارک کے فیصلہ کی اپیل کرنے پر آمادہ کرو اور مسٹر کلارک سے اپنا میل جول بدستور قائم رکھو۔ یہ سمجھ لو کہ ان سے تمہیں کوئی نقصان ہی نہیں پہنچا۔ صوفیہ کو برہم کر کے تم مسٹر کلارک کو خواہ مخواہ اپنا دشمن بنا رہے ہو۔ حکام تک رسائی رہے گی تو ایسی کتنی ہی زمینیں ملیں گی۔ یسوع مجھے اپنے دامن میں چھپا اور مشکل کو آسان کر۔''

مسز سیوک: میں تو اتنی منتوں سے اسے یہاں لائی اور تم سارے کیے دھرے پر

پانی پھیرے دیتے ہو۔

ایشور سیوک: خداوند۔ مجھے آسمان کی بادشاہت دے۔ اگر یہی مان لیا جائے کہ صوفی کے ایماء سے یہ بات ہوئی تو بھی ہمیں اس سے کوئی شکایت نہ ہونی چاہیے بلکہ میرے دل میں تو اس کی عزت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اسے خدا نے سچی روشنی عطا کی ہے۔ اس میں ایمان اور اعتقاد کی برکت ہے۔ اس نے جو کچھ کیا ہے اس کی تعریف نہ کرنا انصاف کا خون کرنا ہے۔ خداوند یسوع نے اپنے کو غریبوں اور بیکسوں پر نثار کر دیا تھا۔ بدقسمتی سے ہم لوگوں میں اتنا اعتقاد نہیں ہے۔ ہمیں اپنی خودغرضی پر نادم ہونا چاہیے۔ صوفیہ کے نیک ارادوں کی تحقیر کرنا بالکل مناسب نہیں ہے۔ گنہگار کسی فقیر کو دیکھ کر دل میں نادم ہوتا ہے۔ اس سے دشمنی نہیں کرتا۔

جان سیوک: یہ نہ اعتقاد ہے اور نہ ایمان بلکہ محض ضد اور نخوت ہے۔

ایشور سیوک نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ اپنی لکڑی ٹیکتے ہوئے صوفیہ کے کمرہ میں آئے اور بولے۔ ''بیٹی! میرے آنے سے تمہارا کوئی ہرج تو نہیں ہوا؟''

صوفیہ: نہیں نہیں آیئے بیٹھیے۔

ایشور سیوک: یسوع! اس گنہگار کو ایمان کی روشنی عطا کر! ابھی جان سیوک نے تمہیں بہت کچھ برا بھلا کہا ہے۔ انہیں معاف کرو۔ بیٹی دنیا میں خدا کی جگہ اپنا باپ ہی ہوتا ہے۔ اس کی باتوں کا برا نہ ماننا چاہیے۔ تمہارے اوپر خدا کا ہاتھ ہے۔ خدا کی برکت ہے۔ تمہارے والد کی ساری عمر خودپروری میں گزری ہے اور وہ ابھی تک اسی طرح گزر رہی ہے۔ خدا سے دعا کرو کہ اس کے دل کی تاریکی ایمان کی تجلی سے دور کرے۔ جن لوگوں نے ہمارے خداوند یسوع کو طرح طرح کی اذیتیں دی تھیں ان کے لیے خداوند نے کہا تھا کہ اے خدا انہیں معاف کر کیونکہ وہ نہیں جانتے کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔

صوفیہ: میں آپ سے سچ کہتی ہوں۔ مجھے پاپا کی باتوں کا ذرا بھی ملال نہیں ہے،

لیکن وہ مجھ پر غلط الزام لگاتے ہیں۔ اندو کی باتوں کے سامنے میری باتوں کو کچھ سمجھتے ہی نہیں۔

ایشور سیوک: بیٹی یہ ان کی غلطی ہے مگر تم اپنے دل سے انہیں معاف کر دو۔ دنیا داروں کو اس قدر مطعون کیا گیا۔ مگر انصاف کی نظر سے دیکھو تو وہ کتنے قابل رحم ہیں۔ آخر آدمی جو کچھ کرتا ہے، اپنے بال بچوں ہی کے لیے تو کرتا ہے۔ انہیں کے آرام و اطمینان کے لیے انہیں کو دنیا کی بدنظری سے بچانے کے لیے وہ تمام بدنامیوں اور رسوائیوں کو بخوشی برداشت کر لیتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنے ضمیر اور ایمان کو بھی قربان کر دیتا ہے۔ ایسی حالت میں جب وہ دیکھتا ہے کہ میں جن لوگوں کے فائدے کے لیے اپنا خون اور پسینہ ایک کر رہا ہوں، وہی مجھ سے مخالفت کر رہے ہیں، تو فطرتاً جھنجھلا اٹھتا ہے۔ اس وقت اسے حق و ناحق کی تمیز نہیں رہتی۔ دیکھو کلارک سے بھول کر بھی ان باتوں کا ذکر نہ کرنا ورنہ خواہ مخواہ دلوں میں کدورت پیدا ہو جائے گی۔ بولو وعدہ کرتی ہو؟

ایشور سیوک جب اٹھ کر چلے گئے تو پربھوسیوک نے آ کر پوچھا۔ ''وہ ڈراما کہاں بھیجا؟''

صوفیہ: ابھی تو کہیں نہیں بھیجا۔ کیا بھیج ہی دوں؟

پربھوسیوک: ضرور ضرور مزہ آ جائے گا۔ تمام شہر میں دھوم مچ جائے گی۔

صوفیہ: ذرا دو ایک روز اور دیکھ لوں۔

پربھوسیوک: نیک کام کے کرنے میں تاخیر نہ ہونی چاہیے۔ آج ہی بھیجو۔ میں نے بھی آج اپنی نظم ختم کر دی۔ سناؤں؟

صوفیہ: ہاں ہاں پڑھو۔

پربھوسیوک نے اپنی نظم سنانی شروع کی۔ ساری نظم رحم اور عفو کی جذبات سے لبریز تھی۔ مضمون اس قدر پر درد تھا کہ صوفیہ کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔

پربھو سیوک بھی رو رہے تھے۔ عفو و محبت کے جذبات ہر لفظ سے اسی طرح ٹپک رہے تھے جیسے آنکھوں سے آنسوؤں کی بوندیں۔ نظم ختم ہو گئی تو صوفیہ نے کہا۔ ''مجھے کبھی خیال بھی نہ ہو سکتا تھا کہ اس رنگ میں ایسا کمال دکھا سکتے ہو۔ جی چاہتا ہے تمہارا قلم چوم لوں۔ اف کتنا روحانی عفو ہے۔ برا نہ ماننا، تمہاری تصنیف تم سے بدرجہا بلند تر ہے۔ ایسے پاکیزہ ملائم اور پرجوش الفاظ تمہارے قلم سے کس طرح نکل آتے ہیں؟''

پربھو سیوک: اسی طرح جیسے اتنے مضحکہ خیز اور نخوت شکن جذبات کا اظہار تمہارے قلم سے ہوا۔ تمہاری تصنیف تم سے کہیں زیادہ پست ہے۔

صوفیہ: میں کیا اور میری تصنیف کیا۔ تمہارا ایک ایک شعر اس قابل ہے کہ اس پر دل نثار ہو جائے۔ بے شک عفو انسانی جذبات میں رفیع ترین جذبہ ہے۔ رحم کا درجہ اتنا بلند نہیں۔ رحم وہ دانہ ہے جو پولی کی زمین میں اگتا ہے۔ اس کے خلاف عفو وہ دانہ ہے جو خارزاروں میں اگتا ہے۔ رحم وہ چشمہ ہے جو ہموار زمین پر بہتا ہے۔ اس کے برعکس عفو کا چشمہ سنگریزوں اور چٹانوں پر بہتا ہے۔ رحم کا راستہ سیدھا اور آسان ہے اور عفو کا ٹیڑھا اور مشکل۔ تمہارا ایک ایک لفظ دل پر نقش ہو جاتا ہے۔ تعجب ہے کہ تم میں خود عفو کا نام و نشان بھی نہیں ہے۔

پربھو: صوفی! جذبات کے مقابلہ میں افعال کی کچھ وقعت نہیں ہے۔ شاعر کا عملی میدان محدود ہوتا ہے مگر جذباتی میدان وسیع اور لامحدود۔ اس آدمی کو حقیر نہ سمجھو جو ترک اور استغناء کا راگ الاپتا ہے مگر خود کوڑیوں پر جان دیتا ہو! ممکن ہے کہ اس کے الفاظ کسی بڑے گنہگار کے دل کو متاثر کر دیں۔

صوفیہ: جس کے قول و فعل میں اتنا فرق ہو، اسے کسی اور ہی نام سے پکارنا چاہیے۔

پربھو سیوک: نہیں صوفی یہ بات نہیں ہے۔ شاعر کے جذبات بتلاتے ہیں کہ اگر

اسے موقع ملتا تو وہ کیا کچھ ہوسکتا تھا۔ اگر وہ اپنے جذبات کی بلندی تک نہ پہنچ سکا تو اس کا سبب صرف یہ ہے کہ گردوپیش کے حالات اس کے موافق نہ تھے۔

کھانے کا وقت آ گیا۔ اس کے بعد صوفیہ نے ایشور سیوک کو بائبل سنانا شروع کیا۔ آج کی سی عجز و رضا جوئی اس نے کبھی نہ ظاہر کی تھی۔ ایشور سیوک کی مذہبی محویت نے ان کے ہوش و حواس کو مغلوب کر دیا تھا۔ خواب کی حالت میں ہو جانا ہی ان کی اندرونی بیداری تھی۔ کرسی پر لیٹے ہوئے وہ خراٹے لے لے کر خدائی کتاب کو سن رہے تھے، لیکن تعجب یہ تھا کہ پڑھنے والا انہیں سوتا ہوا سمجھ کر جوں ہی خاموش ہو جاتا تو وہ فوراً ہی بول اٹھتے۔ ''ہاں ہاں پڑھو۔ چپ کیوں ہو؟ میں سن تو رہا ہوں۔''

صوفیہ کو بائبل پڑھتے پڑھتے شام ہو گئی تو اس کا گلا چھوٹا۔ ایشور سیوک باغ میں ٹہلنے چلے گئے اور پربھو سیوک کو صوفی سے گپ شپ کرنے کا موقع ملا۔

صوفیہ: بڑے پاپا ایک بار پکڑ پاتے ہیں تو پھر گلا نہیں چھوڑتے۔

پربھو سیوک: مجھ سے کبھی بائبل پڑھنے کو نہیں کہتے۔ مجھ سے تو ایک لمحہ بھی وہاں نہ بیٹھا جائے۔ تم نہ جانے کیسے بیٹھی پڑھتی رہتی ہو؟

صوفیہ: کیا کروں ان پر رحم آتا ہے۔

پربھو سیوک: بنا ہوا ہے۔ مطلب کی بات پر کبھی نہیں چوکتا۔ یہ ساری عقیدت صرف دکھاوا ہے۔

صوفیہ: یہ تمہاری بے انصافی ہے۔ ان میں اور چاہے کوئی وصف نہ ہو، لیکن یسوع پر ان کا زبردست اعتقاد ہے چلو کہیں گھومنے چلتے ہو؟

پربھو سیوک: کہاں چلو گی؟ چلو یہیں حوض کے کنارے بیٹھ کر کچھ شعر و شاعری کی چرچا کریں۔ مجھے تو اس سے زیادہ لطف اور کسی بات میں نہیں آتا۔

صوفیہ: چلو پانڈے پور کی طرف چلیں۔ کہیں سورداس مل گیا تو اسے یہ خبر سنائیں گے۔

پربھوسیوک: پھولا نہ سمائے گا۔ اچھل پڑے گا۔

صوفیہ: ذرا شبہ پا جائے تو اس راجہ کو شہر سے بھگا کر ہی چھوڑے۔

دونوں نے سڑک پر جا کر ایک تانگہ کرایہ پر کیا اور پانڈے پور کی طرف روانہ ہوئے۔ آفتاب غروب ہو گیا تھا۔ کچہری کے عملے بغل میں بستہ دبائے مردہ دلی اور خود غرضی کا مجسمہ بنے ہوئے چلے آ رہے تھے۔ بنگلوں میں ٹینس ہو رہا تھا۔ شہر کے شہدے دین و دنیا سے بے خبر تمبولیوں کی دکانوں پر جمع تھے۔ بنیوں کی دکانوں پر مزدوروں کی عورتیں کھانے کا سامان خرید رہی تھیں۔ تانگہ برنا ندی کے پل پر پہنچا کہ یکا یک آدمیوں کا ایک ہجوم نظر آیا۔ سورداس کھنجری بجا کر گا رہا تھا۔ صوفیہ نے تانگہ روک دیا اور تانگہ والے سے کہا۔ ''جا اس اندھے کو بلا لا۔''

ایک لمحہ میں سورداس لاٹھی ٹیکتا ہوا آیا اور سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

صوفیہ: مجھے پہچانتے ہو سورداس؟

سورداس: ہاں بھلا حجور ہی کو نہ پہچانوں گا۔

صوفیہ: تم نے ہم لوگوں کو سارے شہر میں خوب بدنام کیا۔

سورداس: پھریاد کرنے کے سوا میرے پاس اور کون بل تھا؟

صوفیہ: فریاد کا نتیجہ نکلا؟

سورداس: میری منشا پوری ہو گئی۔ حاکموں نے میری دھرتی مجھے دے دی۔ ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی کام تن من سے کیا جائے اور اس کا کوئی پھل نہ ہو۔ تپسیا سے تو بھگوان مل جاتے ہیں۔ بڑے صاحب کے اردلی نے کل رات ہی مجھے یہ حال کہہ سنایا۔ آج پانچ براہمنوں کو بھوجن کرایا ہے۔ کل گھر چلا جاؤں گا۔

پربھوسیوک: مس صاحبہ ہی نے بڑے صاحب سے کہہ سن کر تمہاری زمین دلوائی ہے۔ ان کے والد اور راجہ صاحب دونوں ہی ان سے ناراض ہو گئے ہیں۔ ان کی تمہارے اوپر بڑی مہربانی ہے۔

صوفیہ: پربھو! تم پیٹ کے بڑے ہلکے ہو۔ یہ کہنے سے کیا فائدہ کہ مس صاحب ہی نے زمین دلوائی ہے۔ یہ تو کوئی بڑا کام نہیں ہے۔

سورداس: صاحب یہ تو میں اسی دن جان گیا تھا جب مس صاحب سے پہلے پہل باتیں ہوئی تھیں۔ مجھے اسی دن معلوم ہو گیا تھا کہ ان کے چت میں دیا اور دھرم ہے۔ اس کا پھل بھگوان ان کو دیں گے۔

صوفیہ: سورداس یہ میری سفارش کا پھل نہیں۔ تمہاری تپسیا کا پھل ہے۔ راجہ صاحب کو تم نے خوب جھکایا اب تھوڑی سی کسر اور ہے ایسا بدنام کر دو کہ شہر میں منہ دکھانے لائق نہ رہیں۔ استعفے دے کر اپنے علاقہ کی راہ لیں۔

سورداس: نہیں مس صاحب یہ کھلاڑیوں کی نیت نہیں ہے۔ کھلاڑی جیت کر ہارنے والے کھلاڑی کی ہنسی نہیں اڑاتا۔ اس سے گلے ملتا ہے اور ہاتھ جوڑ کر کہتا ہے۔ بھیا! اگر ہم نے کھیل میں تم سے کوئی انوچت (نامناسب) بات کہی ہو یا کوئی ایسا برتاؤ کیا ہو تو ہمیں ماپھ (معاف) کرنا۔ اس طرح دونوں کھلاڑی ہنس کر الگ ہوتے ہیں۔ کھیل سماپت (ختم) ہوتے ہی دونوں متر (دوست) بن جاتے ہیں۔ اس میں کوئی کپٹ نہیں رہتا۔ میں آج راجہ صاحب کے پاس گیا تھا اور ان سے ہاتھ جوڑ آیا۔ انہوں نے مجھے بھوجن کرایا۔ جب چلنے لگا تو بولے میرا دل تمہاری طرف سے صاف ہے کہ سنکا (اندیشہ) نہ کرنا۔

صوفیہ: ایسے صاف دل تو نہیں ہیں۔ موقع پا کر ضرور دغا کریں گے۔ میں تم سے کہے دیتی ہوں۔

سورداس: نہیں مس صاحب ایسا مت کہیے۔ کسی پر سنکا کرنے سے اپنا چت (دل) ملین (مکدر) ہوتا ہے۔ وہ بدوان (عالم) ہیں۔ دھرماتما ہیں۔ کبھی دغا نہیں کر سکتے۔ اور جو کریں گے تو انہی کا دھرم جائے گا۔ میں پھر اسی طرح فریاد کرتا پھروں گا۔ جس بھگوان نے اب کی سنا ہے، وہی بھگوان پھر سنیں گے۔

پربھوسیوک: اور جو کوئی معاملہ کھڑا کر کے قید کرا دیا تو؟

سورداس: (ہنس کر) اس کا پھل انہیں بھگوان سے ملے گا۔ میرا دھرم تو یہی ہے کہ جب کوئی میری چیز پر ہاتھ بڑھائے تو اس کا ہاتھ پکڑ لوں۔ وہ لڑے تو لڑوں اور اس چیز کے لیے جان تک دے دوں۔ چیز میرے ہاتھ آئے گی، اس سے مجھے مطلب نہیں۔ میرا کام تو لڑنا ہے اور وہ بھی دھرم کی لڑائی لڑنا۔ اگر راجہ صاحب دگا (دغا) بھی کریں گے تو میں ان سے دگا نہ کروں گا۔

صوفیہ: لیکن میں تو راجہ صاحب کو اتنے سستے نہ چھوڑوں گی۔

سورداس: مس صاحب۔ آپ ودوان ہو کر ایسی باتیں کرتی ہو۔ مجھے اچرج (تعجب) ہوتا ہے۔ آپ کے منہ سے یہ باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ نہیں آپ ہنسی کر رہی ہیں۔ آپ سے کبھی ایسا کام نہیں ہوسکتا۔

اتنے میں کسی نے پکارا۔ ''سورداس چلو! برہمن آ گئے ہیں۔''

سورداس لاٹھی ٹیکتا ہوا گھاٹ کی طرف چلا۔ تانگہ بھی چلا۔ پربھوسیوک نے کہا۔ ''چلو گی مسٹر کلارک کی طرف؟''

صوفیہ: نہیں گھر چلو۔

راستہ میں کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ صوفیہ کسی خیال میں محو تھی۔ دونوں سگرا پہنچے تو چراغ جل چکے تھے۔ صوفیہ سیدھی اپنے کمرہ میں گئی۔ میز کی دراز کھولی، فارس (ظرافت آمیز ڈراما) کا مسودہ نکالا اور اسے پرزہ پرزہ کر کے زمین پر پھینک دیا۔

(21)

سورداس کی آہ و فریاد نے راجہ مہیندر کمار کی ناموری اور عزت کو خاک میں ملا دیا۔ وہ آسمان سے باتیں کرنے والا شہرت کا محل آن کی آن میں مسمار ہو گیا۔ اہل شہر ان کی خدمات کو بھول گئے۔ ان کی مساعی سے شہر کو کتنا نفع پہنچا تھا۔ اس کی یاد کسی کو نہ رہی۔ شہر کی نالیاں اور سڑکیں، باغیچے اور گلی کوچے ان کی مسلسل کوششوں کے

کتنے رہینِ منت تھے۔ شہر کی صحت اور تعلیم کو انہوں نے کس گری ہوئی حالت سے اٹھا کر شاہراہ ترقی پر پہنچایا تھا۔ اس کی طرف کوئی دھیان ہی نہ دیتا تھا۔ دیکھتے دیکھتے ایک انقلاب عظیم برپا ہو گیا۔ لوگ ان پر رائے زنی کرتے ہوئے کہتے۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا جب راجے رئیسوں کے نام عزت کے ساتھ لیے جاتے تھے۔ عوام کو خود ہی ان سے عقیدت ہوتی تھی۔ وہ دن رخصت ہو گئے۔ ثروت پرستی زمانہ قدیم کی شاہ پرستی ہی کا ایک جزو تھی۔ رعایا اپنے راجہ جاگیردار یہاں تک کہ اپنے زمیندار پر جان نثار کر دیتی تھی۔ یہ ایک مسلمہ اصول سیاست تھا کہ رعایا بادشاہ کے آرام و آسائش کے لیے ہے۔ دنیا میں یہی رواج تھا، لیکن آج بادشاہ اور رعایا میں وہ تعلق نہیں رہا۔ آج ان میں خادم و مخدوم کا رشتہ ہے۔ اب اگر کسی بادشاہ کی عزت ہے تو خدمتی اعتبار سے، ورنہ اس کی حالت دانتوں کے نیچے دبی ہوئی زبان کی سی ہے۔ رعایا کو اس پر کبھی اعتماد نہیں ہوتا۔ اب تو اسی بادشاہ کی عزت ہوتی ہے جس نے اپنا سب کچھ رعایا پر نثار کر دیا ہو۔ جو فقر کی دولت سے مالا مال ہو۔ جب تک کوئی خدمت کے راستہ پر چلنا نہیں سیکھتا عوام کے دلوں میں جگہ نہیں پاتا۔

راجہ صاحب کو اب معلوم ہوا کہ شہرت اس سفید کپڑے کی طرح ہے جس پر ایک دھبہ بھی نہیں چھپ سکتا۔ جس طرف ان کی موٹر نکل جاتی، لوگ ان پر آوازے کستے۔ یہاں تک کہ اکثر تالیاں بھی بجتیں۔ بے چارے بڑی مصیبت میں مبتلا تھے۔ شہرت حاصل کرنے چلے تھے۔ عزت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے اور موقعوں پر اندو سے مشورہ کر لیا کرتے تھے۔ اس سے دل کو ڈھارس ہوتی تھی، لیکن اب وہ دروازہ بھی بند تھا۔ اندو سے ہمدردی کی کوئی امید نہ تھی۔

رات کے نو بجے تھے۔ راجہ صاحب اپنے دیوان خانہ میں بیٹھے ہوئے اس طرح سوچ رہے تھے۔ لوگ کتنے احسان فراموش ہوتے ہیں۔ میں نے اپنی زندگی کے متواتر سات سال ان کی خدمت میں صرف کر دیئے۔ اپنا کتنا وقت، کتنا تجربہ، کتنا

آرام ان کی نذر کیا۔ اس کا مجھے آج یہ صلہ مل رہا ہے کہ ایک اندھا بھکاری مجھے سارے شہر میں گالیاں دیتا پھرتا ہے اور کوئی اس کی زبان نہیں پکڑتا بلکہ لوگ اسے اور بھی اکساتے اور بڑھاوا دیتے ہیں۔ اس قدر باقاعدگی سے اپنے علاقہ کا انتظام کرتا تو اب تک نکاسی میں لاکھوں روپوں کا اضافہ ہو گیا ہوتا۔ ایک دن وہ تھا کہ جدھر سے نکل جاتا تھا لوگ کھڑے ہو ہو کر سلام کرتے تھے۔ جلسوں میں میری تقریریں سننے کے لیے بے قرار رہتے تھے اور مجھے اخیر میں بولنے کا موقع دیا جاتا تھا۔ اب ایک دن یہ ہے کہ مجھ پر تالیاں بجائی جاتی ہیں اور میرا سوانگ نکالنے کی تیاریاں ہوتی ہیں۔ اندھے میں پھر بھی تمیز ہے۔ ورنہ بنارس کے شہدے دن دہاڑے میرا گھر لوٹ لیتے۔

دفعتاً اردلی نے آ کر مسٹر کلارک کا حکم نامہ ان کے سامنے رکھ دیا۔ راجہ صاحب نے چونک کر لفافہ کھولا تو ششدر ہو گئے۔ مصیبت پر مصیبت! رہی سہی عزت بھی خاک میں مل گئی۔

چپڑاسی: حضور کچھ جواب دیں گے؟

راجہ صاحب: جواب کی ضرورت نہیں۔

چپڑاسی: کچھ انعام نہیں ملا۔ حضور ہی.........

راجہ صاحب نے اسے اور کچھ نہ کہنے دیا۔ جیب سے ایک روپیہ نکال کر پھینک دیا۔ اردلی چلا گیا۔

راجہ صاحب سوچنے لگے۔ پاجی کو انعام مانگتے شرم بھی نہیں آتی۔ گویا میرے نام کوئی سپاسنامہ لایا ہے۔ کتے ہیں اور کیا۔ کچھ نہ دو تو کاٹنے دوڑیں۔ جھوٹی سچی شکایتیں کریں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کلارک نے کیوں اپنا حکم منسوخ کر دیا۔ جان سیوک سے کسی بات پر ان بن ہو گئی کیا؟ شاید صوفیہ نے کلارک کو ٹھکرا دیا۔ چلو یہ بھی اچھا ہی ہوا۔ لوگ یہ تو کہیں گے کہ اندھے نے راجہ صاحب کو نیچا دکھا دیا۔ پر اس کا

دوہائی سے تو گلا چھوٹے گا۔

اس وقت ان کی حالت اس آدمی کی سی تھی جو اپنے منہ زور گھوڑے کے بھاگ جانے پر خوش ہو۔ اب ہڈیوں کے ٹوٹنے کا خوف تو نہیں رہا۔ میں گھاٹا میں نہیں ہوں۔ اب تو روٹھی رانی بھی خوش ہو جائیں گی۔ اندو سے کہوں گا کہ میں نے ہی مسٹر کلارک سے اپنا فیصلہ منسوخ کرنے کے لیے کہا ہے۔

وہ کئی روز سے اندو سے ملنے نہ گئے تھے۔ اندر جاتے ہوئے ڈرتے تھے کہ اندو کے طعنوں کا کیا جواب دوں گا۔ اندو بھی اس خوف سے ان کے پاس نہ آتی تھی کہ مبادا میری زبان سے کوئی ناخوشگوار لفظ پھر نکل جائے۔ ہر باہمی قضیہ کے بعد جب وہ اس کے اسباب پر ٹھنڈے دل سے غور کرتی تھی تو اسے معلوم ہوتا تھا کہ میں ہی خطاوار ہوں اور اپنی خودسری پر اسے دلی ملال ہوتا تھا۔ اس کی ماں نے بچپن ہی سے شوہر پرستی کا بلند معیار اس کے سامنے رکھا تھا۔ اس معیار سے گرنے پر وہ دل ہی دل میں کڑھتی اور اپنے کو ملامت کرتی تھی۔ میرا فرض ان کے حکم کی تعمیل کرنا ہے۔ مجھے تن من سے ان کی سیوا کرنی چاہیے۔ میرا اولین فرض ان کے متعلق ہے۔ ملک و قوم کا درجہ ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ مگر میری نحوست بار بار مجھے فرض کے راستہ سے ہٹا دیتی ہے۔ میں اس اندھے کے پیچھے خواہ مخواہ الجھ پڑی۔ وہ عالم ہیں اور دور اندیش۔ یہ میری گستاخی ہے کہ میں ان کی رہنمائی کا دعویٰ کرتی ہوں۔ جب میں ذرا ذرا سی باتوں پر اپنی خودداری کا لحاظ کرتی ہوں تو ان سے کیسے امید کروں کہ ہر معاملہ میں بے لوث رہیں؟

کئی روز تک دل میں اس طرح سوچتے رہنے کے سبب اس کو سورداس سے چڑ سی ہو گئی۔ اس نے خیال کیا کہ اسی کمبخت کی وجہ سے میں اس عذاب میں مبتلا ہوں۔ اسی نے ہمارے درمیان مغائرت پیدا کر دی ہے۔ آخر اس زمین سے محلّہ والوں ہی کو فائدہ پہنچتا ہے نا۔ تو جب انہیں کوئی اعتراض نہیں ہے تو اس اندھے کی کیوں نانی

مرتی ہے۔ کسی کی زمین پر کوئی جبراً کیوں قبضہ کرے۔ یہ صرف ڈھکوسلا ہے۔ اور کچھ نہیں۔ کمزور لوگ تو ابتدائے زمانہ سے ستائے جاتے رہے ہیں اور ستائے جاتے رہیں گے۔ جب یہ عالمگیر رواج ہے تو پھر کیا ایک کم اور کیا ایک زیادہ۔

انہیں دنوں میں جب سورداس نے راجہ صاحب کو شہر میں بدنام کرنا شروع کیا تو اس کی محبت کا پلہ نہایت تیزی سے دوسری طرف جھکا۔ اسے سورداس کے نام سے چڑ ہو گئی۔ یہ ٹکے کا آدمی اور اس کی اتنی جرأت کہ ہم لوگوں کے سر چڑھے۔ اگر جمہوریت کے یہی معنی ہیں تو ایشور ہمیں اس سے بچائے۔ یہ زمانہ کا انقلاب ہے ورنہ اس کی کیا مجال تھی کہ ہمارے اوپر اس طرح چھینٹے اڑاتا۔

اندو غریبوں پر رحم کر سکتی تھی مگر ان کے ساتھ انصاف نہ کر سکتی تھی۔ رحم میں فضیلت کی شان ہے اور انصاف میں جمہوریت کا جذبہ۔ وہ سوچتی کہ یہ اس بدمعاش کو پولیس کے حوالہ کیوں نہیں کر دیتے؟ مجھ سے تو یہ ذلت نہ برداشت ہوتی۔ نتیجہ خواہ کچھ ہوتا مگر اس وقت تو ایسی بری طرح پیش آتی کہ دیکھنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔

وہ اسی قسم کے برے خیالات میں غرق تھی کہ صوفیہ نے جا کر اس کے سامنے راجہ پر سورداس کے ساتھ بے انصافی کرنے کا اتہام لگایا۔ کھلی ہوئی دھمکی دی گئی۔ اندو کو اتنا غصہ آیا کہ سورداس کو پاتی تو اس کا منہ نوچ لیتی۔ صوفیہ کے چلے جانے پر وہ غصہ میں بھری ہوئی راجہ صاحب کے پاس پہنچی مگر معلوم ہوا کہ وہ چند روز کے لیے علاقہ پر گئے ہوئے ہیں۔ یہ دن اس نے بڑی بے چینی سے گزارے۔ افسوس ہوا کہ چلے گئے اور مجھ سے پوچھا تک نہیں۔

راجہ صاحب علاقہ سے لوٹے تو انہیں مسٹر کلارک کا حکم نامہ ملا۔ وہ اس پر غور کر رہے تھے کہ اندو ان کے پاس گئی اور بولی۔ ''علاقہ پر گئے اور مجھے خبر تک نہ ہوئی۔ گویا میں گھر ہی میں نہیں ہوں۔''

راجہ نے نادم ہو کر کہا۔ ''ایسا ہی ضروری کام تھا۔ ایک دن کی بھی دیر ہو جاتی تو علاقہ میں فوجداری ہو جاتی۔ مجھے اب تجربہ ہو رہا ہے کہ تعلقداروں کے اپنے علاقہ جات میں نہ رہنے سے کتنی تکلیف ہوتی ہے۔''

اندو: علاقہ میں رہتے تو کم سے کم اتنی بدنامی تو نہ ہوتی۔

راجہ صاحب: اچھا تمہیں بھی معلوم ہو گیا۔ تمہارا کہنا نہ مانا۔ مجھ سے بڑی غلطی ہوئی۔ اس اندھے نے ایسے مخمصے میں ڈال دیا ہے کہ کچھ کرتے دھرتے نہیں بنتا۔ سارے شہر میں بدنام کر رہا ہے۔ نہ جانے شہر کے باشندوں کو اس سے اتنی ہمدردی کیسے ہو گئی۔ مجھے مطلقاً گمان نہ تھا کہ یہ شہر والوں کو میری مخالفت پر آمادہ کرے گا۔

اندو: میں نے تو جب سے سنا ہے کہ اندھا تمہیں بدنام کر رہا ہے تب سے ایسا غصہ آ رہا ہے کہ میرا بس چلے تو اسے زندہ درگور کر دوں۔

راجہ صاحب نے خوش ہو کر کہا۔ ''تو ہم دونوں گھوم گھام کر ایک ہی جگہ آ پہنچے۔''

اندو: اس بدمعاش کو ایسی سزا دینی چاہیے کہ عمر بھر یاد کرے۔

راجہ صاحب: مسٹر کلارک نے اس کا فیصلہ خود ہی کر دیا۔ سورداس کی زمین واپس کر دی گئی۔

اندو کو ایسا معلوم ہوا کہ پیروں تلے کی زمین دھنس رہی ہے اور اس کے ساتھ وہ بھی۔ وہ دیوار کا سہارا نہ لیتی تو یقیناً گر پڑتی۔ صوفیہ نے مجھے اس طرح ذلیل کیا ہے۔ میرے ساتھ یہ چال چلی ہے۔ ہماری عزت کو خاک میں ملانا چاہتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ میں اس کے قدم چوموں۔ یہ ہرگز نہ ہوگا۔

اندو نے راجہ صاحب سے کہا۔ ''اب آپ کیا کریں گے؟''

راجہ صاحب: کچھ نہیں۔ کرنا کیا ہے؟ سچ پوچھو تو مجھ کو اس کا ذرا بھی ملال نہیں۔ میری تو گلو خلاصی ہو گئی۔

اندو: اور سبکی کتنی ہوئی۔

راجہ صاحب: ہتکی ضرور ہوئی مگر اس بدنامی سے بہتر ہے۔

اندو کا چہرہ غرور سے تمتما اٹھا۔ بولی۔ ''یہ بات آپ کے لیے زیبا نہیں۔ یہاں نیک نامی یا بدنامی کا سوال نہیں ہے بلکہ اپنے وقار کو قائم رکھنے کا سوال ہے۔ آپ کے خاندانی وقار پر ضرب لگائی گئی ہے۔ اس کی حفاظت کرنا آپ کا خاص فرض ہے۔ خواہ اس کے لیے عدل و انصاف کے اصولوں کا گلا ہی کیوں نہ گھونٹنا پڑے۔ مسٹر کلارک کی ہستی ہی کیا ہے۔ میں کسی شاہنشاہ کے ہاتھوں سے بھی اپنے وقار کی بربادی نہ ہونے دوں گی۔ خواہ اس کے لیے مجھے اپنا سب کچھ حتیٰ کہ جان بھی دے دینی پڑے۔ آپ جلد ہی گورنر کو مسٹر کلارک کی نامنصفانہ مداخلت کی اطلاع دیجیے۔ ہمارے بزرگوں نے اس وقت انگریزوں کی حفاظت کی تھی جب ان کو جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ گورنمنٹ ان احسانات کو نظر انداز نہیں کرسکتی۔ نہیں تو آپ خود ہی جا کر گورنر سے ملیے۔ ان سے کہیے کہ مسٹر کلارک کے دخل درمعقولات سے میری سراسر توہین ہوگی۔ میں عوام کی نگاہوں میں ذلیل ہو جاؤں گا اور تعلیم یافتہ جماعت کو گورنمنٹ پر ذرا بھی اعتبار نہ رہے گا۔ آپ دکھلادیں کہ رئیس کی توہین کرنا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے۔''

راجہ صاحب نے تشویش ناک لہجہ میں کہا۔ ''مسٹر کلارک سے ہمیشہ کے لیے دشمنی ہو جائے گی۔ مجھے امید نہیں ہے کہ ان کے مقابلہ میں گورنر میرا ساتھ دے۔ تم ان لوگوں کو جانتی نہیں ہو۔ ان کی افسری یا ماتحتی محض دکھانے کے لیے ہے۔ اصل میں سبھی ایک ہیں۔ ایک جو کرتا ہے۔ سب اس کی تائید کرتے ہیں۔ اب آگے بڑھنا بے فائدہ پریشان ہونا ہے۔''

اندو: اگر گورنر نہ سنے تو گورنر جنرل کے یہاں اپیل کیجیے۔ ولایت جا کر وہاں کے لیڈروں سے ملیے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ آپ کے سر پر ایک اہم ترین ذمہ داری کا بار آپڑا ہے۔ اس میں ذرہ برابر دبنا آپ کی دائمی ذلت و رسوائی کا باعث ہو

گا۔

راجہ صاحب نے ایک منٹ تک سوچنے کے بعد کہا۔ ''تمہیں یہاں کے تعلیم یافتہ لوگوں کا حال معلوم نہیں ہے۔ تم سمجھتی ہو گی کہ وہ میری مدد کریں گے یا کم از کم ہمدردی کا اظہار ہی کریں گے، لیکن جس دن میں نے کھلے الفاظ میں مسٹر کلارک کی شکایت کی، اسی دن سے لوگ میرے گھر آنا جانا بھی بند کر دیں گے۔ کوئی منہ تک نہ دکھائے گا۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ مسٹر کلارک سے میری خفیہ شکایتیں کریں گے اور مجھے نقصان پہنچانے میں کوئی بات اٹھا نہ رکھیں گے۔ ہمارے خواندہ اور مہذب بھائیوں کی اخلاقی کمزوری ناگفتہ بہ ہے۔ سب کے سب ظاہر یا پوشیدہ طریقہ پر گورنمنٹ کے دست نگر ہیں۔ جب تک انہیں معلوم ہے کہ حکام سے میرا ربط ضبط ہے جبھی تک میری عزت اور قدر کرتے ہیں۔ جس روز انہیں معلوم ہوگا کہ حاکم ضلع کی نگاہ مجھ سے پھر گئی، اسی روز سے میرے اعزاز کا خاتمہ سمجھو۔ ہمارے بھائیوں کی یہی کمزوری اور خود غرضی ہے جو ہمارے لیے بے خوف راست گو اور جری رہنمایان ملک کے حوصلے پست کر دیتی ہے۔''

راجہ صاحب نے لطائف الحیل سے خوب کام لیا اور حالات گردوپیش کا نہایت یاس انگیز نقشہ کھینچا، لیکن اندوا اپنے نقطہ سے جوبھر بھی نہ ٹلی۔ وہ ان کے دل میں اس جذبہ کو بیدار کرنا چاہتی تھی جو کبھی پرتاپ اور سانگا، ٹیپو اور رانا کے ناموں پر قربان ہو جاتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ جذبہ مرا نہیں بلکہ اس پر اقتدار کی محبت کی نیند کا غلبہ ہے۔ بولی۔ ''اگر مان لیں کہ آپ کے سارے اندیشے ٹھیک نکلیں۔ آپ کی عزت مٹ جائے۔ سارا شہر آپ کا دشمن ہو جائے۔ حکام آپ کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھنے لگیں۔ یہاں تک کہ آپ کے علاقہ کے ضبط ہونے کی بھی نوبت آ جائے۔ جب بھی میں آپ سے یہ یہی کہتی جاؤں گی کہ اپنی جگہ پر اٹل رہیے۔ ہم چھتریوں کا یہی دھرم ہے۔ آج ہی اخباروں میں یہ بات شائع ہو جائے گی اور ساری دنیا نہیں تو کم از کم

سارا ملک آپ کی طرف منتظر نگاہوں سے دیکھے گا کہ آپ اس قومی وقار کی کتنی مردانگی اور آزادی سے حفاظت کرتے ہیں۔ اس جنگ میں ہماری شکست بھی ایک عظیم فتح خیال کی جائے گی کیونکہ یہ جنگ مادی نہیں روحانی ہے، لیکن مجھے تو یقین کامل ہے کہ آپ کے اندیشے باطل ثابت ہوں گے۔ ایک حاکم کی زیادتی کی فریاد سرکار کے کانوں تک پہنچا کر آپ اس زبردست وفاداری کا ثبوت دیں گے۔ سرکار کی عدل گستری پر اس اعتماد کامل کا اعلان کریں گے جو سلطنت کی مضبوطی کی بنیاد ہے۔ بچہ ماں کے سامنے روئے، مچلے، ہٹ کرے۔ پر ماں کی محبت ذرا بھی کم نہیں ہوتی۔ مجھے تو یقین ہے کہ سرکار اپنے انصاف کی دھاک جمانے کے لیے آپ کی اور بھی عزت کرے گی۔ قومی تحریکات کے رہنماؤں کو عموماً اونچے اونچے خطابات دیئے جاتے ہیں۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ آپ کو بھی وہی اعزاز حاصل نہ ہو۔''

یہ دلیل راجہ صاحب کو غور کرنے کے لیے قابل معلوم ہوئی۔ بولے۔ ''اچھا سوچوں گا۔'' اتنا کہہ کر باہر چلے گئے۔

دوسرے روز صبح مسٹر جان سیوک راجہ صاحب سے ملنے آئے۔ انہوں نے بھی یہی صلاح دی کہ اس معاملہ میں ذرا بھی نہ دبنا چاہیے۔ لڑوں گا تو میں۔ آپ صرف میری مدد کرتے جایئے گا۔ راجہ صاحب کو کچھ تسکین ہوئی۔ ایک سے دو ہوئے۔ شام کے وقت وہ کنور صاحب سے صلاح لینے گئے۔ ان کی بھی یہی رائے ہوئی۔ ڈاکٹر گنگولی کو تار دے کر بلایا گیا۔ انہوں نے یہاں تک کہا کہ آپ خاموش بھی ہو جائیں گے تو میں کونسل میں اس معاملہ کو ضرور پیش کروں گا۔ سرکار ہمارے تجارتی معاملات کی طرف سے اس قدر بے پروا نہیں ہوسکتی۔ یہ انصاف یا بے انصافی، عزت یا بے عزتی کا سوال نہیں ہے۔ صرف تجارتی معاملہ کا سوال ہے۔''

راجہ صاحب اندو سے بولے۔ ''لو بھئی۔ تمہاری صلاح ٹھیک رہی۔ جان پر کھیل رہا ہوں۔''

اندو نے انہیں عقیدت مند نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ ’’ایشور نے چاہا تو آپ کی فتح ہو گی۔‘‘

(22)

سید طاہر علی کو امید کامل تھی کہ سگریٹ کا کارخانہ تعمیر ہونا شروع ہو جائے گا تو میری کچھ نہ کچھ ترقی ضرور ہو گی۔ مسٹر سیوک نے ان سے اس امر کا وعدہ کیا تھا۔ اس امید کے سوا انہیں اب ان قرضہ جات کے ادا کرنے کا کوئی اور ذریعہ نہ نظر آتا تھا جو روز بروز برساتی گھاس کی طرح بڑھتے چلے جاتے تھے۔ وہ خود بڑی کفایت سے بسر کرتے تھے۔ عید کے دن کے علاوہ اور شاید کسی روز بھی دودھ ان کے حلق میں نہ جاتا تھا۔ مٹھائی ان کے لیے حرام تھی۔ پان تمباکو کا انہیں شوق ہی نہ تھا، لیکن یہ خود چاہے کتنی ہی کفایت کریں، گھر والوں کی ضروریات میں قطع و برید کرنا انصاف کے خلاف سمجھتے تھے۔ زینب اور رقیہ اپنے لڑکوں کے لیے دودھ لینا ضروری خیال کرتی تھیں۔ کہتیں یہی تو لڑکوں کے کھانے پینے کی عمر ہے۔ اسی عمر میں تو ان کی ہڈیاں چوڑی چکلی ہوتی ہیں۔ ان کے دل اور دماغ بڑھتے ہیں۔ اس عمر میں لڑکوں کو مقوی غذا نہ ملے تو ان کی ساری عمر ہی برباد ہو جاتی ہے۔

لڑکوں کے بارے میں ایسا کہنا سچ یا جھوٹ، مگر پان تمباکو کے بارے میں طاہر علی کی سوتیلی مائیں جس دلیل کو پیش کرتی تھیں، اس کی سچائی مسلمہ تھی۔ عورتوں کا ان کے بغیر گزر ہی نہیں ہو سکتا۔ کوئی دیکھے تو کیا کہے۔ کیا ان کے یہاں پان تک میسر نہیں۔ یہی تو اب شرافت کی ایک نشانی رہ گئی ہے۔ مامائیں نہیں۔ خواصیں نہیں۔ تو کیا پان تمباکو سے بھی گئے۔ مردوں کو پان کی ایسی ضرورت نہیں۔ انہیں حکام سے ملنا جانا پڑتا ہے۔ پرائی تابعداری کرتے ہیں۔ انہیں پان کی کیا ضرورت۔

مصیبت یہ تھی کہ ماہر اور جابر تو مٹھائیاں کھا کر اوپر سے دودھ پیتے اور صابر اور نسیمہ کھڑے منہ تاکا کرتے۔ زینب بیگم کہتیں، ان کے گڑ کے باپ کو لھو ہی خدا کے

فضل سے زندہ ہیں۔ سب کو دکھا کر کھلائیں۔ جبھی کھلانا کہلائے۔ سب کچھ تو انہیں کی مٹھی میں ہے۔ چاہیں کھلائیں۔ جسے چاہیں رکھیں۔ کوئی ہاتھ پکڑنے والا ہے؟

وہ دونوں دن بھر بکری کی طرح پان چبایا کرتیں۔ کلثوم کا کھانے کے بعد ایک بیڑا بمشکل ملتا تھا۔ اپنی ان ضروریات کے لیے طاہر علی سے پوچھنے یا چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے کی ضرورت نہ تھی۔

صبح کا وقت تھا۔ چمڑے کی خرید ہو رہی تھی۔ سینکڑوں چمار بیٹھے چلم پی رہے تھے۔ یہی ایک وقت تھا جب طاہر علی کو اپنے عہدہ کی اہمیت کا احساس ہوتا تھا۔ اس وقت انہیں اس احساس کی وجہ سے حکومت کا خفیف سا نشہ ہو جاتا تھا۔ ایک چمار دروازہ پر جھاڑو لگاتا۔ ایک ان کا تخت صاف کرتا۔ ایک پانی بھرتا۔ کسی کو سبزی خریدنے کے لیے بازار بھیج دیتے اور زینب اور رقیہ پردہ کی آڑ میں بیٹھ کر پاندان کا خرچ وصول کرتیں۔ صاحب نے طاہر علی کو دستوری لینے سے منع کیا تھا۔ عورتوں کو پان پتے کا خرچ لینے کی ممانعت نہ کی گئی تھی۔ اس آمدنی سے دونوں نے اپنے اپنے لیے زیور بنوا لیے تھے۔ طاہر علی اس رقم کا حساب لینا چھوٹی بات سمجھتے تھے۔

اسی وقت جگدھر آ کر بولا۔ ''منشی جی حساب کب تک چکتا کیجیے گا؟ میں کوئی لکھ پتی تھوڑا ہی ہوں کہ روز مٹھائیاں دیتا جاؤں، چاہے دام ملیں یا نہ ملیں۔ آپ جیسے دو چار گاہک اور مل جائیں تو میرا دوالہ ہی نکل جائے۔ لائیے۔ روپے دلوائیے۔ اب حیلہ حوالہ نہ کیجیے۔ گاؤں محلّہ کی بہت مروت کر چکا۔ میرے اوپر بھی تو مہاجن کا لہنا تگادا (تقاضا) ہے۔ یہ دیکھئے کاگد (کاغذ) حساب کر دیجیے گا۔''

باقی داروں کے لیے حساب کا کاغذ موت کا پروانہ ہے۔ وہ اس کی طرف دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ حساب دیکھنے کا مطلب ہے، روپے ادا کرنا۔ باقی دار نے حساب کا چٹھا ہاتھ میں لیا اور پانے والے کا دل امید سے شگفتہ ہو گیا۔ حساب کی فرد ہاتھ میں لے کر پھر کوئی حیلہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہی سبب ہے کہ باقی داروں کو خالی ہاتھ

حساب دیکھنے کی ہمت نہیں پڑتی۔

طاہر علی نے منت آمیز لہجہ میں کہا۔ ''بھئی حساب سب معلوم ہے۔ اب بہت جلد تمہارا بقایا صاف ہو جائے گا۔ دو چار روز اور صبر کرو۔''

جگدھر: کہاں تک صبر کروں صاحب! دو چار دن کرتے کرتے تو مہینوں ہو گئے۔ مٹھائیاں کھاتے وقت تو میٹھی جان پڑتی ہیں۔ دام دیتے کیوں کڑوا لگتا ہے۔

طاہر: برادر آج کل ذرا تنگ ہو گیا ہوں۔ مگر اب جلد ہی کارکانہ کا کام شروع ہو گا۔ میری بھی ترقی ہو گی۔ بس تمہاری کوڑی کوڑی چکا دوں گا۔

جگدھر: نا صاحب۔ آج تو میں روپے لے کر ہی جاؤں گا۔ مہاجن کے روپے نہ دوں گا تو آج مجھے چھٹانک بھر بھی سودا نہ ملے گا۔ بھگوان جانتے ہیں جو میرے گھر میں ٹکا بھی ہو۔ یہ سمجھئے کہ آپ میرا نہیں، اپنا دے رہے ہیں۔ آپ سے جھوٹ بولتا ہوں تو جوانی کام نہ آئے۔ رات بال بچے بھوکے ہی سو رہے۔ سارے محلّہ میں آواز لگائی کسی نے چار آنے پیسے بھی نہ دیئے۔

چماروں کے چودھری کو جگدھر پر رحم آ گیا۔ طاہر علی سے بولا۔ ''منشی جی میرا پاونا (یافتنی) انہیں کو دے دیجیے۔ مجھے دو چار دن پیچھے دے دیجیے گا۔''

طاہر: جگدھر میں خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں۔ میرے پاس روپے نہیں ہیں۔ خدا کے لیے دو چار دن ٹھہر جاؤ۔

جگدھر: منشی جی جھوٹ بولنا گائے کھانا ہے۔ مہاجن کے روپے آج نہ پہنچے تو کہیں کا نہ رہوں گا۔

طاہر علی نے گھر میں آ کر کلثوم سے کہا۔ ''مٹھائی والا سر پر سوار ہے۔ کسی طرح ٹلتا نہیں۔ کیا کروں؟ تحویل میں سے دس روپے نکال کر دے دوں؟''

کلثوم نے چڑ کر کہا۔ ''جس کے دام آتے ہیں وہ سر پر سوار ہو گا ہی۔ اماں جان سے کیوں نہیں مانگتے۔ میرے بچوں کو تو مٹھائی ملی نہیں۔ جنہوں نے کود کود کر کھایا

کھلایا ہے، وہ دام دینے کے وقت کیوں بھیگی بلی بنی بیٹھی ہوئی ہیں؟"

طاہر: اسی وجہ سے تو میں تم سے کوئی بات کہتا نہیں۔ تحویل سے لے لینے میں کیا ہرج ہے؟ تنخواہ ملتے ہی جمع کر دوں گا۔

کلثوم: خدا کے لیے کہیں یہ غضب نہ کرنا۔ روکڑ کو کالا سانپ سمجھو۔ کہیں آج ہی صاحب رقم کی جانچ کرنے لگے تو؟

طاہر: اجی نہیں۔ صاحب کو اتنی فرصت کہاں کہ روکڑ ملاتے رہیں۔

کلثوم: میں امانت کی رقم چھونے کو نہ کہوں گی۔ ایسا ہی ہے تو نسیمہ کا طوق اتار کر کہیں گرو رکھ دو۔ اور تو میرے کیے کچھ نہیں ہو سکتا۔

طاہر علی کو رنج تو بہت ہوا مگر کیا کرتے۔ نسیمہ کا طوق اتارتے تھے اور روتے تھے۔ کلثوم اسے پیار کرتی تھی اور پھسلا کر کہتی تھی۔ "تمہارا ابا طوق بنوانے جا رہے ہیں۔" نسیمہ پھولی نہ سماتی تھی کہ مجھے نیا طوق ملے گا۔

طوق کو رومال میں لیے ہوئے طاہر علی باہر نکلے اور جگدھر کو علیحدہ لے جا کر بولے۔ "بھئی اسے لے جاؤ۔ کہیں گرو رکھ کر اپنا کام چلاؤ۔ گھر میں روپے نہیں ہیں۔"

جگدھر: ادھار سودا دینا پاپ ہے، پر کروں کیا۔ نکد (نقد) بیچنے لگوں تو گھومتا ہی رہ جاؤں۔

یہ کہہ کر اس نے ذرا تامل کرتے ہوئے طوق لے لیا اور پچھتاتا ہوا چلا گیا۔ کوئی دوسرا آدمی اپنے گاہک کو اتنا دق کر کے روپے نہ وصول کرتا۔ اسے لڑکی پر رحم آ ہی جاتا جو مسکرا کر کہہ رہی تھی کہ میرا طوق کب بنا کر لاؤ گے۔ لیکن جگدھر اخراجات خانگی کے ناقابل برداشت بار کے سبب اس سے کہیں زیادہ بے مروت بننے پر مجبور تھا جتنا کہ وہ واقعی تھا۔

جگدھر کو گئے ہوئے نصف گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا کہ بجرنگی تیور بدلے ہوئے آ کر

بولا۔ ''منشی جی روپے دینے ہوں تو دیجیے۔ نہیں کہہ دیجیے، بابا ہم سے نہیں ہو سکتا۔ بس ہم صبر کر لیں۔ سمجھ لیں گے کہ ایک گائے نہیں لگی۔ روز بروز دوڑاتے کیوں ہو؟''

طاہر: برادر۔ جیسے اتنے دنوں تک صبر کیا ہے۔ تھوڑے دنوں تک اور صبر کرو۔ خدا نے چاہا تو اب کے تمہاری ایک پائی بھی نہ رہے گی۔

بجرنگی: ایسے وعدے تو آپ بیسوں بار کر چکے ہیں۔

طاہر: اب کے پکا وعدہ کرتا ہوں۔

بجرنگی: تو کس دن حساب کیجیے گا۔

طاہر علی مخمصے میں پڑ گئے۔ کون سا دن بتلائیں۔ باقی داروں کو حساب کے دن کا اتنا ہی خوف ہوتا ہے جتنا گناہگاروں کو۔ وہ ''دو چار'' ''بہت جلد'' ''آج دل میں'' وغیرہ وغیرہ مبہم الفاظ کا سہارا لیا کرتے ہیں۔ اپنے وعدے پورے کیے جانے کے لیے نہیں، صرف پانے والوں کو ٹالنے کے لیے کیے جاتے ہیں۔ طاہر علی طبعاً خوش معاملہ شخص تھے۔ تقاضوں سے انہیں سخت پریشانی ہوتی تھی۔ وہ تقاضوں سے اتنا ہی ڈرتے تھے جتنا شیطان سے۔ انہیں دور سے دیکھتے ہی ان کی روح فنا ہو جاتی تھی۔ خیر کئی منٹ تک سوچتے رہے۔ کیا جواب دوں۔ خرچ کا یہ حال ہے اور ترقی کے لیے کہتا ہوں تو کورا جواب ملتا ہے۔ آخر بولے۔ ''دن کون سا بتاؤں۔ چار چھ دن میں جب آ جاؤ گے، اسی دن حساب ہو جائے گا۔''

بجرنگی: منشی جی۔ مجھ سے اڑن گھاٹیاں نہ بتایئے۔ مجھے بھی سبھی طرح کے گاہکوں سے کام پڑتا ہے۔ اگر دس دن میں آؤں گا تو آپ کہیں گے، اتنی دیر کیوں کی۔ اب روپے خرچ ہو گئے۔ اگر چار پانچ دن میں آؤں گا تو آپ کہیں گے، ابھی تو روپے ملے ہی نہیں۔ اس لیے مجھے کوئی دن بتا دیجیے جس میں میرا بھی ہرج نہ ہو اور آپ کو بھی سبھیتا ہو۔

طاہر: دن بتا دینے میں مجھے کوئی عذر نہ ہوتا مگر بات یہ ہے کہ میری تنخواہ ملنے کی کوئی تاریخ نہیں ہے۔ دو چار دنوں کا ہیر پھیر ہو جاتا ہے۔ ایک ہفتہ بعد کسی لڑکے بھی بھیج دو گے تو روپے مل جائیں گے۔

بجرنگی: اچھی بات ہے آپ ہی کا کہنا ہی۔ اگر اب کی بھی وعدہ پورا نہ کیجیے گا تو پھر مانگنے نہ آؤں گا۔

بجرنگی چلا گیا تو طاہر علی بڑھ چڑھ کر باتیں کرنے لگے۔ تم لوگ سمجھتے ہو گے، یہ لوگ اتنی اتنی طلب پاتے ہیں، گھر میں بٹور کر رکھتے ہوں گے اور یہاں خرچ کا یہ حال ہے کہ آدھا مہینے بھی نہیں ختم ہونے پاتا کہ روپے اڑ جاتے ہیں۔ شرافت روگ ہے اور کچھ نہیں۔

ایک چمار نے کہا۔ ''ہجور بڑے آدمیوں کا کھرچ بھی بڑا ہوتا ہے۔ آپ ہی لوگوں کی بدولت تو گریبوں کی گجر ہوتی ہے۔ گھوڑے کی لات گھوڑا ہی سہہ سکتا ہے۔''

طاہر: اجی صرف پان میں اتنا خرچ ہو جاتا ہے کہ اتنے میں دو آدمیوں کا بخوبی گزر ہو سکتا ہے۔

چمار: ہجور۔ دیکھتے نہیں ہیں کیا۔ بڑے آدمیوں کی بڑی بات ہوتی ہے۔

ابھی طاہر علی کی اشک شوئی کافی طور پر نہ ہونے پائی تھی کہ سامنے سے ٹھاکر دین آتا ہوا دکھائی دیا۔ بچارے پہلے ہی سے کوئی بہانہ سوچنے لگے۔ اتنے میں اس نے آ کر سلام کیا اور بولا۔ ''منشی جی۔ کارخانہ میں کب سے ہاتھ لگے گا؟''

طاہر: مسالہ جمع ہو رہا ہے۔ ابھی انجینئر نے نقشہ نہیں بنایا۔ اسی وجہ سے دیر ہو رہی ہے۔

ٹھاکر دین: انجینئر نے بھی کچھ لیا ہو گا؟ بڑی بے ایمان جات ہے۔ ہجور میں نے بھی کچھ ٹھیکہ داری کی ہے۔ جو کماتا تھا انجینئر کو کھلا دیتا تھا۔ آخر گھبرا کر چھوڑ بیٹھا۔

انجینئر کے بھائی ڈاکٹر ہوتے ہیں۔ روگی چاہے مرتا ہو پر فیس لیے بنا بات نہ سنیں گے۔ فیس کے نام سے رعایت بھی کریں گے تو گاڑی کے کرایہ اور دوا کے دام میں کس لیں گے۔ (حساب کی فرد دکھا کر) جرا (ذرا) ادھر بھی ایک نجر (نظر) ہو جائے۔

طاہر: سب معلوم ہے۔ تم نے غلط تھوڑا ہی لکھا ہوگا۔

ٹھاکر دین: ہجور ایمان ہے تو سب کچھ ہے۔ ساتھ کوئی نہ جائے گا۔ تو مجھے کیا حکم ہوتا ہے؟

طاہر: دو چار روز کی مہلت دو۔

ٹھاکر دین: جیسی آپ کی مرضی ہجور۔ چوری ہو جانے سے لاچار ہو گیا۔ نہیں تو دو چار روپیوں کی کون بات تھی۔ اس چوری میں تباہ ہو گیا۔ گھر میں پھوٹا لوٹا تک نہ بچا۔ دانے دانے کو محتاج ہو گیا ہجور۔ چوروں کو آنکھوں کے سامنے بھاگتے دیکھا۔ ان کے پیچھے دوڑا۔ پاگل خانہ تک دوڑتا چلا گیا۔ اندھیری رات تھی۔ اونچا کھائی کچھ نہ سوجھتا تھا۔ ایک گڑھے میں گر پڑا۔ پھر اٹھا۔ مال بڑا پیارا ہوتا ہے۔ لیکن چور نکل گئے تھے۔ تھانہ میں رپٹ کی۔ تھانہ داروں کی کھوسامد کی۔ پر گئی ہوئی لچھمی کہاں لوٹتی ہے۔ تو کب آؤں؟

طاہر: تمہارے آنے کی ضرورت نہیں۔ میں خود بھجوا دوں گا۔

ٹھاکر دین: جیسی آپ کی کھسی۔ مجھے کوئی اجر نہیں ہے۔ مجھے تگادا (تقاضا) کرتے آپ ہی شرم آتی ہے۔ کوئی بھلا مانس ہاتھ میں پیسے رہتے ہوئے ٹال مٹول نہیں کرتا۔ فوراً نکال کر پھینک دیتا ہے۔ آج جرا پان لینے جانا تھا اس لیے چلا آیا تھا۔ سب نہ ہو سکے تو تھوڑا بہت دے دیجیے۔ کسی طرح کام نہ چلا تب آپ کے پاس آیا۔ آدمی پہچانتا ہوں ہجور۔ پر موکا (موقع) ایسا ہی آ پڑا ہے۔

ٹھاکر دین کی منکسر مزاجی اور شگفتہ خاطری نے طاہر علی کو گرویدہ بنا لیا۔ فوراً

صندوق کھولا ارو پانچ روپے نکال کر اس کے سامنے رکھ دیئے۔ٹھاکر دین نے روپے اٹھائے نہیں۔وہ ایک لمحہ تک سوچتا رہا۔پھر بولا۔''یہ آپ کے روپے ہیں کہ سرکاری روکڑ ہیں؟''

طاہر:تم لے جاؤ۔تمہیں آم کھانے سے مطلب ہے کہ پیڑ گننے سے۔

ٹھاکر دین:نہیں منشی جی۔یہ نہ ہوگا۔اپنے روپے ہوں تو دیجیے مالک کی روکڑ ہو تو رہنے دیجیے۔پھر آ کر لے جاؤں گا۔آپ کے چار پیسے کھاتا ہوں تو آپ کو آنکھوں سے دیکھ کر گڑھے میں نہ گرنے دوں گا۔برا مانیے تو مان جایئے۔اس کی چنتا نہیں۔صفابات کہنے کے لیے بدنام ہوں۔آپ نے روپے یوں اللے تللے خرچ ہوں گے تو ایک دن آپ دھوکا کھائیں گے۔بھل منسی تو ٹھاٹ باٹ بڑھانے میں نہیں ہے۔اپنی آبرو بچانے میں ہے۔

طاہر علی نے آبدیدہ ہو کر کہا۔''روپے لیتے جاؤ۔''

ٹھاکر دین اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔''جب آپ کے پاس ہوں تب دینا۔''

اب تک تو طاہر علی کو کارکانہ کے بننے کی امید تھی کہ ادھر آمدنی بڑھی اور ادھر میں نے روپے دیئے،لیکن جب مسٹر کلارک کے نئے حکم کے بموجب تعمیر کا کام غیر معینہ مدت کے لے بند کر دیا گیا تو طاہر علی کو اپنے مہاجنوں کو سمجھانا مشکل ہو گیا۔انہوں نے زیادہ تنگ کرنا شروع کیا۔طاہر علی بہت متفکر رہنے لگے۔عقل کچھ کام نہ کرتی تھی۔کلثوم کہتی تھی اوپر کا خرچ سب بند کر دیا جائے۔دودھ پان اور مٹھائیوں کے بغیر آدمیوں کو کوئی تکلیف نہیں ہو سکتی۔ایسے کتنے آدمی ہیں جنہیں اس زمانہ میں یہ چیزیں میسر ہیں؟ اوروں کی کیا کہوں۔میرے ہی لڑکے ترستے ہیں۔میں پہلے ہی سمجھا چکی ہوں اور اب پھر سمجھاتی ہوں کہ جن کے لیے تم اپنا لہو پسینہ ایک کر رہے ہو وہ تمہاری بات بھی نہ پوچھیں گے۔پر نکلتے ہی صاف اڑ نہ جائیں تو کہنا۔ابھی سے رخ دیکھ رہی ہوں۔اوروں کو سود پر روپے دیئے جاتے ہیں۔زیور بنوائے جاتے

ہیں، لیکن گھر کے خرچ کو کبھی کچھ مانگو تو ٹکا سا جواب ملتا ہے کہ میرے پاس کہاں۔ تمہارے اوپر انہیں کچھ تو رحم آنا چاہیے۔ آج دودھ مٹھائی بند کر دو تو گھر میں رہنا مشکل ہو جائے۔

تیسرا پہر تھا۔ طاہر علی برآمدہ میں اداس بیٹھے ہوئے تھے۔ یکا یک بھیرو آکر بیٹھ گیا اور بولا۔ ''کیوں منشی جی کیا سچ مچ اب یہاں کارخانہ نہ بنے گا؟''

طاہر: بنے گا کیوں نہیں۔ فی الحال ملتوی ہو گیا ہے۔

بھیرو: مجھے تو بڑی آسا (آس) تھی کہ کارخانہ بن گیا تو میرا بکری بٹا بھی بڑھ جائے گا۔ دکان پر بکری بالکل مندی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہاں سبیرے (صبح) تھوڑی دیر بیٹھا کروں۔ آپ منجور کرلیں تو اچھا ہو۔ میری تھوڑی بہت بکری ہو جائے گی۔ آپ کو بھی پان کھانے کے لیے کچھ نجر کر دیا کروں گا۔

کسی اور وقت پر تو طاہر علی نے بھیرو کو ڈانٹ بتلائی ہوتی۔ تاڑی کی دکان کھولنے کی اجازت دینا ان کے مذہب کے خلاف تھا۔ مگر اس وقت روپیہ کی فکر نے انہیں کشمکش میں ڈال دیا۔ اس سے پیشتر بھی روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے ان کے اصول اور عمل میں کئی بار کشمکش پیدا ہو چکی تھی اور ہر موقع پر انہیں اصول ہی کا خون کرنا پڑا تھا۔ آج پھر وہی کشمکش رونما ہوئی اور اصول نے پھر حالات موجودہ کے سامنے ماتھا ٹیک دیا۔ وہ سوچنے لگے۔ کیا کروں؟ اس میں میرا کیا قصور۔ میں کسی صرف بے جا کے لیے شرع کے خلاف عمل نہیں کر رہا ہوں۔ حالات نے مجھے بالکل مجبور کر دیا ہے۔ یہ سوچ کر کچھ جھینپتے ہوئے بولے۔ ''یہاں تاڑی کی بکری نہ ہو گی۔''

بھیرو: ہجور۔ بکری تو تاڑی کی مہک سے ہو گی۔ نسہ باجوں (نشہ بازوں) کی ایسی عادت ہوتی ہے کہ نہ دیکھیں تو چاہے برسوں نہ پئیں، پر نسہ سامنے دیکھ کر ان سے نہیں رہا جاتا۔

طاہر: تو صاحب کے حکم کے بغیر میں کیسے اجازت دے سکتا ہوں۔

بھیرو: آپ کی جیسی مرجی۔ میری سمجھ میں تو صاحب سے پوچھنے کی جرورت (ضرورت) ہی نہیں۔ سیرے ایک گھڑا لاؤں گا۔ گھڑی بھر میں بیچ کر اپنی راہ لوں گا۔ انہیں خبر ہی نہ ہوگی کہ یہاں کوئی تاڑی بیچتا ہے۔

طاہر: نمک حرامی سکھاتے ہو۔ کیوں؟

بھیرو: سرکار۔ اس میں نمک حرامی کا ہے کی؟ اپنے دانوؤ گھات پر کون نہیں لیتا۔

سودا پٹ گیا۔ بھیرو یکمشت پندرہ روپے دینے پر راضی ہو گیا۔ جا کر سوبھاگی سے بولا۔ دیکھ سودا کر آیا نا۔ تو کہتی تھی کہ وہ کبھی نہ مانیں گے۔ مسلمان ہیں۔ ان کے یہاں تاڑی سراب منع ہے۔ پر میں نے تو کہہ نہ دیا تھا کہ مسلمان ہو چاہے برہمن ہو، پر دھرم کرم کسی میں نہیں رہ گیا۔ روپے پر سبھی لپک پڑتے ہیں۔ یہ میاں لوگ باہر سے اجلے کپڑے پہنے دکھائی دیتے ہیں۔ گھر میں بھونی بھانگ نہیں ہوتی۔ میاں نے پہلے تو دکھانے کے لیے ادھر ادھر کیا پھر پندرہ روپیہ میں راجی ہو گئے۔ پندرہ روپے تو پندرہ دن میں سیدھے ہو جائیں گے۔"

سوبھاگی پہلے گھر کی مالکن بنا چاہتی تھی۔ اس لیے ہر روز ڈنڈے کھاتی تھی۔ اب وہ گھر بھر کی خادمہ بن کر مالکن بنی ہوئی ہے۔ روپے پیسے اسی کے ہاتھ میں رہتے ہیں۔ ساس جو اس کی صورت سے بیزار تھی، دن میں سوسو بار اسے دعائیں دیتی ہے۔ سوبھاگی نے فوراً روپے نکال کر بھیرو کو دیئے۔ شاید دو بچھڑے ہوئے دوست اس طرح ٹوٹ کر گلے نہ ملتے ہوں گے جیسے طاہر علی ان روپیوں پر ٹوٹے۔ رقم قلیل تھی اس کے لیے انہیں اپنے ایمان کا خون کرنا پڑا تھا۔ قرض والے اپنے اپنے روپے لے گئے۔ طاہر علی کے سر کا بوجھ ہلکا ہوا مگر انہیں بہت رات تک نیند نہ آئی۔ ضمیر سخت جان ہوا کرتا ہے۔ اس کا گلا کٹ جائے مگر جان نہیں نکلتی۔

(23)

جب تک سورداس شہر میں حکام کے ظلم کی دوہائی دیتا رہا، اس کے محلّہ والے جان

سیوک کے ہوا خواہ ہونے کے باوجود بھی اس سے ہمدردی کرتے رہے۔ کمزوروں کے ساتھ ہمدردی قدرتاً پیدا ہو جاتی ہے، لیکن سورداس کی فتح ہوتے ہی اس ہمدردی نے حسد کی شکل اختیار کر لی۔ یہ خیال پیدا ہوا کہ سورداس دل میں ہم لوگوں کو حقیر سمجھ رہا ہوگا۔ کہتا ہوگا کہ جب میں نے راجہ مہیندر کمار سنگھ جیسوں کو نیچا دکھا دیا، ان کا غرور خاک میں ملا دیا، تو یہ لوگ کس باغ کی مولی ہیں۔ سارا محلّہ اس سے دل ہی دل میں خار کھانے لگا۔ صرف ایک ٹھاکر دین تھا جو اس کے پاس اب بھی آیا جایا کرتا تھا۔ اسے اب یقین ہو گیا تھا کہ سورداس کو کسی دیوتا کا اشٹ ضرور ہے۔ اس نے ضرور کوئی منتر جگا لیا ہے ورنہ اس کی اتنی کہاں مجال کہ ایسے ایسے بڑے آدمیوں کا سر جھکا دیتا۔ لوگ کہتے ہیں کہ جنتر منتر سب ڈھکوسلا ہے۔ یہ سب دیکھ کر بھی ان کی آنکھیں نہیں کھلتیں۔

سورداس کے مزاج میں بھی اب کچھ تغیر ہوا۔ متحمل وہ پہلے ہی سے تھا، لیکن حق و انصاف کی حمایت میں اسے کبھی کبھی غصہ آ جاتا تھا۔ اب اس میں حرارت کا نام بھی نہ رہا۔ گویا کوئی گھورا تھا جس پر سبھی کوڑا پھینکتے ہیں۔ محلّہ والے راہ چلتے اسے چھیڑتے۔ اس پر آوازے کستے۔ طعنے مار دیتے۔ پر وہ کسی کو جواب نہ دیتا۔ سر جھکائے بھیک مانگنے جاتا اور پھر چپکے سے آ کر اپنی جھونپڑی میں پڑ رہتا۔ ہاں مٹھوا کا مزاج نہ ملتا تھا۔ وہ کسی سے سیدھے منہ بات نہ کرتا۔ کہتا۔ یہ کوئی نہ سمجھے کہ اندھا بھیک مانگتا ہے۔ اندھا تو بڑے بڑوں کی پیٹھ میں دھول لگا دیتا ہے۔ خواہ مخواہ لوگوں کو چھیڑتا۔ بھلے آدمیوں سے زبان لڑاتا۔ اپنے ہمجولیوں سے کہتا کہ چاہوں تو سارے محلّہ کو بندھوا دوں۔ کسانوں کے کھیتوں سے دھڑک چنے، مٹر، مولی، گاجر اکھاڑ لاتا۔ اگر کوئی ٹوکتا تو اس سے لڑنے پر آمادہ ہو جاتا۔ سورداس کو روز اولہنے ملتے۔ وہ تنہائی میں مٹھوا کو سمجھاتا لیکن اس پر کچھ اثر نہ ہوتا تھا۔ ستم تو یہ تھا کہ سورداس کے انکسار و تحمل پر تو کسی کی نگاہ نہ جاتی تھی، مٹھوا کی لن ترانیوں اور شرارتوں پر سبھی کی

نگاہیں پڑتی تھیں۔لوگ یہاں تک کہہ جاتے تھے کہ سورداس ہی نے اس کو سر چڑھا لیا ہے۔بچھڑا کھونٹے ہی کے بل پر کودتا ہے۔حسد طفلانہ حرکتوں کو بھی مغالطہ بازی سمجھتا ہے۔

آج کل صوفیہ مسٹر کلارک کے ساتھ سورداس سے اکثر ملا کرتی تھی۔وہ روزانہ اس کو کچھ نہ کچھ دیتی اور اس کی دل جوئی کرتی۔پوچھتی محلّہ والے یا راجہ صاحب کے آدمی تمہیں دق تو نہیں کر رہے ہیں؟ سورداس جواب دیتا مجھ پر سب لوگ دیا کرتے ہیں۔مجھے کسی سے شکایت نہیں ہے۔محلّہ والے سمجھتے تھے کہ یہ بڑے صاحب سے ہم لوگوں کی شکایت کرتا ہے۔کنایتاً وطنزاً اسی قسم کے خیالات کا بھی اظہار کرتے۔ ''سیاں بھئے کوتوال اب ڈر کا ہے کا''یا''پیادے سے فرزیں بھیو ٹیڑھو ٹیڑھو جائے۔'' ایک بار کسی سرکہ کی علت میں نایک رام کے گھر کی تلاشی ہوئی۔نایک رام کو شک ہوا کہ سورداس ہی نے نیش زنی کی ہے۔اسی طرح ایک بار بھیرو سے آبکاری کے داروغہ نے جواب طلب کیا۔بھیرو نے شاید قاعدہ کے خلاف نصف شب تک دکان کھلی رکھی تھی۔بھیرو کا شک بھی سورداس ہی پر ہوا کہ اسی نے یہ چنگاری چھوڑی ہے۔ان لوگوں کی بدگمانیوں سے تو سورداس کو زیادہ ملال نہ ہوا لیکن جب سوبھاگی کھلم کھلا اسے مطعون و بدنام کرنے لگی تو اس کو بہت رنج ہوا۔اسے یقین تھا کہ کم سے کم سوبھاگی کو میری نیت کا حال معلوم ہے۔اسے مجھ کو ان لوگوں کے دست ستم سے بچانا چاہیے تھا مگر اس کا دل بھی مجھ سے پھر گیا۔

اسی طرح کئی مہینے گزر گئے۔ایک رات کو سورداس کھا پی کر لیٹا ہوا تھا کہ کسی نے آ کر چپکے سے اس کا ہاتھ پکڑا۔سورداس چونکا۔پر سوبھاگی کی آواز پہچان کر بولا۔ ''کیا کہتی ہے؟''

سوبھاگی: کچھ نہیں ذرا منڈیا میں چلو تم سے کچھ کہنا ہے۔

سورداس اٹھا اور سوبھاگی کے ساتھ جھونپڑے میں آ کر بولا۔''کہہ کیا کہتی ہے؟

اب تو تجھے بھی مجھ سے بیر ہو گیا ہے۔ گالیاں دیتی پھرتی ہے۔ چاروں طرف بدنام کر رہی ہے۔ بتلا میں نے تیرے ساتھ کون سی برائی کی تھی کہ تو نے میری برائی پر کمر باندھ لی۔ اور لوگ مجھے بھلا برا کہتے ہیں مجھے رنج نہیں ہوتا لیکن جب تجھے طعنے دیتے سنتا ہوں تو مجھے رونا آتا ہے۔ کلیجے میں درد سا ہونے لگتا ہے۔ جس دن بھیرو کی طلبی ہوئی تھی تو نے مجھ کو کتنا کوسا تھا۔ سچ بتا کیا تجھے بھی شک ہوا تھا کہ میں نے دروگا جی سے سکایت کی ہے؟ کیا تو مجھے اتنا نیچ سمجھتی ہے؟ بتا۔''

سوبھاگی نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ''میں تمہارا جتنا آدر کرتی ہوں اتنا اور کسی کا نہیں۔ تم اگر دیوتا ہوتے تو بھی میں اتنی سردھا سے تمہاری پوجا نہ کرتی۔''

سورداس: میں کیا گھمنڈ کرتا ہوں۔ صاحب سے کس کی سکایت کرتا ہوں۔ جب دھرتی نکل گئی تھی تب تو لوگ مجھ سے نہ چڑتے تھے۔ اب دھرتی چھوٹ جانے سے کیوں سب کے سب میرے دشمن ہو گئے ہیں۔ بتا میں کیا گھمنڈ کرتا ہوں۔ میری دھرتی چھوٹ گئی ہے تو کوئی راج گیا ہے کہ گھمنڈ کروں گا۔

سوبھاگی: میرے من کا حال بھگوان جانتے ہوں گے۔

سورداس: تو مجھے کیوں جلایا کرتی ہے؟

سوبھاگی: اس لیے۔

یہ کہہ کر اس نے ایک چھوٹی سی پوٹلی سورداس کے ہاتھ میں رکھ دی۔ پوٹلی بھاری تھی۔ سورداس نے اسے ٹٹولا اور پہچان گیا۔ وہ اسی کی پوٹلی تھی جو چوری ہو گئی تھی۔ اندازہ سے معلوم ہوا کہ روپے بھی اتنے ہی ہیں۔ تعجب سے بولا۔ ''یہ کہاں سے ملی؟''

سوبھاگی: تمہاری محنت کی کمائی ہے۔ تمہارے پاس آ گئی۔ اب جتن سے رکھنا۔

سورداس: میں نہ رکھوں گا۔ اسے لے جا۔

سوبھاگی: کیوں؟ اپنی چیج (چیز) لینے میں کوئی ہرج ہے؟

سورداس: یہ میری چیز نہیں بھیرو کی چیز ہے۔ اس کے لیے بھیرو نے اپنی آتما بیچی ہے۔ مہنگا سودا لیا ہے۔ میں اسے کیسے لوں؟

سوبھاگی: میں یہ سب باتیں نہیں جانتی۔ تمہاری چیز ہے تمہیں لینی پڑے گی۔ اس کے لیے میں نے اپنے گھر والوں سے چھل کیا ہے۔ اتنے دنوں سے اسی کے لیے مایا رچ رہی ہوں۔ تم نہ لوگے تو اسے کیا کروں گی؟

سورداس: بھیرو کو معلوم ہو گیا تو تمہیں جیتا نہ چھوڑے گا۔

سوبھاگی: انہیں نہ معلوم ہونے پائے گا۔ میں نے اس کی تدبیر سوچ لی ہے۔

یہ کہہ کر سوبھاگی چلی گئی۔ سورداس کو زیادہ بحث کرنے کا موقع نہ ملا۔ بڑی پس و پیش میں پڑ گیا۔ یہ روپے لوں یا کیا کروں؟ یہ تھیلی میری ہے یا نہیں؟ اگر بھیرو نے اسے خرچ کر دیا ہوتا تو؟ کیا چور کے گھر میں چوری کرنا پاپ نہیں ہے؟ کیا میں اپنے روپے کے بدلے اس کے روپے لے سکتا ہوں؟ سوبھاگی مجھ پر کتنی دیا کرتی ہے۔ وہ اسی لیے مجھے طعنے دیا کرتی تھی کہ یہ بھید نہ کھلنے پائے۔

وہ اسی ادھیڑ بن میں پڑا ہوا تھا کہ دفعتاً ''چور چور'' کا شور سنائی دیا۔ پہلی ہی نیند تھی۔ لوگ غافل سو رہے تھے۔ پھر آواز آئی۔ ''چور! چور!''

بھیرو کی آواز تھی۔ سورداس سمجھ گیا کہ سوبھاگی نے یہ لیلا رچی ہے۔ اپنے دروازہ پر پڑا رہا۔ اتنے میں بجرنگی کی آواز سنائی دی۔ ''کدھر گیا، کدھر گیا؟'' یہ کہہ کر وہ لاٹھی لیے اندھیرے میں ایک طرف دوڑا۔ نایک رام بھی گھر سے نکلے اور ''کدھر کدھر'' کرتے ہوئے دوڑے۔ راستہ میں بجرنگی سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو چور سمجھا۔ دونوں نے وار کیا اور دونوں چوٹ کھا کر گر پڑے۔ ذرا دیر میں بہت سے آدمی جمع ہو گئے۔ ٹھاکردین نے پوچھا۔ کیا کیا لے گیا؟ اچھی طرح دیکھ لینا کہیں چھت میں نہ چمٹا ہوا ہو۔ چور دیوار سے ایسا چمٹ جاتے ہیں کہ دکھائی نہیں دیتے۔''

سوبھاگی: ہائے میں لٹ گئی۔ ابھی تو بیٹھی بیٹھی اماں کا پاؤں دبا رہی تھی۔ اتنے میں جانے موا کہاں سے آ پہنچا؟

بھیرو: (چراغ سے دیکھ کر) ساری جمع جتھا لٹ گئی۔ ہائے رام!

سوبھاگی: ہائے میں نے اس کی پرچھائیں دیکھی تو سمجھی کہ یہی ہوں گے۔ جب اس نے صندوق پر ہاتھ بڑھایا تو سمجھی کہ یہی ہوں گے۔

ٹھاکردین: کھپریل پر چڑھ کر آیا ہوگا؟ میرے یہاں جو چوری ہوئی تھی، اس میں بھی کھپریل ہی سے چڑھ کر آئے تھے۔

اتنے میں بجرنگی آیا۔ سر سے خون بہہ رہا تھا۔ بولا۔ ''میں نے اسے بھاگتے دیکھا۔ لاٹھی چلائی۔ اس نے بھی وار کیا۔ میں چکر کھا کر گر پڑا پر اس پر بھی ایسا ہاتھ پڑا کہ سر کھل گیا ہوگا۔''

یکایک نایک رام ''ہائے ہائے'' کرتے ہوئے آئے اور زمین پر گر پڑے۔ سارا جسم خون سے لت پت تھا۔

ٹھاکردین: پنڈا جی! کیا تم سے بھی اس کا سامنا ہو گیا کیا؟

نایک رام کی نگاہ بجرنگی کی طرف گئی۔ بجرنگی نے نایک رام کی طرف دیکھا۔ نایک رام نے دل میں کہا پانی کا دودھ بنا کر بیچتے ہو۔ اب یہ ڈھنگ نکالا ہے۔ بجرنگی نے دل میں کہا۔ جاتریوں کو لوٹتے ہو اب محلّہ والوں ہی پر ہاتھ صاف کرنے لگے۔

نایک رام: ہاں بھئی۔ یہیں گلی میں تو ملا۔ بڑا بھاری جوان تھا۔

ٹھاکردین: تبھی تو اکیلے دو آدمیوں کو گھائل کر دیا۔ میرے گھر میں جو چور بیٹھے تھے وہ سب دیو معلوم ہوتے تھے۔ ایسے ڈیل ڈول کے تو آدمی ہی نہیں دیکھے۔ معلوم ہوتا ہے تمہارے اوپر ان کا بھرپور ہاتھ پڑا۔

نایک رام: ہاتھ میرا بھی بھرپور پڑا۔ میں نے اسے گرتے دیکھا۔ سر جرور

(ضرور) پھٹ گیا ہوگا۔ جب تک پکڑوں نکل گیا۔

بجرنگی: ہاتھ تو میرا ایسا پڑا کہ بچہ کو چھٹی کا دودھ یاد آ گیا ہوگا۔ چاروں شانے چت گرا تھا۔

ٹھاکر دین: کسی جانے ہوئے آدمی کا کام ہے۔ گھر کے بھیدیا بنا کبھی چوری نہیں ہوتی۔ میرے یہاں بھی سبوں نے میری چھوٹی لڑکی کو مٹھائی دے کر گھر کا سارا بھید پوچھ لیا تھا۔

بجرنگی: تھانہ میں جرور رپٹ کرنا۔

بھیرو: رپٹ کر کے تھوڑے ہی رہ جاؤں گا۔ بچہ سے چکی نہ پسواؤں تو کہنا۔ چاہے بک جاؤں، پر انہیں بھی پیش ڈالوں گا۔ مجھے سب معلوم ہے۔

ٹھاکر دین: مال کا مال لے گیا۔ دو آدمیوں کو پھٹیل کر گیا۔ اس سے میں چوروں کی نگیچ (نزدیک) نہ گیا تھا دور سے لینا لینا کرتا رہا۔ جان سلامت رہے تو مال پھر آ جاتا ہے۔

بھیرو کو بجرنگی پر شبہ تھا نہ نایک رام پر۔ اسے جگدھر پر شبہ تھا۔ شبہ بھی نہیں یقین تھا۔ جگدھر کے سوا کسی کو نہ معلوم تھا کہ روپے کہاں رکھے ہوئے ہیں۔ جگدھر ٹھیت بھی اچھا تھا۔ وہ پڑوسی ہو کر بھی موقع واردات پر سب سے پیچھے پہنچا تھا۔ یہ سارے وجوہ اس کے شبہ کو مضبوط بناتے تھے۔

یہاں سے لوگ چلے تو راستہ میں باتیں ہونے لگیں۔ ٹھاکر دین نے کہا۔ ''کچھ اپنی کمائی کے روپے تو تھے نہیں وہی سورداس کے روپے تھے۔''

نایک رام: پرایا مال اپنے گھر میں آ کر اپنا ہو جاتا ہے۔

ٹھاکر دین: پاپ کا ڈنڈ جرور بھوگنا پڑتا ہے۔ چاہے جلدی ہو، چاہے دیر۔

بجرنگی: تمہارے چوروں کو کچھ ڈنڈ نہ ملا۔

ٹھاکر دین: مجھے کون کسی دیوتا کا ایشٹ تھا۔ سورداس کو ایشٹ ہے۔ اس کی ایک

کوڑی بھی کسی کو ہضم نہیں ہو سکتی۔ چاہے کتنا ہی چورن کھائے۔ میں تو سرط بند کر کہتا ہوں کہ اس کے گھر کی تلاشی لے جائے تو مال برآمد ہو جائے۔

دوسرے روز منہ اندھیرے بھیرو نے کوتوالی میں اطلاع کی۔ دوپہر تک داروغہ جی تفتیش کرنے کے لیے آپہنچے۔ جگدھر کی خانہ تلاشی ہوئی۔ بھیرو نے سمجھا، اس نے مال کہیں چھپا دیا۔ اس دن سے بھیرو کے سر ایک بھوت سا سوار ہو گیا۔ وہ سویرے ہی داروغہ جی کے گھر پہنچ جاتا۔ تمام دن ان کی خدمت کیا کرتا۔ چلم بھرتا، پیر دباتا، گھوڑے کے لیے گھاس چھیل لاتا۔ تھانہ کے چوکی داروں کی خوشامد کرتا۔ اپنی دکان پر بیٹھا ہوا تمام دن اسی چوری کا تذکرہ کیا کرتا۔ کیا کہوں مجھے کبھی ایسی نیند نہ آتی تھی۔ اس دن نہ جانے کیسے سو گیا مگر بندھوا نہ دوں تو نام نہیں۔ دروگا جی تاک میں ہیں۔ اس میں سب روپے ہی نہیں اشرفیاں بھی ہیں۔ جہاں بکیں گی بیچنے والا چھورن پکڑا جائے گا۔

رفتہ رفتہ بھیرو کو سارے محلّہ پر شبہ ہونے لگا اور جلتے تو لوگ اس سے پہلے ہی تھے۔ اب سارا محلّہ اس کا دشمن ہو گیا۔ یہاں تک کہ آخیر میں وہ اپنے گھر والوں پر ہی اپنا غصہ اتارنے لگا۔ سبھاگی پر پھر مار پڑنے لگی۔ تو نے ہی مجھے چوپٹ کیا تو اتنی بے کھبر نہ سوتی تو چور کیسے گھر میں گھس آتا۔ میں دن بھر دوری دکان کرتا ہوں۔ تھک کر آتا ہوں۔ تو گھر میں پڑے پڑے کیا کیا کرتی ہے۔ اب جہاں سے بنے میرے روپے لا نہیں تو جیتا نہیں چھوڑوں گا۔

اب تک اس نے اپنی ماں کا ہمیشہ ادب کیا تھا۔ پر اب اس کو بھی لے دے کرتا۔ ''تو کہا کرتی ہے کہ مجھے رات میں نیند ہی نہیں آتی۔ ساری رات جاگتی رہتی ہوں۔ اس دن تجھے کیسے نیند آ گئی؟'' خلاصہ یہ کہ اس کے دل میں کسی کی عزت، کسی کا اعتبار، کسی کی محبت نہ رہی۔ روپے کے ساتھ ہی اخلاق بھی اس سے یک دم رخصت ہو گیا۔ جگدھر کو دیکھ کر تو اس کی آنکھوں میں خون اتر آتا تھا۔ اسے بار بار چھیڑتا کہ

کسی طرح گرم پڑے تو اس کی خبر لوں لیکن جگدھر اس سے بچتا رہتا تھا۔ وہ کھلی چوٹیں کرنے کی بہ نسبت چھپی چوٹیں کرنے میں زیادہ ہوشیار تھا۔

ایک روز شام کے وقت جگدھر طاہر علی کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ طاہر علی نے پوچھا۔ ''کیسے چلے جی؟''

جگدھر: آپ سے ایک بات کہنے آیا ہوں۔ آبکاری کے داروگا ابھی مجھ سے ملے تھے۔ پوچھتے تھے بھیرو گدام پر دکان رکھتا ہے کہ نہیں؟ میں نے کہا۔ صاحب مجھے نہیں معلوم۔ تب چلے گئے پر آج کل میں وہ اس کی جانچ کرنے جرور آئیں گے۔ میں نے سوچا کہیں آپ کی بھی سکایت نہ کر دیں۔ اس لیے دوڑا آیا ہوں۔

طاہر علی نے دوسرے ہی روز بھیرو کو وہاں سے بھگا دیا۔

اس کے کئی روز بعد ایک روز رات کے وقت سورداس بیٹھا کھانا پکا رہا تھا کہ جگدھر نے آ کر کہا۔ ''کیوں سورداس تمہاری امانت تو تمہیں مل گئی نا؟''

سورداس نے تجاہل سے کہا۔ ''کیسی امانت؟''

جگدھر: وہی روپے جو تمہاری جھونپڑی سے اٹھ گئے تھے۔

سورداس: میرے پاس روپے کہاں تھے؟

جگدھر: اب مجھ سے نہ اڑو۔ رتی رتی بات جانتا ہوں اور خوس ہوں کہ کسی طرح تمہاری چیج (چیز) اس پاپی کے چنگل سے نکل آئی۔ سو بھاگی اپنی بات کی پکی ہے۔

سورداس: جگدھر! مجھے اس جھمیلے میں نہ گھسیٹو۔ گریب آدمی ہوں۔ بھیرو کے کان میں جرا بھی بھنک پڑ گئی تو میری جان تو پیچھے لے گا۔ پہلے سو بھاگی کا گلا گھونٹ دے گا۔

جگدھر: میں اس سے کہنے تھوڑے ہی جاتا ہوں۔ پر بات ہوئی میرے من کی۔ بچہ نے اتنے دنوں تک حلوائی کی دکان پر کھوب دادے کا پھاتحہ پڑھا۔ دھرتی پر پاؤں ہی نہ رکھتا تھا۔ اب ہوس ٹھکانے آ جائیں گے۔

سورداس: تم ناحق میری جان کے پیچھے پڑے ہو۔

جگدھر: ایک بار کھل کھلا کر ہنس دو تو میں چلا جاؤں۔ اپنی گئی ہوئی چیز پا کر لوگ پھولے نہیں سماتے۔ میں تمہاری جگہ ہوتا تو ناچتا، کودتا، گاتا، بجاتا تھوڑی دیر کے لیے پاگل ہو جاتا۔ اتنا ہنستا اتنا ہنستا کہ پیٹ میں باؤ گولا پڑ جاتا اور تم سونٹھ بنے بیٹھے ہو۔ لو۔ ہنسو تو۔

سورداس: اس بکھت ہنسی نہیں آتی۔

جگدھر: ہنسی کیوں نہ آئے گی۔ میں تو ہنسا دوں گا۔

یہ کہہ کر اس نے سورداس کو گدگدانا شروع کیا۔ سورداس زندہ دل آدمی تھا۔ قہقہے مارنے لگا۔ حاسدانہ خوش طبعی کا عجب نظارہ تھا۔ دونوں تھیٹر کے نقالوں کی طرح ہنس رہے تھے اور یہ خبر نہ تھی کہ ہنسی کا انجام کیا ہوگا۔ شامت کی ماری سوبھاگی اسی وقت بنیے کی دکان سے جنس لیے ہوئے آ رہی تھی۔ سورداس کے گھر میں بڑے زور کے قہقہے کی آواز سنی تو تعجب ہوا کہ اندھے کنوئیں میں پانی کیسا۔ آ کر دروازہ پر کھڑی ہو گئی اور سورداس سے بولی۔ ''آج کیا مل گیا سورداس جو پھولے نہیں سماتے؟''

سورداس نے ہنسی ضبط کر کے کہا۔ ''میری تھیلی مل گئی۔ چور کے گھر میں چھچھور بیٹھا۔''

سوبھاگی: تو سب مال اکیلے ہجم کر جاؤ گے؟

سورداس: نہیں تجھے ایک کنٹھی لا کر دوں گا۔ ٹھاکر جی کا بھجن کرنا۔

سوبھاگی: اپنی کنٹھی دھر رکھو۔ مجھے ایک سونے کا کنٹھا بنوا دینا۔

اس پر تینوں نے قہقہہ مارا۔ اتفاقاً بھیرو بھی اسی وقت تھانہ سے چلا آ رہا تھا۔ قہقہے کی آواز سن کر اس نے جھونپڑی کے اندر جھانکا۔ یہ آج کیسے گل چھرے اڑا رہے ہیں؟ یہ تگڈم دیکھا تو آنکھوں میں خون اتر آیا جیسے کسی نے کلیجہ پر گرم لوہار کھ دیا ہو۔ غصہ سے پاگل ہو گیا۔ سخت سے سخت فحش الفاظ کہے جیسے کوئی سورما اپنی جان

بچانے کے لیے اپنے حربہ کا مہلک ترین استعمال کرے۔ ’’تو بد چلن ہے۔ میرے دشمنوں کے ساتھ ہنستی ہے۔ فاحشہ کہیں کی۔ ٹکے ٹکے پر اپنی آبرو بیچتی ہے۔ کھبر دار جو آج سے میرے گھر میں کدم رکھا۔ خون چوس لوں گا۔ اگر اپنی کسل چاہتی ہے تو اس اندھے سے کہہ دے پھر مجھے اپنی صورت نہ دکھائے نہیں تو اس کی اور تیری گردن ایک ہی گنڈاسے سے کاٹوں گا۔ میں تو ادھر ادھر مارا مارا پھروں اور یہ کل منہی یاروں کے ساتھ نوک جھونک کرے۔ پاپی اندھے کو موت بھی نہیں آتی کہ محلّہ صاف ہو جائے۔ نہ جانے اس کے کرم میں کیا کیا دکھ بھوگنا لکھا ہے۔ شاید جیل میں چکی پیس کر مرے گا۔‘‘

یہ کہتا ہوا وہ چلا گیا۔ سوبھاگی کے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ معلوم ہوا سر پر بجلی گر پڑی۔ جگدھر خوش ہو رہا تھا جیسے کوئی شکاری ہرن کو تڑپتے دیکھ کر خوش ہو۔ کیسا بوکھلا رہا ہے، لیکن سورداس؟ آہ اس کی وہی حالت تھی جو کسی پاکباز عورت کی اپنی عصمت دری کے بعد ہو جاتی ہے۔ تھوڑی دیر تک تینوں ساکت کھڑے رہے۔ بالآخر جگدھر نے کہا۔ ’’سوبھاگی۔ اب تو کہاں جائے گی؟‘‘

سوبھاگی نے اس کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ ’’اپنے گھر جاؤں گی اور کہاں۔‘‘

جگدھر: بگڑا ہوا ہے جان لے کر چھوڑے گا۔

سوبھاگی: چاہے مارے، چاہے جلائے۔ گھر تو میرا وہی ہے۔

جگدھر: کہیں اور کیوں نہیں پڑ رہتی؟ گسا (غصہ) اتر جائے تو چلی جانا۔

سوبھاگی: تمہارے گھر چلتی ہوں۔ رہنے دو گے؟

جگدھر: میرے گھر؟ مجھ سے تو وہ یونہی جلتا ہے پھر تو خون ہی کر ڈالے گا۔

سوبھاگی: تمہیں اپنی جان اتنی پیاری ہے تو دوسرا کون اس سے بیر مول لے گا۔

یہ کہہ کر سوبھاگی فوراً اپنے گھر کی طرف چلی گئی۔ سورداس نے ہاں نہیں کچھ نہ کیا۔

اس کے چلے جانے کے بعد جگدھر بولا۔ ''سورداس تم آج میرے گھر چل کر سو رہو۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ بھیرو رات کو کوئی اپدر نہ مچائے۔ بدماس آدمی ہے۔ اس کا کون ٹھکانا؟ مار پیٹ کرنے لگے۔''

سورداس: بھیرو کو جتنا نادان سمجھتے ہو اتنا وہ نہیں ہے۔ تم سے کچھ نہ بولے گا۔ ہاں سوبھاگی کو جی بھر کے مارے گا۔

جگدھر: نسہ میں اسے اپنی سدھ بدھ نہیں رہتی۔

سورداس: میں کہتا ہوں تم سے کچھ نہ بولے گا۔ تم سے اپنے دل کی کوئی بات نہیں چھپائی ہے۔ تم سے لڑائی کرنے کی اسے ہمت نہ پڑے گی۔

جگدھر کا خوف دور تو نہ ہوا مگر سورداس کی طرف سے ناامید ہو کر چلا گیا۔ سورداس ساری رات جاگتا رہا۔ اس بھاری الزام کے بعد اس کا اب وہاں رہنا شرمناک معلوم ہوتا تھا۔ اب منہ میں کالک لگا کر کہیں نکل جانے کے سوا اسے اور کوئی بات نہ سوجھتی تھی۔ ''میں نے تو کبھی کسی سے برائی نہیں کی۔ بھگوان مجھے کیوں یہ ڈنڈ دے رہے ہیں؟ یہ کن پاپوں کا پرائشچت کرنا پڑ رہا ہے؟ تیرتھ جاترا سے چاہے یہ پاپ اتر جائے۔ کل کہیں چل دینا چاہیے۔ پہلے بھی بھیرو نے مجھ پر یہی پاپ لگایا تھا۔ تب سارے محلّہ کے لوگ مجھے مانتے تھے۔ اس کی یہ بات ہنسی میں اڑ گئی۔ الٹے لوگوں نے اسی کو ڈانٹا۔ اب کی تو سارا محلّہ میرا دشمن ہے۔ لوگ سہج ہی میں بسواس کر لیں گے۔ منہ میں کالک لگ جائے گی۔ نہیں اب یہاں سے بھاگ جانے ہی میں کھیریت ہے۔ دیوتوں کی سرن لوں۔ وہی اب میری رچھا کر سکتے ہیں۔ پر بچاری سبھاگی کا کیا حال ہو گا؟ بھیرو اب کے اسے جرور چھوڑ دے گا۔ ادھر میں بھی چلا جاؤں گا تو بچاری کیسے رہے گی؟ اس کے نیہر میں بھی تو کوئی نہیں ہے۔ جوان عورت ہے۔ محنت مجوری کر نہیں سکتی۔ نہ جانے کیسی پڑے کسی نہ پڑے۔ چل کر ایک بار بھیرو سے اکیلے میں ساری بات صاف صاف کہہ دوں۔ بھیرو سے میری کبھی صفائی

سے بات چیت نہیں ہوئی۔ اس کے من میں کانٹھ پڑی ہوئی ہے۔ من میں میل رہنے ہی سے اس کو میرے اوپر ایسا بھرم ہوتا ہے۔ جب تک اس کا من صاف نہ ہو جائے میرا یہاں سے جانا ٹھیک نہیں۔ لوگ کہیں گے کام کیا تھا تبھی کو ڈر کر بھاگا۔ نہ کرتا تو ڈرتا کیوں۔ یہ روپے بھی اسے پھیر دوں۔ مگر جو اس نے پوچھا کہ کہاں ملے تو؟ سو بھاگی کا نام نہ بتاؤں گا۔ کہہ دوں گا مجھے جھونپڑی میں رکھے ہوئے ملے۔ اتن اچھپائے بنا سو بھاگی کی جان نہ بچے گی۔ لیکن پردہ رکھنے سے صفائی کیسے ہو گی؟ چھپائے کا کام نہیں ہے۔ سب کچھ پورا پورا سچ کہہ دوں گا۔ تبھی اس کا من صاف ہو گا۔''

اس خیال سے اسے گونہ تشفی ہوئی جیسے شاعر کو الجھے ہوئے مضمون کے موزوں ہو جانے سے ہوا کرتی ہے۔ وہ تڑکے ہی اٹھا اور جا کر بھیرو کے دروازہ پر آواز دی۔ بھیرو سویا ہوا تھا پر سو بھاگی بیٹھی رو رہی تھی۔ بھیرو نے اس کے گھر پہنچتے ہی اس کی خوب زدو کوب کی تھی۔ سو بھاگی نے سورداس کی آواز پہچانی۔ چونکی کہ یہ اتنے تڑکے میں کیسے آ گیا۔ کہیں دونوں میں لڑائی نہ ہو جائے۔ سورداس کتنا طاقتور ہے یہ بات اس سے پوشیدہ نہ تھی۔ وہ ڈر گئی کہ سورداس رات کی باتوں کا بدلہ لینے نہ آیا ہو۔ یوں تو بڑا گم کھور ہے، پر آدمی ہی ہے گسا آ گیا ہو گا۔ جھوٹا الجام سن کر گسا آتا ہی ہے۔ کہیں گسے میں آ کر انہیں مار نہ بیٹھے۔ پکڑ پائے گا تو پران ہی لے کے چھوڑے گا۔ سو بھاگی بھیرو کی مار کھاتی تھی۔ گھر سے نکالی جاتی تھی لیکن یہ مجال نہ تھی کہ کوئی باہر کا آدمی بھیرو کو کچھ کہہ کر نکل جائے۔ اس کا منہ نوچ لیتی۔ اس نے بھیرو کو نہ جگایا۔ دروازہ کھول کر پوچھا کیا ہے۔ ''سورداس؟ کیا کہتے ہو؟''

سورداس کا دل بے اختیار چاہا کہ اس سے پوچھوں۔ رات کو تجھ پر کیا بیتی لیکن ضبط کر گیا۔ مجھے اس سے واسطہ؟ اس کی عورت ہے چاہے مارے چاہے رلاوے میں کون ہوتا ہوں پوچھنے والا؟ بولا۔ ''بھیرو کیا ابھی سوتے ہیں۔ جرا جگا دے۔ ان

سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔"

سوبھاگی: کون بات ہے؟ میں بھی سنوں۔

سورداس: ویسی ہی ایک بات ہے۔ جرا جگا تو دے۔

سوبھاگی: اس بکھت جاؤ۔ پھر کبھی آ کر کہہ دینا۔

سورداس: دوسرا کون بکھت آئے گا۔ میں سڑک پر جا بیٹھوں گا۔ انہیں بہت دیر نہ لگے گی۔

سوبھاگی: اور کبھی تو اتنے تڑکے نہ آتے تھے آج ایسی کون سی بات ہے؟

سورداس نے چڑ کر کہا۔ "اس سے کہوں گا تجھ سے کہنے والی بات نہیں ہے۔"

سوبھاگی کو یقین کامل ہو گیا کہ یہ اس وقت آپے میں نہیں ہے۔ ضرور مار پیٹ کرے گا۔ "مجھے مارا پیٹا تھوڑے ہی تھا۔ بس وہیں جو کچھ کہا سنا، وہی کہہ سن کر رہ گئے۔"

سورداس: چل تیرے چلانے کی آواز میں نے اپنے کانوں سنی۔

سوبھاگی: مارنے کو دھمکاتا تھا بس میں زور سے چلانے لگی۔

سورداس: نہ مارا ہو گا۔ مارتا بھی تو مجھے کیا۔ تو اس کی گھر والی ہے جو چاہے کرے۔ تو جا کر اسے بھیج دے۔ مجھے ایک بات کہنی ہے۔

اب بھی سوبھاگی نہ گئی تو سورداس نے بھیرو کا نام لے کر زور زور سے پکارنا شروع کیا۔ کئی ہانکوں کے بعد بھیرو کی آواز سنائی دی۔ "کون ہے؟ بیٹھو آتا ہوں۔"

سوبھاگی یہ سنتے ہی اندر گئی اور بولی۔ "جاتے ہو تو ایک ڈنڈا لیتے جاؤ۔ سورداس ہے۔ کہیں لڑنے نہ آیا ہو۔"

بھیرو: چل بیٹھ۔ لڑائی کرنے آیا ہے۔ مجھ سے تریا چرتر مت کھیل۔

سوبھاگی: مجھے اس کی تیوریاں بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ اسی سے کہتی ہوں۔

بھیرو: یہ کیوں نہیں کہتی کہ تو ہی اسے چڑھا کر لائی ہے۔ وہ تو اتنا کینہ نہیں رکھتا۔ اس کے من میں کبھی میل نہیں رہتا۔

یہ کہہ کر بھیرو نے اپنی لاٹھی اٹھائی اور باہر آیا۔ اندھا شیر بھی ہو تو اس کا کیا خوف۔ اسے تو ایک بچہ بھی مار گرائے گا۔

سورداس نے بھیرو سے کہا۔ ''یہاں اور کوئی تو نہیں ہے۔ مجھے تم سے ایک بھید کی بات کہنی ہے۔''

بھیرو: کوئی نہیں ہے۔ کہو کیا کہتے ہو؟

سورداس: تمہارے چور کا پتہ چل گیا۔

بھیرو: سچ جوانی کی کسم؟

سورداس: ہاں۔ سچ کہتا ہوں۔ وہ میرے پاس آ کر تمہارے روپے رکھ گیا اور تو کوئی چیج نہیں گئی تھی!

بھیرو: مجھے جلانے آئے ہو۔ ابھی من نہیں بھرا؟

سورداس: نہیں بھگوان سے کہتا ہوں۔ تمہاری تھیلی میرے گھر میں جوں کی توں پڑی ملی۔

بھیرو: بڑا پاگل تھا پھر چوری کاہے کو کی تھی؟

سورداس: ہاں۔ پاگل ہی تھا اور کیا؟

بھیرو: کہاں ہے؟ جرا دیکھوں تو۔

سورداس نے تھیلی کمر سے نکال کر بھیرو کو دکھائی۔ بھیرو نے لپک کر تھیلی لے لی۔ وہ جوں کی توں بند تھی۔

سورداس: گن لو۔ پورے ہیں کہ نہیں۔

بھیرو: ہیں! پورے ہیں۔ سچ بتاؤ کس نے چرایا تھا۔

بھیرو کو روپے ملنے کی اتنی خوشی نہ تھی جتنی چور کے نام معلوم کرنے کی خواہش۔ وہ

یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ میں نے جس پر شک کیا تھا وہی ہے یا کوئی اور۔

سورداس: نام جان کر کیا کرو گے۔ تمہیں اپنے مال سے مطلب ہے کہ چور کے نام سے۔

بھیرو: نہیں تمہیں کسم ہے بتا دو۔ ہے تو اسی محلّہ کا نا؟

سورداس: ہاں۔ ہے تو محلّہ ہی کا پر نام نہ بتاؤں گا۔

بھیرو: جوانی کی کسم میں اس سے کچھ نہ کہوں گا۔

سورداس: میں اس سے وعدہ کر چکا ہوں کہ نام نہ بتاؤں گا۔ نام بتا دوں اور تم بھی دنگا کرنے لگو تب؟

بھیرو: بسواس مانو۔ میں کسی سے نہ بولوں گا۔ جو کسم کہو کھا جاؤں اگر جبان (زبان) کھولوں تو سمجھ لینا کہ اس کی اصل میں پھرک (فرق) ہے۔ بات اور باپ ایک ہے۔ اب اور کون کسم لینا چاہتے ہو؟

سورداس: اگر بات سے پھر گئے تو یہیں تمہارے دروا جے پر سر پٹک کر جان دے دوں گا۔

بھیرو: اپنی جان کیوں دو گے؟ میری جان لے لینا۔ چوں تک نہ کروں گا۔

سورداس: میرے گھر میں ایک بار چوری ہوئی تھی تمہیں یاد ہے نا؟ چور کو ایسا سجھا ہوا ہو گا کہ تم نے میرے روپے لیے ہیں۔ اسی سے اس نے تمہارے یہاں چوری کی اور مجھے روپے لا کر دے دیئے۔ بس اس نے میری گریبی پر دیا کی اور کچھ نہیں۔ اس سے میرا اور کوئی ناتا نہیں ہے۔

بھیرو: اچھا۔ یہ سب تو سن چکا نام تو بتاؤ۔

سورداس: دیکھو۔ تم نے کسم کھائی ہے۔

بھیرو: ہاں بھائی کسم سے پھرتا تھوڑے ہی ہوں۔

سورداس: تمہاری گھر والی اور میری بہن سو بھاگی۔

اتنا سننا تھا کہ بھیرو جیسے پاگل ہو گیا۔ گھر میں دوڑا ہوا گیا اور ماں سے بولا۔ ''اماں! اسی ڈائن نے میرے روپے چرائے تھے۔ سورداس اپنے منہ سے کہہ رہا ہے۔ اس طرح میرا گھر موس کر یہ چڑیل اپنے ڈھینگڑوں کا گھر بھرتی ہے۔ اس پر مجھ سے اوڑتی تھی۔ دیکھ تو تیری کیا گت بناتا ہوں۔ بتا سورداس جھوٹ کہتا ہے کہ سچ؟ سوبھاگی نے سر جھکا کر کہا۔ ''سورداس جھوٹ بولتے ہیں۔''

اس کے منہ سے بات پوری نہ نکلنے پائی کہ بھیرو نے لکڑی کھینچ کر ماری۔ وار خالی گیا اس سے بھیرو کا غصہ اور بھی بڑھا۔ وہ سوبھاگی کے پیچھے دوڑا۔ سوبھاگی نے ایک کوٹھڑی میں گھس کر اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ بھیرو نے دروازہ پیٹنا شروع کیا۔ سارے محلّہ میں کہرام مچ گیا کہ بھیرو سوبھاگی کو مارے ڈالتا ہے۔ لوگ دوڑ پڑے۔ ٹھاکر دین نے اندر جا کر دریافت کیا۔ ''کیا ہے بھیرو کیوں کواڑ توڑے ڈالتے ہو؟ بھلے آدمی کوئی گھر کے آدمی پر اتنا گسا کرتا ہے۔''

بھیرو: کیسا گھر کا آدمی جی۔ ایسے گھر کے آدمی کا سر کاٹ لینا چاہیے جو دوسروں سے ہنسی دل لگی کرے۔ آخر میں کانا ہوں، کترا ہوں، لنگڑا ہوں، لولا ہوں مجھ میں کیا عیب ہے جو یہ دوسروں سے ہنسی دل لگی کرتی ہے۔ میں اس کی ناک کاٹ کر تبھی چھوڑوں گا۔ میرے گھر جو چوری ہوئی تھی وہ اسی چڑیل کی کرتوت تھی۔ اسی نے روپے چرا کر سورداس کو دیئے تھے۔

ٹھاکر دین: سورداس کو؟

بھیرو: ہاں ہاں سورداس کو۔ باہر تو کھڑا ہے۔ پوچھتے کیوں نہیں؟ اس نے جب دیکھا کہ اب چوری نہ پچے گی تو لا کر سب روپے مجھے دے گیا ہے۔

بجرنگی: اچھا تو روپے سوبھاگی نے چرائے تھے!

لوگوں نے بھیرو کو ٹھنڈا کیا اور باہر کھینچ لائے۔ یہاں سورداس پر رائے زنی ہونے لگی۔ کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ صاف صاف کہے۔ سب کے سب ڈر رہے تھے کہ

کہیں میم صاحب سے شکایت نہ کر دے۔ مگر کنایتاً سبھی اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔ سورداس کو آج معلوم ہوا کہ پہلے کوئی مجھ سے ڈرتا نہ تھا پر دل میں سب عزت کرتے تھے۔ اب سب کے سب مجھ سے ڈرتے ہیں پر میری سچی عزت کسی کے دل میں نہیں ہے۔ اسے اتنی ندامت تھی کہ وہ چاہتا تھا آسمان سے بجلی گرے اور میں یہیں جل بھن جاؤں۔

ٹھاکردین نے آہستہ سے کہا۔ ''سورداس تو کبھی ایسا نہ تھا۔ آج سے نہیں لڑکپن سے دیکھتے ہیں۔''

نایک رام: پہلے نہیں تھا اب ہو گیا ہے۔ اب تو کسی کو کچھ سمجھتا ہی نہیں۔

ٹھاکردین: کوئی بل پا کر تو سبھی کو گھمنڈ ہو جاتا ہے پر سورداس میں تو مجھے کوئی ایسی بات نہیں دکھائی دی۔

نایک رام: چھپا رستم ہے۔ بجرنگی! مجھے تمہارے اوپر سک تھا۔

بجرنگی: (ہنس کر) پنڈا جی۔ بھوان سے کہتا ہوں کہ مجھے تمہارے اوپر سک تھا۔

بھیرو: اور مجھ سے جو سچ پوچھو تو جگدھر پر سک تھا۔

سورداس سر جھکائے چاروں طرف کے طعنے سن رہا تھا۔ پچھتا رہا تھا کہ میں نے ایسے نیچ آدمی سے یہ بات کہی کیوں۔ میں نے تو سمجھا تھا صاف صاف کہہ دینے سے اس کا دل صاف ہو جائے گا۔ اس کا یہ پھل ملا! میرے منہ میں تو کالکھ لگ ہی گئی۔ اس بچاری کا نہ جانے کیا حال ہو گا۔ بھگوان اب کہاں گئے؟ کیا کتھا پورانوں ہی میں اپنے سیوکوں کو ابارنے آتے تھے؟ اب کیوں نہیں آکاس سے کوئی دوت آ کر کہتا کہ اندھا بے قصور ہے؟

جب بھیرو کے دروازہ پر یہ تماشا ہوتے ہوئے نصف گھنٹہ سے زیادہ ہو گیا تو سورداس کے صبر کا پیالہ چھلک پڑا۔ اب چپ رہنا اس کے خیال میں بزدلی تھی۔ کمینہ پن تھا ایک پاک صاف عورت پر اتنا کلنک تھوپا جا رہا ہے اور میں چپ چاپ

کھڑا کھڑا سنتا ہوں۔ یہ مہاپاپ ہے۔ وہ تن کر کھڑا ہو گیا اور پھٹی ہوئی آنکھیں پھاڑ کر بولا۔ ''یارو! کیوں بپت کے مارے ہوئے دکھیا پر یہ کیچڑ پھینک رہے ہو؟ کچھ تو بھگوان سے ڈرو۔ کیا سنسار میں کہیں نیائے نہیں رہا؟ میں نے تو بھلی منسی کی کہ بھیرو کے روپے اسے لوٹا دیئے۔ اس کا مجھے یہ پھل مل رہا ہے! سوبھاگی نے یہ کام کیوں کیا اور کیوں یہ روپے مجھے دیئے۔ یہ میں نہ بتاؤں گا، لیکن بھگوان میری اس میں بھی جیا درگت کریں اگر میں نے سوبھاگی کو اپنی چھوٹی بہن کے سوا کبھی کچھ سمجھا ہو۔ میرا اپرادھ اتنا ہی ہے کہ وہ رات کو میری جھونپڑی میں آئی تھی۔ اس وقت جگدھر وہاں بیٹھا تھا۔ اس سے پوچھو کہ ہم لوگوں میں کون سی باتیں ہو رہی تھیں۔ اب اس محلّہ میں مجھ جیسے اندھے اپاہج کا نباہ نہیں ہو سکتا۔ جاتا ہوں پر اتنا کہے جاتا ہوں کہ سوبھاگی پر جو کلنک لگائے گا اس کا بھلا نہ ہو گا۔ وہ پاک صاف ہے۔ اسے پاپ لگا کر کوئی سکھ کی نیند نہیں سو سکتا۔ میرا کون رونے والا بیٹھا ہوا ہے۔ جس کے دروازے کھڑا ہو جاؤں گا وہی ایک چٹکی آٹا دے گا۔ اب یہاں سے دانہ پانی اٹھتا ہے پر ایک دن آوے گا جب تم لوگوں کو ساری باتیں معلوم ہو جائیں گے اور تب تم جانو گے کہ اندھا بے کسور تھا۔

یہ کہہ کر سورداس اپنی جھونپڑی کی طرف چلا گیا۔

(24)

سورداس کی زمین واپس دلا دینے کے بعد صوفیہ پھر مسٹر کلارک سے کھنچ گئی۔ دن گزرتے جاتے تھے اور وہ مسٹر کلارک سے دور تر ہوتی جاتی تھی۔ اس کو اب اپنی سچی محبت کے لیے ذلیل و رسوا ہونے کی بہ نسبت مصنوعی محبت کا سوانگ بھرنا کہیں زیادہ ناقابل برداشت معلوم ہوتا تھا۔ سوچتی تھی کہ میں پانی سے بچنے کے لیے آگ میں کود پڑی۔ فطرت پر جبر نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے اپنے دل کو جبراً ونے کی طرف سے ہٹانا چاہا تھا۔ اب وہی دل بڑی تیزی کے ساتھ ان کی طرف دوڑ رہا تھا۔ اس طرف

اس نے بھگتی (زہد) کے متعلق چند کتابیں پڑھی تھیں اور نتیجہ یہ تھا کہ اس کے خیالات میں ایک تغیر ہو گیا تھا۔ ذلت و بدنامی کا خوف اس کے دل سے مٹنے لگا تھا۔ اس کے سامنے محبت کا بلند ترین معیار تھا۔ جہاں خودی کی آواز نہیں پہنچتی۔ زاہد خشک نے بادۂ احمر کا مزہ پا لیا تھا اور نشہ میں اب اس کو دنیاوی عیش و آرام، عزت و فضیلت سب ہیچ معلوم ہوتے تھے۔ جن خیالات سے متاثر ہو کر اس نے ونے سے محترز رہنے اور کلارک سے عقد کرنے کا فیصلہ کیا تھا، وہ اب اس کو سراسر غیر فطری معلوم ہوتے تھے۔ رانی جاہنوی کے ہاتھوں ذلیل ہو کر اپنے نفس کی تنبیہ کے لیے اس نے اپنے اوپر یہ ظلم گوارا کیا تھا۔ مگر اب اس کو یہی نہ معلوم ہوتا تھا کہ میرے اطوار میں خرابی کی کون سی بات تھی۔ اس میں ناموزونیت کیا تھی؟ اس کا دل اب اس فیصلہ کی سخت مخالفت کر رہا تھا۔ وہ خود اس فیصلہ کو قابل نفرت سمجھ رہی تھی۔ اسے تعجب ہوتا تھا کہ میں نے ونے کی جگہ پر کلارک کو لابٹھانے کا فیصلہ کیونکر کیا؟ مسٹر کلارک میں ذاتی اوصاف کی کمی نہیں۔ وہ قابل ہیں۔ شریف ہیں۔ فیاض ہیں۔ نیک دل ہیں۔ وہ کسی ایسی عورت کو خوش خرم رکھ سکتے ہیں جسے دنیاوی عیش و آرام کی تمنا ہو، لیکن ان میں وہ ایثار کہاں۔ وہ خدمت کا جذبہ کہاں۔ وہ زندگی کا اونچا معیار کہاں۔ وہ مردانہ عہد کہاں۔ وہ شوق شہادت کہاں؟ اسے اب محبت کی داستانیں اور صوفیانہ رنگ کی نظمیں، جیو اور آتما، حادث و قدیم، تناسخ اور سخاوت وغیرہ وغیرہ ادق مسائل کی توضیح و تشریح کے مقابلہ میں زیادہ دل کش معلوم ہوتی تھیں۔ اسی درمیان میں اسے کرشن کے سوانحی حالات مطالعہ کرنے کا موقع ملا جس نے اس اعتقاد کی جڑ ہلا دی جو اسے حضرت عیسیٰ پر تھا۔ وہ دل میں دونوں کا موازنہ کرتی۔ مسیح کے رحم کی بہ نسبت اسے کرشن کی محبت سے زیادہ تسکین ہوتی تھی۔ اس نے اب تک گیتا ہی کے کرشن کو دیکھا تھا اور مسیح دیا، خدمت اور پاکیزگی کے سامنے اسے کرشن کی پراسرار زندگی گیتا کی مشکل فلسفیانہ تشریحات سے بھی زیادہ ناقابل فہم معلوم ہوتی تھی۔ اس کا سر گیتا

کے اعلیٰ تخیل کے سامنے جھک جاتا تھا۔ مگر اس سے دل میں بھگتی کا جذبہ نہ پیدا ہوا تھا۔ کرشن کی طفلانہ زندگی کو اس نے عقیدت مندوں کی فرضی بات سمجھ رکھا تھا اور اس پر غور کرنا ہی فضول سمجھتی تھی۔ لیکن اب عیسیٰ کا رحم کرشن کے طفلانہ کھیلوں کے سامنے بالکل خشک سا معلوم ہوتا تھا۔ عیسیٰ کے رحم میں روحانیت تھی۔ کرشن کی محبت میں جذبہ تھا۔ عیسیٰ کا رحم آسمان کی طرح غیر محدود تھا۔ کرشن کی محبت ایک نوشگفتہ باغ کی طرح دلفریب تھی۔ عیسیٰ کا رحم دریا کا نغمۂ شیریں تھا۔ کرشن کی محبت بنسی کی صبر آزما آواز۔ ایک فرشتہ تھا۔ دوسرا انسان۔ ایک زاہد تھا۔ دوسرا شاعر۔ ایک میں بیداری اور دانائی تھی۔ دوسرے میں رنگینی و دیوانگی۔ ایک تاجر تھا، نفع و نقصان پر نگاہ رکھنے والا۔ دوسرا شوقین تھا، اپنے نقد و جنس کو دونوں ہاتھوں سے لٹانے والا۔ ایک محتاط تھا تو دوسرا آلودہ۔ اب صوفیہ کا دل ہمیشہ اسی محبت کے کھیل میں محو رہتا تھا۔ کرشن نے اسے فریفتہ کر لیا تھا۔ اسے اپنی بنسی کی صدا سنا دی تھی۔

مسٹر کلارک کی دلجوئیاں اب اسے مضحکہ انگیز معلوم ہوتی تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ یہ ساری محبت آفرینیاں ایک آزمائش کی تاب بھی نہیں لا سکتیں۔ وہ اکثر ان سے بے اعتنائی برتتی۔ وہ باہر سے مسکراتے ہوئے آ کر اس کی بغل میں کرسی کھینچ کر بیٹھ جاتے اور یہ ان کی طرف آنکھیں اٹھا کر بھی نہ دیکھتی۔ یہاں تک کہ کئی بار اس نے اپنی مذہبی بد اعتقادیوں سے مسٹر کلارک کے مذہبی دل کو سخت صدمہ پہنچایا۔ انہیں صوفیہ ایک معما سی معلوم ہوتی تھی جسے سمجھنے سے وہ قاصر تھے۔ اس کا بے مثال حسن۔ اس کا دلفریب انداز۔ اس کی غیر معمولی ذہانت۔ جتنے زور سے اپنی طرف کھینچتی تھیں اتنا ہی اس کی تمکنت۔ آزاد خیالی اور بے باکی انہیں خائف کر دیتی تھیں۔ اس کے سامنے بیٹھے ہوئے وہ اپنی پستی کو محسوس کرتے تھے اور لحہ بہ لمحہ انہیں معلوم ہوتا تھا کہ میں اس کے قابل نہیں ہوں۔ اسی وجہ سے اتنی بے تکلفی کے باوجود بھی انہیں اس سے شادی کا وعدہ لینے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ مسز سیوک آگ میں

ایندھن ڈالتی رہتی تھیں۔ ایک طرف کلارک کو اکساتیں۔ دوسری طرف صوفی کو سمجھاتیں ”تو سمجھتی ہے کہ زندگی میں ایسے موقعے بار بار آتے ہیں مگر یہ تیری غلطی ہے۔ انسان کو صرف ایک موقع ملتا ہے اور وہی اس کی قسمت کا فیصلہ کر دیتا ہے۔“

مسٹر جان سیوک نے بھی اپنے پدر بزرگوار کے حسب الحکم دورخی چال چلنا شروع کر دی۔ وہ پوشیدہ طور سے تو راجہ مہیندر کمار کی کل گھماتے رہتے مگر ظاہر میں مسٹر کلارک کی خاطر و مدارت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتے۔ رہے مسٹر ایشور سیوک۔ وہ تو سمجھتے تھے کہ خدا نے صوفیہ کو مسٹر کلارک ہی کے لیے بنایا ہے۔ یہ اکثر ان کے یہاں جاتے تھے اور وہیں کھانا بھی کھا لیتے تھے۔ جیسے کوئی دلال گاہک کو دیکھ کر اس کے پیچھے پیچھے ہو لیتا ہے اور اسے کسی دوسری دکان پر بیٹھنے نہیں دیتا ویسے ہی وہ مسٹر کلارک کو گھیرے رہتے تھے کہ کوئی اونچی دکان انہیں متوجہ نہ کرے۔ مگر اتنے خیر خواہوں کے رہتے ہوئے بھی مسٹر کلارک کو اپنی کامیابی مشکل معلوم ہوتی تھی۔

صوفیہ کو ان دنوں بناؤ سنگار کا بڑا شوق ہو گیا تھا۔ اب تک اس نے مانگ چوٹی یا زیور اور لباس کی کبھی پروا نہ کی تھی۔ تن آسانیوں سے دور رہنا چاہتی تھی۔ مذہبی کتب کی یہی تعلیم تھی کہ جسم فانی ہے اور دنیا بے ثبات اور زندگی سراب کی طرح ہے۔ پس اس کے لیے آلائش و زیبائش کی ضرورت نہیں۔ اصلی آرائش کچھ اور ہی ہے۔ اسی پر نگاہ رکھنی چاہیے، لیکن اب وہ زندگی کو اس قدر حقیر نہ سمجھتی تھی۔ اس کے حسن میں کبھی اتنی شان رعنائی نہ تھی۔ وہ بننے ٹھننے کے لیے کبھی اتنی بے قرار نہ تھی۔

شام ہو چکی تھی۔ سورج کی ٹھنڈی کرنیں کسی دیوتا کی دعا کی طرح نانہالان باغ کے دلوں کو شگفتہ کر رہی تھیں۔ صوفیہ ایک کنج میں کھڑی خود بخود مسکرا رہی تھی کہ مسٹر کلارک کی موٹر آ پہنچی۔ وہ صوفیہ کو باغ میں دیکھ کر سیدھے اس کے پاس گئے اور ایک التفات طلب نظر سے دیکھ کر اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ صوفیہ نے منہ پھیر لیا۔

گویا اس نے ان کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو دیکھا نہیں۔

یکا یک ایک لمحہ کے بعد صوفیہ نے تمسخر کے انداز سے پوچھا۔ ”آج کتنے مجرموں کو سزا دی؟“

مسٹر کلارک خفیف ہوئے، رکتے ہوئے ”پیاری یہ تو روز کی باتیں ہیں۔ ان کا کیا چرچا کروں؟“

صوفیہ: تم یہ کیسے تحقیق کرتے ہو کہ فلاں مجرم ہی دراصل مجرم ہے؟ اس کا تمہارے پاس کوئی آلہ ہے؟

کلارک: گواہ تو رہتے ہیں۔

صوفیہ: گواہ ہمیشہ سچے ہوتے ہیں؟

کلارک: ہرگز نہیں۔ گواہ اکثر جھوٹے اور سکھائے ہوئے ہوتے ہیں۔

صوفیہ: اور انہیں گواہوں کے بیان پر فیصلہ کرتے ہو۔

کلارک: اس کے سوا اور چارہ ہی کیا ہے؟

صوفیہ: تمہاری بے چارگی دوسروں کی جان کیوں عذاب میں ڈالے؟ اس لیے کہ تمہارے واسطے موٹر کار، بنگلہ، خانسامے، طرح طرح کی شرابیں اور تفریح کے دیگر سازوسامان مہیا کیے جائیں۔

کلارک نے خفیف آمیز لہجہ میں کہا۔ ”تو کیا ملازمت سے استعفیٰ دے دوں؟“

صوفیہ: جب تم جانتے ہو کہ موجودہ طرز حکومت میں اتنی خامیاں ہیں تو تم اس کا ایک رکن بن کر بے گناہوں کا خون کیوں کرتے ہو؟

کلارک: پیاری میں نے اس بارے میں کبھی غور نہیں کیا۔

صوفیہ: اور بلا غور کیے ہی روز انصاف کا خون کیا کرتے ہو۔ کتنے بے درد ہو!

کلارک: ہم تو صرف ایک مشین کے پرزہ ہیں ہمیں اتنا سوچنے سے کیا مطلب؟

صوفیہ: کیا تمہیں اس کا یقین ہے کہ تم نے کوئی جرم نہیں کیا؟

کلارک: ایسا دعویٰ کوئی انسان نہیں کر سکتا۔

صوفیہ: تو تم اس لیے سزا سے بچے ہوئے ہو کہ تمہارے جرم پوشیدہ ہیں؟

کلارک: ایسا قبول کرنے کو جی تو نہیں چاہتا مگر مجبوراً قبول کرنا ہی پڑے گا۔

صوفیہ: تعجب ہے کہ خود مجرم ہو کر تمہیں دیگر مجرموں کو سزا دیتے ہوئے ذرا بھی شرم نہیں آتی؟

کلارک: صوفیہ! اس کے لیے تم پھر کبھی میری توہین کر لینا۔ اس وقت مجھے ایک خاص معاملہ میں تم سے صلاح لینی ہے۔ خوب سوچ کر رائے دینا۔ راجہ مہیندر کمار نے میرے فیصلہ کی اپیل گورنر کے یہاں کی تھی۔ اس کا ذکر تو میں تم سے کر ہی چکا ہوں۔ اس وقت میں نے سمجھا تھا گورنر اپیل پر توجہ نہ دیں گے۔ ایک حاکم ضلع کے خلاف کسی رئیس کی مدد کرنا ہمارے طرز حکومت کے خلاف ہے کیونکہ اس سے حکومت میں خلل آتا ہے، لیکن چھ سات مہینوں میں واقعات نے کچھ ایسی صورت اختیار کی ہے اور راجہ صاحب نے اپنی خاندانی عزت، مستقل ارادہ اور استدلالی قوت سے ایسی اچھی طرح کام لیا ہے کہ اب گورنر کا فیصلہ شاید میرے خلاف ہوگا۔ کونسل میں ہندوستانیوں کی کثرت ہو جانے کے باعث اب گورنر کی ذاتی رائے کی اہمیت بہت کم ہو گئی۔ اگرچہ وہ کونسل کے فیصلہ کو مسترد کر سکتے ہیں۔ مگر اس اختیار سے وہ خاص حالتوں ہی میں مدد لے سکتے ہیں۔ اگر راجہ صاحب کی اپیل واپس کر دی گئی تو دوسرے روز ملک بھر میں کہرام مچ جائے گا اور اخبارات کو غیر ملکی حکومت کے ایک نئے ظلم پر شور مچانے کا وہ موقع مل جائے گا جسے وہ روز کھوجتے رہتے ہیں۔ اس لیے گورنر نے مجھ سے پوچھا ہے کہ اگر راجہ صاحب کی اشک شوئی کر دی جائے تو تمہیں کچھ ملال تو نہ ہوگا؟ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا کیا جواب دوں۔ ابھی تک کوئی رائے قائم نہیں کر سکا۔

صوفیہ: کیا رائے قائم کرنا اتنا مشکل ہے؟

کلارک: ہاں۔ اس لیے مشکل ہے کہ رائے عامہ سے حکومت کرنے کا جو بندوبست ہم لوگوں نے خود ہی کیا ہے اسے پیروں تلے کچلنا برا معلوم ہوتا ہے۔ بادشاہ کتنا ہی طاقت ور ہو، لیکن انصاف کا پردہ رکھنے کے لیے کبھی کبھی اسے بھی سر جھکانا پڑتا ہے۔ میرے لیے کوئی بات نہیں۔ فیصلہ میرے موافق ہو یا خلاف۔ میرے اوپر اس کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ بلکہ رعایا پر ہمارے انصاف کی دھاک اور بیٹھی جاتی ہے (مسکرا کر) گورنر نے مجھے اس جرم کے لیے سزا بھی دی ہے۔ وہ مجھے یہاں سے ہٹا دینا چاہتے ہیں۔

صوفیہ: کیا تمھیں اتنا دبنا پڑے گا؟

کلارک: ہاں۔ میں ایک ریاست کا پولیٹکل ایجنٹ بنا دیا جاؤں گا۔ یہ عہدہ بڑے مزہ کا ہے۔ راجہ تو صرف نام کے لیے ہوتا ہے۔ پورا اختیار ایجنٹ ہی کو رہتا ہے۔ ہم لوگوں میں جو بڑے خوش نصیب ہیں انھیں کو یہ منصب ملتا ہے۔

صوفیہ: تب تو تم بڑے خوش نصیب ہو۔

مسٹر کلارک اس طنز سے دل ہی میں کڑھ کر رہ گئے۔ انھوں نے سمجھا تھا کہ صوفیہ یہ خبر سن کر پھولی نہ سمائے گی اور جبھی مجھے یہ کہنے کا موقع ملے گا کہ کہاں سے جانے سے پہلے ہمارا عقد ہو جانا ضروری ہے۔ ''تب تو تم بڑے خوش نصیب ہو۔'' اس بے دردانہ طنز نے ان کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اس جملہ میں وہ مغائرت، وہ طنز، وہ بے اعتنائی بھری ہوئی تھی، جو دوستانہ دلجوئی کی بھی پروا نہیں کرتی۔ وہ سوچنے لگے کہ اس کی رائے کا انتظار کیے بغیر ہی میں نے اپنی خواہش کا اظہار کر دیا۔ کہیں یہی بات تو اسے بری نہیں لگی؟ شاید سمجھتی ہو کہ یہ اپنے ذاتی فائدہ سے اتنا خوش ہو رہے ہیں مگر اس بیکس اندھے کی انھیں ذرا بھی پروا نہیں کہ اس پر کیا گزرے گی۔ اگر یہی کرنا تھا تو یہ راگ ہی کیوں چھیڑا تھا۔ یہ سوچ کر وہ بولے۔ ''یہ تمھارے فیصلہ پر منحصر ہے۔''

صوفیہ نے بے تعلقی سے جواب دیا۔ ''ان معاملات میں تم مجھ سے زیادہ ہوشیار ہو۔''

کلارک: اس اندھے کا خیال ہے۔

صوفیہ نے بے رحمی سے کہا۔ ''اس اندھے کے خدا تمھی نہیں ہو۔''

کلارک: میں تم سے صلاح پوچھتا ہوں اور تم مجھی پر چھوڑتی جاتی ہو۔

صوفیہ: اگر میری صلاح سے تمہارا نقصان ہو تو؟

کلارک نے دلیری سے جواب دیا۔ ''صوفیہ میں تمھیں کیسے یقین دلاؤں کہ میں تمہارے لیے سب کچھ کر سکتا ہوں۔''

صوفیہ: (ہنس کر) اس کے لیے میں تمہاری ممنون ہوں۔

اسی اثنا میں مسز سیوک وہاں آ گئیں اور کلارک سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگیں۔ صوفیہ نے دیکھا اب مسٹر کلارک کو بنانے کا موقع نہیں رہا تو اپنے کمرہ میں چلی آئی۔ دیکھا تو پربھو سیوک وہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ صوفیہ نے کہا۔ ''ان حضرت کو اب یہاں سے بوریا بندھنا سنبھالنا پڑے گا۔ ریاست کے ایجنٹ ہوں گے۔''

پربھو سیوک: (چونک کر) کب؟

صوفیہ: بہت جلد راجہ مہیندر کمار انہیں لے بیٹھے۔

پربھو سیوک: تب تو تم بھی یہاں تھوڑے ہی دنوں کی مہمان ہو۔

صوفیہ: میں ان سے شادی نہ کروں گی۔

پربھو سیوک: سچ؟

صوفیہ: ہاں میں کئی دن سے فیصلہ کر چکی ہوں پر تم سے کہنے کا موقع نہیں ملا۔

پربھو سیوک: کیا ڈرتی تھیں کہ کہیں میں شور نہ مچا دوں؟

صوفیہ: بات تو واقعی یہی تھی۔

پربھو سیوک: میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم مجھ پر اس قدر بے اعتباری کیوں کرتی

ہو؟ جہاں تک یاد ہے میں نے تمہاری بات کسی نے نہیں کہی۔

صوفیہ: معاف کرنا پربھو۔ نہ جانے کیوں مجھے تمہارے اوپر اعتبار نہیں ہوتا۔ تم میں ابھی کچھ لڑکپن ہے۔ کچھ ایسے کھلے ہوئے بے فکر آدمی ہو کہ میں تم سے کوئی بات کہتے اسی طرح ڈرتی ہوں جیسے کوئی شخص درخت کی نازک شاخ پر پیر رکھتے ڈرتا ہے۔

پربھوسیوک: اچھی بات ہے۔ یونہی مجھ سے ڈرا کرو۔ واقعی میں کوئی بات سن لیتا ہوں تو میرے پیٹ میں چوہے دوڑنے لگتے ہیں اور جب تک کسی سے کہہ نہ دوں مجھے چین نہیں آتا۔ خیر میں تمہیں اس فیصلہ پر مبارکباد دیتا ہوں۔ میں نے تم سے صاف طور پر تو کبھی نہیں کہا مگر کئی بار کنایتاً کہہ چکا ہوں کہ مجھے کسی حالت میں کلارک کو اپنا بہنوئی بنانا پسند نہیں ہے۔ مجھے جانے کیوں ان سے چڑ ہے۔ وہ بیچارے میری بہت خاطر کرتے ہیں مگر میرا جی ان سے نہیں ملتا۔ ایک بار میں نے ان کو اپنی نظم سنائی تھی۔ اسی دن سے مجھے ان سے چڑ ہوگئی ہے، بیٹھے سونٹھ بنے سنتے رہے۔ انہیں دیکھ کر بس یہی دل میں آتا ہے کہ خوب بناؤں۔ میں نے کتنے ہی لوگوں کو اپنا کلام سنایا ہوگا مگر ونے جیسا سخن شناس کوئی نہ ملا۔ اگر وہ کچھ لکھیں تو خوب لکھیں۔ شعریت گویا ان کی گھٹی میں پڑی ہے۔

صوفیہ: تم ادھر کبھی کنور صاحب کی طرف نہیں گئے تھے؟

پربھوسیوک: آج گیا تھا اور وہیں سے چلا آ رہا ہوں۔ ونے سنگھ بڑی مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔ اودے پور کے حاکموں نے انہیں جیل میں ڈال رکھا ہے۔

صوفیہ کے چہرہ پر غصہ یا رنج کی کوئی علامت نظر نہ آئی۔ اس نے یہ نہ پوچھا کہ کیوں گرفتار ہوئے؟ کیا قصور تھا؟ یہ ساری باتیں ان سے اٹکل سے معلوم کر لیں صرف اتنا پوچھا۔ ''رانی صاحبہ تو وہاں نہیں جا رہی ہیں؟''

پربھوسیوک: نہیں کنور صاحب اور ڈاکٹر گنگولی دونوں جانے کو تیار ہیں مگر رانی کسی

کونہیں جانے دیتیں کہ ونے اپنی مدد آپ کر سکتا ہے۔ اسے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں۔

صوفیہ تھوڑی دیر تک گہری سوچ بچار میں خاموش بیٹھی رہی۔ ونے کی مردانہ صورت اس کی آنکھوں میں پھر رہی تھی۔ یکا یک اس نے سر اٹھایا اور طے شدہ طریقہ پر بولی۔ ''میں اودے پور جاؤں گی۔''

پر بھوسیوک: وہاں جا کر کیا کرو گی؟

صوفیہ: یہ نہیں کہہ سکتی کہ وہاں جا کر کیا کروں گی۔ اگر اور کچھ نہ کر سکوں گی تو کم از کم جیل میں رہ کر ونے کی خدمت تو کر سکوں گی۔ اپنی جان تو ان پر قربان کر دوں گی۔ میں نے ان کے ساتھ جو بے وفائی کی ہے خواہ کسی ارادہ سے کی ہو، وہ ہر وقت میرے دل میں کانٹے کی طرح چبھا کرتی ہے۔ اس سے ان کو جو رنج ہوا ہوگا اس کا خیال آتے ہی میرا دل بے قرار ہو جاتا ہے۔ اب میں اس گناہ کا کفارہ کروں گی۔ کسی اور طریقہ پر نہیں تو اپنی جان دے کر۔

یہ کہہ کر صوفیہ نے کھڑکی سے جھانکا تو مسٹر کلارک ابھی تک کھڑے مسز سیوک سے باتیں کر رہے تھے۔ موٹر بھی کھڑی تھی۔ وہ فوراً باہر آ کر مسٹر کلارک سے بولی۔ ''ولیم آج ماماہی سے باتیں کرنے میں رات ختم کر دو گے؟ میں سیر کرنے کے لیے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔''

لہجہ کتنا شیریں تھا۔ کس دلربایانہ انداز سے کنول جیسی آنکھوں میں دلفریب ہنسی کا کتنا جادو بھر کر یہ محبت آمیز التجا کی گئی تھی۔ کلارک نے معذرت آمیز نگاہوں سے صوفیہ کو دیکھا۔ ''یہ وہی صوفیہ ہے جو ابھی ذرا دیر پہلے میرا مضحکہ اڑا رہی تھی۔'' اسوقت پانی پر آسمان کا تاریک عکس تھا۔ اب اسی پانی پر چاند کی سنہری کرنیں ناچ رہی تھیں۔ اسی لہراتے ہوئے پانی کا کانپتا ہوا ہنستا ہوا اور شوخی سے بھرا جلوہ اس کی آنکھوں میں نمایاں تھا۔ وہ نادم ہو کر بولے۔ ''پیاری معاف کرو۔ مجھے خیال ہی

نہیں رہا۔ باتوں میں دیر ہوگئی۔''

صوفیہ نے ماں کی طرف سادگی سے دیکھتے ہوئے کہا۔''ماما دیکھتی ہو ان کی بے رخی۔ یہ ابھی سے مجھ سے تنگ آ گئے ہیں۔ میری اتنی یاد بھی نہ رہی کہ ایک بار تو رفع شکایت ہی کے لیے پوچھ لیتے، سیر کرنے چلی گی؟''

مسز سیوک: ہاں۔ ولیم! یہ تمہاری زیادتی ہے۔ آج صوفیہ نے تمہیں آلودہ ہاتھوں گرفتار کرلیا۔ میں تمہیں بے خطا سمجھتی تھی اور صرف اسی کو خطاوار۔

کلارک نے کچھ مسکرا کر اپنی خفت مٹائی اور صوفیہ کا ہاتھ پکڑ کر موٹر کی طرف چلے۔ مگر اب بھی انہیں شک تھا کہ میرے ہاتھ میں جو نازک کلائی ہے وہ دراصل کوئی شے ہے یا محض خواب وخیال۔ معما اور بھی پیچیدہ ہوتا ہوا نظر آتا تھا۔ یہ کوئی بندر نچانے والا مداری ہے یا کوئی معصوم بچہ جو بندر کو دور سے دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ اسے مٹھائی دیتا ہے مگر بندر کے نزدیک آتے ہی خوف سے چیخنے لگتا ہے۔

جی موٹر چلی تو صوفیہ نے کہا۔''پولیٹکل ایجنٹ کے اختیارات بہت وسیع ہوتے ہیں وہ چاہے تو ریاست کے اندرونی معاملات میں بھی مداخلت کرسکتا ہے کیوں؟''

کلارک نے خوش ہوکر کہا۔''اس کا اختیار سب جگہ یہاں تک کہ راجہ کے محل کے اندر بھی ہوتا ہے۔ ریاست کا ذکر ہی کیا وہ راجہ کے کھانے سونے آرام کرنے کا وقت تک معین کرسکتا ہے۔ راجہ کس سے ملے، کس سے دور رہے، کس کی عزت کرے، کس کی بےعزتی کرے یہ سب باتیں ایجنٹ کے اختیار میں ہیں۔ وہ یہاں تک طے کرسکتا ہے کہ راجہ کی میز پر کون کون سے کھانے آئیں گے۔ راجہ کے لیے کتنے اور کیسے کپڑوں کی ضرورت ہوگی۔ یہاں تک کہ وہ راجہ کی شادی کے متعلق بھی فیصلہ دے سکتا ہے۔ بس یہی سمجھو کہ وہ ریاست کا خدا ہوتا ہے۔''

صوفیہ: تب تو وہاں سیر تفریح کے لیے بھی کافی موقع ملے گا۔ یہاں کی طرح تمام دن دفتر میں تو نہ بیٹھنا پڑے گا؟

کلارک: وہاں کیسا دفتر۔ ایجنٹ کا کام دفتر میں بیٹھنا نہیں ہے۔ وہ وہاں **ملک** معظم کا قائم مقام ہوتا ہے۔

صوفیہ: اچھا تم جس ریاست میں چاہو جا سکتے ہو؟

کلارک: ہاں۔ صرف پہلے سے کچھ خط و کتابت کرنی پڑے گی۔ تم کون سی ریاست پسند کرو گی؟

صوفیہ: مجھے تو کوہستانی علاقوں سے خاص انس ہے۔ پہاڑوں کے دامن میں بسے گاؤں۔ پہاڑوں کی گود میں چرنے والی بھیڑیں اور پہاڑوں سے گرنے والے آبشار۔ یہ سبھی مناظر مجھے شعریت سے مملو معلوم ہوتے ہیں۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی دوسری ہی دنیا ہے۔ اس سے کہیں زیادہ پرسکون و دلکش کوہستان میرے لیے ایک دل کش خواب ہے۔ پہاڑوں میں کون کون سی ریاستیں ہیں؟

کلارک: بھرت پور، جودھ پور، اودے پور........

صوفیہ: بس تم اودے پور کے لیے لکھو۔ میں نے تاریخ اودے پور کی جوش بھری داستانیں پڑھی ہیں اور جبھی سے مجھے اس علاقہ کے دیکھنے کا شوق ہے۔ وہاں راجپوت کتنے بہادر، کتنے آزادی پسند، کتنے آن پر جان دینے والے ہوتے ہیں۔ لکھا ہے کہ چتوڑ میں جتنے شہید ہوئے ان کے زناروں کا وزن پچھتر من تھا۔ کئی ہزار راجپوتنیاں ایک ساتھ چتا میں جل کر خاک ہو گئیں۔ ایسی بات پر مٹ جانے والی ہستیاں دنیا میں شاید ہی اور کہیں ہوں۔

کلارک: ہاں یہ واقعات میں نے بھی تاریخ میں دیکھے ہیں۔ ایسی جانباز قوم کی جتنی عزت کی جائے کم ہے۔ اسی لیے تو اودے پور کا راجہ ہندو راجاؤں میں افضل ترین سمجھا جاتا ہے۔ ان کی بہادری کی داستانیں بہت کچھ مبالغہ آمیز ہیں۔ پھر بھی یہ ماننا ہی پڑے گا کہ اس **ملک** میں ایسی جانباز دوسری قوم نہیں۔

صوفیہ: تم آج ہی اودے پور کے لیے لکھو اور ممکن ہو تو ہم لوگ ایک ماہ کے اندر

وہاں کو روانہ ہو جائیں۔

کلارک: لیکن..... کہتے ہوئے خوف معلوم ہوتا ہے...... تم میرا مطلب سمجھ گئی ہو گی...... یہاں سے چلنے کے قبل میں تم سے وہ دیرینہ..... میری زندگی.....

صوفیہ نے مسکرا کر کہا۔ ''میں سمجھ گئی۔ اسے ظاہر کرنے کی تکلیف نہ اٹھاؤ۔ اتنی کوتاہ فہم نہیں ہوں، لیکن میری قوت فیصلہ نہایت سست ہے۔ یہاں تک کہ سیر کرنے کے لیے جانے کا فیصلہ بھی میں گھنٹوں تک سوچنے کے بعد ہی کر سکتی ہوں۔ ایسے اہم معاملہ میں جس کا تعلق عمر بھر رہے گا۔ میں اتنی جلد کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی بلکہ صاف بات تو یہ ہے کہ میں ہنوز یہی فیصلہ نہیں کر سکی کہ مجھ جیسی بے فکر اور آزاد خیال عورت متاہلانہ زندگی کے قابل بھی ہے یا نہیں۔ ولیم میں تم سے دل کی بات کہتی ہوں۔ خانہ داری کی زندگی سے مجھے خوف معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے تم جب تک میرے مزاج سے بخوبی واقف نہ ہو جاؤ۔ میں تمہارے دل میں جھوٹی امیدیں پیدا کر کے تمہیں مغالطہ میں نہیں رکھنا چاہتی۔ ابھی میری اور تمہاری ملاقات صرف ایک سال سے ہے۔ اب تک میں تمہارے لیے ایک سربستہ راز ہوں۔ کیوں ہے یا نہیں؟''

کلارک: ہاں صوفیہ واقعی تمہیں بخوبی نہیں پہچان پایا ہوں۔

صوفیہ: پھر ایسی حالات میں تمہی سوچو کہ ہم دونوں کا رشتۂ عقد میں بندھ جانا کتنی بڑی نادانی ہے۔ میرے دل کی جو پوچھو تو مجھے ایک نیک دل، شریف، خوش فہم اور خوش اخلاق شخص کے ساتھ دوست بن کر رہنا اس کی بیوی بن کر رہنے کے مقابلہ میں کم پر لطف نہیں معلوم ہوتا۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ اس کا مجھے علم نہیں، لیکن میں زن و شوہر کے تعلق کو دو دلوں کے ملاپ کی بہترین صورت نہیں خیال کرتی۔ میں باہمی رہائش و ہمدردی کو نفس پرستی والے تعلقات سے بدرجہا بہتر سمجھتی ہوں۔

کلارک: مگر جماعتی اور مذہبی رسم و رواج ایسے تعلقات کو.......

صوفیہ: ہاں ایسے تعلقات فطرت کے منافی ہوتے ہیں اور معمولاً ناقابل عمل۔

میں بھی اسے ہمیشہ کے لیے اپنی زندگی کا اصول بنانے کو تیار نہیں ہوں، لیکن جب تک ہم ایک دوسرے کے سامنے آئینہ نہ بن جائیں، اس وقت تک میں اسی قسم کے تعلقات کو ضروری خیال کرتی ہوں۔

کلارک: میں تمہاری مرضی کا غلام ہوں۔ صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ تمہارے بغیر میری زندگی وہ مکان ہے جس میں مکین نہیں۔ وہ چراغ ہے جس میں روشنی نہیں۔ وہ شعر ہے جس میں تاثیر نہیں۔

صوفیہ: بس بس یہ عاشقانہ گفتگو صرف عشقیہ کتب کے لیے زینت بخش ہے۔ یہ لو پانڈے پور آ گئے۔ اندھیرا ہو رہا ہے۔ سورداس چلا گیا ہوگا۔ یہ حال سنے گا تو اس غریب کا دل ٹوٹ جائے گا۔

کلارک: اس کی پرورش کا کوئی اور بندوبست کر دوں؟

صوفیہ: اس زمین سے اس کی پرورش نہیں ہوتی تھی۔ صرف محلّہ کے مویشی چرا کرتے تھے۔ وہ غریب ہے۔ بھکاری ہے پر لالچی نہیں۔ مجھے تو وہ کوئی ولی اللہ معلوم ہوتا ہے۔

کلارک: اندھے ذہین اور خدا ترس ہوتے ہیں۔

صوفیہ: مجھے اس سے خاص عقیدت ہو گئی ہے۔ یہ دیکھو پاپا نے کام شروع کر دیا۔ اگر انہوں نے راجہ کی پیٹھ نہ ٹھونکی ہوتی تو انہیں تمہارے سامنے آنے کی کبھی جرأت نہ ہوتی۔

کلارک: تمہارے پاپا نہایت چالاک ہوشیار ہیں۔ ایسے لوگ دنیا میں کامیاب ہوتے ہیں۔ کم از کم میں یہ دو رخی چال نہیں چل سکتا۔

صوفیہ: دیکھ لینا دو ہی چار برسوں کے اندر اس محلّہ میں کارخانہ کے مزدوروں کے مکانات ہوں گے۔ یہاں کا ایک آدمی بھی نہ رہنے پائے گا۔

کلارک: پہلے تو اس اندھے نے بڑا شور و غل مچایا تھا۔ دیکھیں اب کیا ہو سکتا ہے۔

صوفیہ: مجھے تو یقین ہے کہ وہ خاموش نہ بیٹھے گا۔ خواہ اس زمین کے ساتھ ہی ان کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔

کلارک: نہیں صوفیہ ایسا ہرگز نہ ہونے پائے گا۔ جس روز یہ نوبت آئے گی سب سے پہلے سورداس کے لیے میری زبان سے ''جے'' کی آواز نکلے گی اور سب سے پہلے میرے ہاتھ اس پر پھول برسائیں گے۔

صوفیہ نے کلارک کو آج پہلی بار ہی عزت و محبت کی نظر سے دیکھا۔

(25)

سال بھر تک راجہ مہیندر کمار اور مسٹر کلارک میں متواتر جنگ ہوتی رہی۔ کاغذ کا تختہ میدان کارزار تھا اور صف بستہ سورماؤں کے بجائے سورماؤں سے کہیں زیادہ طاقت ور دلیلیں۔ منوں سیاہی بہہ گئی۔ کتنے ہی قلم کام آئے۔ دلیلیں کٹ کٹ کر راون کی فوج کی طرح پھر زندہ ہو جاتی تھیں۔ راجہ صاحب بار بار ہمت ہار جاتے۔ سرکار سے مقابلہ کرنا چیونٹی کا ہاتھی سے مقابلہ کرنا ہے لیکن مسٹر جان سیوک اور ان سے بھی زیادہ اندو انہیں ڈھارس دیتی رہتی تھیں۔ شہر کے رئیسوں نے ہمت سے کم اور خودغرضانہ دانشمندی سے زیادہ کام لیا۔ اس عرض داشت پر جسے ڈاکٹر گنگولی نے باشندگان شہر کی جانب سے گورنر کی خدمت میں بھیجنے کے لیے لکھا تھا۔ دستخط کرنے کے وقت زیادہ تر لوگ بیمار ہو گئے اور اس قدر بیمار ہو گئے کہ ہاتھ میں قلم پکڑنے کی بھی طاقت نہ رہی۔ کوئی تیرتھ جاترا کرنے چلا گیا۔ کوئی کسی نہایت ضروری کام سے کہیں باہر روانہ ہو گیا۔ جو گنے گنائے لوگ کوئی بہانہ نہ کر سکے، وہ بھی دستخط کرنے کے بعد مسٹر کلارک سے معافی مانگ آئے۔ ''حضور نہ جانے اس میں کیا کیا لکھا تھا۔ ہمارے سامنے تو صرف سادہ کاغز آیا تھا۔ ہم سے یہی کہا گیا کہ یہ پانی کا محصول گھٹانے کی درخواست ہے۔ اگر ہم کو معلوم ہوتا کہ اس سادہ کاغذ پر بعد کو حضور کی شکایت لکھی جائے تو ہم بھول کر بھی قلم نہ اٹھاتے۔''

ہاں جن بڑے لوگوں نے سگریٹ کمپنی کے حصے لیے تھے انہیں مجبور ہو کر دستخط کرنا ہی پڑے۔ اگرچہ دستخط کرنے والوں کی تعداد زیادہ نہ تھی مگر ڈاکٹر گنگولی کو کونسل میں سرکار سے سوال کرنے کا ایک حیلہ مل گیا۔ انہوں نے بڑے حوصلہ اور استقلال کے ساتھ سوالوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ کونسل میں ڈاکٹر صاحب کا خاص احترام ہوتا تھا۔ کتنے ہی ممبروں نے ان سوالات کی تائید کی۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر گنگولی کی ایک تجویز پر کثرت رائے کی وجہ سے سرکار کو ہار ماننی پڑی۔ اس تجویز سے لوگوں کو بڑی بڑی امیدیں تھیں، لیکن جب اس کا بھی کچھ اثر نہ ہوا تو جگہ جگہ سرکار پر بد اعتقادی ظاہر کرنے کے لیے جلسے ہونے لگے۔ رئیسوں اور زمینداروں کی تو خوف کے سبب زبان بند تھی لیکن درمیانی طبقہ کے لوگوں نے کھلے الفاظ اس زبردستی کی مخالفت کرنا شروع کی۔ کنور بھرت سنگھ ان کے سرغنہ بنے اور وہ صاف صاف کہنے لگے کہ اب ہمیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہیے۔ ہماری نجات اپنے ہی ہاتھوں ہو گی۔ مہیندر کمار بھی در پردہ اس جماعت کا دل بڑھانے لگے۔ ڈاکٹر گنگولی کے بہت کچھ تشفی دینے پر بھی حکام پر سے ان کا اعتبار اٹھ گیا۔ مایوسی ضعف سے پیدا ہوتی ہے مگر وہ خود قوت کو پیدا کرتی ہے۔

رات کے نو بج گئے تھے۔ ونے سنگھ کی گرفتاری وقید کی خبر پا کر کنور صاحب نے اپنے احباب کو اس مسئلہ پر غور کرنے کے لیے مدعو کیا تھا۔ ڈاکٹر گنگولی، جان سیوک، پربھو سیوک، راجہ مہیندر کمار اور دیگر اصحاب آئے ہوئے تھے۔ اندو بھی راجہ صاحب کے ہمراہ آئی تھی اور اپنی والدہ سے باتیں کر رہی تھی۔ کنور صاحب نے نایک رام کو بلا کر بھیجا تھا اور وہ کمرہ کے دروازہ پر بیٹھا ہوا تمباکو مل رہا تھا۔

مہیندر کمار بولے۔ ”ریاستوں پر سرکار کا بڑا دباؤ ہے۔ وہ بالکل بے دست و پا ہیں اور سرکار کے اشاروں پر چلنے کے لیے مجبور۔“

بھرت سنگھ نے کہا۔ ”جس سے کسی کا فائدہ نہ ہو اور جس کا وجود مضرت رسانی پر مبنی

ہو۔اس کا نام ونشان جتنا ہی جلد مٹ جائے اتنا ہی اچھا۔غیر ملکی لوگوں کے ہاتھوں میں ظلم وتشدد کا آلہ بن کر زندہ رہنے کی بہ نسبت تو مر جانا ہی بہتر ہے۔‘‘

ڈاکٹر گنگولی: وہاں کا حاکم لوگ کھود (خود) کھراب ہے۔ڈرتا ہے، ریاست میں اچھے اورنڈر تا کے کھیال (خیال) پھیلیں گے تو ہم رعایا کو کیسے لوٹے گا۔راجہ لوگ مسند لگا کر بیٹھا رہتا ہے اور اس کا نوکر چاکر من مانا راج کرتا ہے۔

جان سیوک نے غیر جانبدارانہ طریق سے کہا۔’’سرکار کسی ریاست کو ظلم کرنے کے لیے مجبور نہیں کرتی۔ہاں چونکہ وہ کمزور ہیں اور اپنی حفاظت آپ نہیں کر سکتیں اس لیے ایسے کاموں کے کرنے پر ضرورت سے بھی زیادہ تیار ہو جاتی ہیں۔جس کو وہ سمجھتے ہیں کہ سرکار بہادر خوش ہوگی۔‘‘

بھرت سنگھ: ونے سنگھ کتنا سلیم، کتنا متواضع، کتنا خلیق ہے۔یہ آپ لوگوں سے مخفی نہیں۔میں اسے باور ہی نہیں کر سکتا کہ اس کی ذات سے کسی کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔

پربھوسیوک کنور صاحب کے منہ لگے ہوئے تھے۔اب تک جان سیوک کے خوف سے نہ بولے تھے۔پر اب نہ رہا گیا۔بولے۔’’کیوں، کیا پولیس سے چوروں کو نقصان نہیں پہنچتا؟ کیا سادھوؤں سے بدکاروں کو نقصان نہیں پہنچتا؟ اور پھر گائے جیسی بے زبان ومفید مخلوق کا خون بہانے والے لوگ دنیا میں نہیں ہیں؟ ونے نے مظلوم کسانوں کی خدمت کرنی چاہی تھی۔اسی خدمت کا انہیں یہ صلہ ملا ہے۔رعایا کے صبر و برداشت کی بھی کوئی حد ہونی چاہیے اور ہوتی بھی ہے۔اس سے متجاوز ہو کر قانون قانون ہی نہیں رہ جاتا۔اس وقت اس قانون کی خلاف ورزی کرنا ہی ہر سمجھ دار آدمی کا فرض ہو جاتا ہے۔اگر آج سرکار حکم دے کہ سب لوگ منہ میں کالک لگا کر نکلیں تو اس حکم کو نہ ماننا ہمارا فرض ہو جائے گا۔اودے پور کے دربار کو کوئی یہ اختیار نہیں کہ وہ کسی شخص کو ریاست سے نکل جانے پر مجبور کرے۔‘‘

ڈاکٹر گنگولی: اودے پور کا دربار ایسا حکم دے سکتا ہے۔اس کا اکھتیار ہے۔

پربھوسیوک: میں اسے تسلیم نہیں کرتا۔ جس حکم کی بنیاد محض حیوانی طاقت پر ہو، اس کی تعمیل ضروری نہیں ۔ اگر اودے پور میں کوئی ذمہ دار سرکار ہوتی اور وہ کثرت رائے سے ایسا حکم نافذ کرتی تو دوسری بات تھی مگر جب کہ رعایا کی جانب سے اس قسم کا کوئی مطالبہ نہیں کیا گیا بلکہ وہ خود و نے سنگھ کو جان سے زیادہ عزیز سمجھتی ہے تو محض حکام کی جبر پسندی ہمیں ان کے حکم کی تعمیل کے لیے مجبور نہیں کر سکتی۔

راجہ صاحب نے ادھر ادھر خوف زدہ نگاہوں سے دیکھا کہ یہاں کوئی میرا دشمن تو نہیں بیٹھا ہوا ہے۔ جان سیوک بھی تیوریاں بدلنے لگے۔

ڈاکٹر گنگولی: ہم دربار سے لڑ تو نہیں سکتا۔

پربھوسیوک: رعایا کو اپنے حقوق کی حفاظت پر آمادہ تو کر سکتے ہیں۔

بھرت سنگھ: اس کا نتیجہ بغاوت کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ اور بغاوت کو فرو کرنے کے لیے دربار گورنمنٹ سے مدد لے گا۔ مفت ہزاروں بیکسوں کا خون ہو جائے گا۔

پربھوسیوک: جب تک ہم خون سے ڈرتے رہیں گے، ہمارے حقوق بھی ہمارے پاس آنے سے ڈرتے رہیں گے۔ ان کی حفاظت بھی تو خون ہی سے ہوگی۔ میدان سیاست میدان جنگ سے کم خطرناک نہیں ہے۔ اس میں اتر کر خون سے ڈرنا محض بزدلی ہے۔

جان سیوک سے اب ضبط نہ ہو سکا بولے۔ ''تم جیسے پرجوش نوجوانوں کو ایسے پیچیدہ سیاسی معاملات پر کچھ کہنے سے پہلے اپنے الفاظ کو خوب تول لینا چاہیے۔ یہ موقع تدبر اور دور اندیشی سے کام لینے کا ہے۔''

پربھوسیوک نے کچھ نہ کہا۔ وہ اپنے دل میں کہہ رہا تھا۔ تدبر بزدلی کا مترادف ہے۔

ڈاکٹر گنگولی: میری رائے میں گورنمنٹ آف انڈیا کی خدمت میں ایک ڈیپوٹیشن جانا چاہیے۔

بھرت سنگھ: گورنمنٹ کہہ دے گی ہمیں دربار کے اندرونی معاملات میں دخل دینے کا کوئی اختیار نہیں۔

مہیندر رمار: دربار ہی کو کیوں نہ ڈیپوٹیشن بھیجا جائے؟

جان سیوک: ہاں یہ میری بھی صلاح ہے۔ ریاست کے خلاف شورش کرنا ریاست کو کمزور بنا دیتا ہے اور رعایا کو سرکش۔ ریاست کا اقتدار ہر ایک حالت میں قائم رہنے دینا ضروری ہے ورنہ اس کا انجام وہی ہوگا جو آج جمہوریت و مساوات کے عالم گیر نظارہ سے ظاہر ہو رہا ہے۔ دنیا نے تین صدیوں تک جمہوریت کی آزمائش کی اور بالآخر اس سے ناامید ہوگئی۔ ہماری بڑی خوش نصیبی ہے کہ اس آگ کی لپٹ ابھی تک اس ملک میں نہیں پہنچی اور ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ ہم آئندہ بھی اس سے محفوظ رہیں۔

کنور بھرت سنگھ جمہوریت کے ایک گونہ معتقد تھے۔ اپنے اصول کی تردید ہوتے دیکھ کر بولے۔ ''پھوس کا جھونپڑا بنا کر آپ آگ کی لپٹ سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ بہت ممکن ہے کہ لپٹ کے باہر سے نہ آنے پر بھی گھر ہی کی ایک چنگاری اڑ کر اس پر گر پڑے۔ آپ جھونپڑا رکھیے ہی کیوں؟ جمہوریت حکومت کا بلند ترین معیار نہ سہی مگر دنیا ابھی تک اس سے بہتر طرز حکومت نہیں بتلا سکتی۔ خیر جب یہ طے ہوگیا کہ ہم دربار پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتے تو بجز صبر اور کیا چارہ ہے۔ میں سیاسی حالات میں الگ رہنا چاہتا ہوں کیونکہ اس سے کوئی نفع نہیں۔ آزادی کی قیمت خون ہے۔ جب ہم میں اس کے دینے کی طاقت ہی نہیں تو ہم بے فائدہ کمر کیوں باندھیں۔ پینترے کیوں بدلیں۔ خم کیوں ٹھونکیں؟ سب سے الگ تھلگ رہنے میں بھلائی ہے۔''

پربھوسیوک: یہ تو بہت مشکل ہے کہ آنکھوں سے اپنا گھر لٹتے دیکھیں اور زبان نہ کھولیں۔

بھرت سنگھ: ہاں بہت مشکل ہے۔ مگر اپنے نفس پر قابو رکھنا ہوگا۔ اس کی یہی تدبیر ہے کہ ہم کلہاڑی کا دستہ نہ بنیں۔ دستہ کلہاڑی کی مدد نہ کرے تو کلہاڑی سخت اور تیز ہونے پر بھی ہمیں سخت نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ یہ ہمارے لیے بڑے شرم کی بات ہے کہ ہم علم، ثروت یا دولت کے زعم میں حکومت کا دایاں ہاتھ بن کر رعایا کا گلا کاٹیں اور اس بات پر فخر کریں کہ ہم بھی حاکم ہیں۔

جان سیوک: تعلیم یافتہ طبقہ ہمیشہ سے حکومت کے سہارے رہا ہے اور رہے گا۔ حکومت سے منحرف ہوکر وہ اپنی ہستی کو نہیں مٹا سکتا۔

بھرت سنگھ: یہی تو سب سے بڑی مصیبت ہے۔ تعلیم یافتہ طبقہ جب تک حکومت سے وابستہ رہے گا۔ ہم اپنے معیار کے قریب ذرا بھی نہ پہنچ سکیں گے۔ اس کو اپنے لیے چھوڑے، بہت دنوں کے لیے کوئی دوسرا سہارا کھوجنا پڑے گا۔

راجہ مہیندر کمار بغلیں جھانک رہے تھے کہ یہاں سے کھسک جانے کا کوئی موقع مل جائے۔ اس قضیہ کو تمام کرنے کے ارادہ سے بولے۔ ''تو آپ لوگوں نے کیا تجویز کیا۔ دربار کو وفد روانہ کیا جائے گا؟''

ڈاکٹر گنگولی: ہم کھود (خود) جا کر ونے کو چھوڑ لائے گا۔

بھرت سنگھ: اگر قصاب ہی سے جان بخشی کی بھیک مانگنا ہے۔ تو پھر خاموش ہی رہنا بہتر ہے۔ کم از کم بات تو بنی رہے گی۔

ڈاکٹر گنگولی: پھر وہی Pessimism (دائی یاس) کا بات۔ ہم ونے کو سمجھا کر اسے یہاں آنے پر راضی کرے گا۔

رانی جانہوی نے ادھر آتے ہوئے اس جملہ کے آخری الفاظ سن لیے۔ تمکنت آمیز لہجہ میں بولیں۔ ''نہیں ڈاکٹر گنگولی۔ آپ ونے پر اتنی مہربانی نہ کیجیے۔ یہ اس کی پہلی آزمائش ہے۔ اس میں اسے مدد دینا اس کے مستقبل کو تباہ کرنا ہے۔ وہ انصاف پر قائم ہے۔ اسے کسی سے دبنے کی ضرورت نہیں۔ اگر اس نے جان کے

خوف سے اس ناانصافی کے سامنے سرتسلیم خم کر دیا تو سب سے پہلے میں ہی اس کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکا لگا دوں گی۔"

رانی کے جوش بھرے الفاظ نے حاضرین کو متحیر کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی دیوی آسمان سے یہ پیغام سنانے کے لیے اتر آئی ہے۔

ایک منٹ کے بعد کنور بھرت سنگھ نے رانی کے الفاظ کا مطلب بتلایا۔ "میرے رائے میں ابھی و نے سنگھ کو اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے۔ یہ اس کی آزمائش ہے۔ انسان بڑے سے بڑا کام جو کر سکتا ہے، وہ یہی ہے کہ اپنے ضمیر کی آزادی کے لیے مر مٹے۔ یہی انسانی زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد ہے۔ ایسے ہی امتحانوں میں کامیاب ہو کر ہمیں وہ درجہ حاصل ہوتا ہے کہ ہم پر قوم اعتبار کر سکے۔"

ڈاکٹر گنگولی: رانی ہمارا دیوی ہے۔ ہم ان کے سامنے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ پر دیوی لوگوں کا بات دنیا والوں کے بیوہار کرنے جوگ (قابل) نہیں ہو سکتا۔ ہم کو پورا امید ہے کہ ہمارا سرکار ضرور بولے گا۔

رانی: سرکار کی انصاف پسندی کی ایک مثال تو آپ کے سامنے ہی ہے اگر اب بھی آپ کو اس پر اعتبار ہو تو میں یہی کہوں گی کہ آپ کو کچھ دنوں تک کوئی دوا استعمال کرنی پڑے گی۔

ڈاکٹر گنگولی: دو چار دن میں یہ بات معلوم ہو جائے گا۔ سرکار کو بھی تو اپنی نیک نامی بدنامی کا ڈر ہے۔

مہیندر کمار بہت دیر کے بعد بولے۔ "راہ دیکھتے دیکھتے تو آنکھیں پتھرا گئیں۔ ہماری امید اتنی سخت جان نہیں ہے۔"

دفعتاً ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ کنور صاحب نے پوچھا......... "کون صاحب ہیں؟"

ٹیلیفون سے۔ "میں ہوں پران ناتھ۔ مسٹر کلارک کا تبادلہ ہو گیا۔"

کنور صاحب نے پوچھا....... "کہاں کو؟"

ٹیلی فون سے جواب ملا۔ ''پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ میں جا رہے ہیں۔ گریڈ کم کر دیا گیا ہے۔''

ڈاکٹر گنگولی: اب بولیے میرا بات سچ ہوا کہ نہیں۔ آپ لوگ کہتا تھا، گورنمنٹ کا نیت بگڑا ہوا ہے۔ پر ہم کہتا تھا کہ اس کو ہمارا بات ماننا پڑے گا۔

مہیندر رکمار: اجی پران ناتھ مسخرا ہے۔ آپ سے دل لگی کر رہا ہو گا۔

بھرت سنگھ: نہیں۔ اس نے تو مجھ سے کبھی دل لگی نہیں کی۔

رانی: سرکار نے اتنی اخلاقی جرأت سے شاید پہلی بار کام لیا ہے۔

ڈاکٹر گنگولی: اب وہ جمانا (زمانہ) نہیں ہے جب گورنمنٹ پبلک اوپنین (رائے عامہ) کا انسلٹ (توہین) کر سکتا تھا۔ اب کونسل کا بات اس کو ماننا پڑے گا۔

بھرت سنگھ: زمانہ تو وہی ہے اور گورنمنٹ کے طرز عمل میں بھی کوئی نمایاں تبدیلی نہیں واقع ہوئی۔ اس میں ضرور کوئی نہ کوئی سیاسی راز ہے۔

جان سیوک: ایوان تجارت نے میری تجویز کو منظور کر کے گورنمنٹ کے چھکے چھڑا دیئے۔

مہیندر رکمار: میرا ڈیپوٹیشن بڑے موقع سے پہنچا تھا۔

ڈاکٹر گنگولی: میں نے کونسل کو ایسا بالکل ہی ایک کر دیا تھا کہ ہم کو اتنا بڑا میجارٹی کبھی نہ ملا۔

اندو، رانی کے پیچھے کھڑی تھی۔ بولی۔ ''عرضداشت پر میری ہی کوشش سے اتنے آدمیوں کے نام درج ہوئے تھے۔ مجھے تو یقین ہے کہ یہ اسی کی کرامات ہے۔''

نایک رام اب تک چپ چاپ بیٹھے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہاں کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ ٹیلی فون کی بات ان کی سمجھ میں آئی۔ اب انہیں معلوم ہوا کہ لوگ کامیابی کا سہرا اپنے اپنے سر باندھنے کی فکر میں ہیں۔ ایسے موقع پر بھلا وہ کب

چوکنے والے تھے۔ بولے۔ ''سرکار یہاں بھی گاپھل بیٹھنے والے نہیں ہیں۔ سول سارجنٹ کے کان میں یہ بات ڈال دی تھی کہ راجہ صاحب کی طرف سے پورا ایک ہجار (ہزار) لٹھیت جوان تیار بیٹھا ہوا ہے۔ ان کا حکم بحال نہ ہوا تو کھون کھرابا (خون خرابہ) ہو جائے گا۔ سہر میں طوپھان آ جائے گا۔ انہوں نے لاٹ صاحب سے یہ بات جرور ہی کہی ہوگی۔''

مہیندر رصاحب: میں تو سمجھتا ہوں۔ یہ تمہاری دھمکیوں کی ہی برکت ہے۔

نایک رام: دھرما وتار۔ دھمکیاں کیسی۔ کھون کی ندی بہہ جاتی۔ آپ کا ایسا اکبال ہے کہ چاہوں تو ایک بار سہر لٹوا دوں۔ یہ لال صاپھے رکھے رہ جائیں۔

پربھو سیوک تمسخر سے کہا۔ ''سچ پوچھئے تو یہ اس نظم کا نتیجہ ہے جو میں نے ''ہندوستان ریویو'' میں چھپائی تھی۔''

رانی: پربھو! تم نے یہ چپت اچھی لگائی۔ ڈاکٹر گنگولی اپنا سر سہلا رہے ہیں۔ کیوں ڈاکٹر پڑی یا نہیں؟ ایک ایسی حقیر کامیابی پر آپ لوگ جامہ میں پھولے نہیں سماتے۔ اسے فتح نہ سمجھئے۔ یہ دراصل شکست ہے جو آپ کو منزل مقصود سے کوسوں دور ہٹا دیتی ہے۔ آپ کے گلے میں پھندے کو اور بھی مضبوط کر دیتی ہے۔ باجے والے سردی میں باجے کو آگ سے سینکتے ہیں۔ صرف اس لیے کہ اس میں سے اچھی آواز نکلے۔ آپ لوگ بھی سینکے جا رہے ہیں۔ اب ضربوں کے لیے پیٹھ مضبوط کر لیجیے۔

یہ کہتی ہوئی رانی جاہنوی اندر چلی گئیں۔ مگر ان کے جاتے ہی انکی تنبیہ کا اثر بھی جاتا رہا۔ لوگ پھر وہی راگ الاپنے لگے۔

مہیندر رکمار: کلارک صاحب بھی کیا یاد کریں گے کہ کس سے پالا پڑا تھا۔

ڈاکٹر گنگولی: اب اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ یہ لوگ کتنا انصاپھ کرتا ہے۔

جان سیوک: اب ذرا اس اندھے کی بھی خبر لینی چاہیے۔

نایک رام: صاحب۔ اسے ہار جیت کا کوئی کھیال نہیں ہے۔ اس جمین کی دس گنی

بھی ملجائے تو بھی وہ اسی طرح رہے گا۔

جان سیوک: میں کل ہی سے مل میں کام لگا دوں گا۔ ذرا مسٹر کلارک کو بھی دیکھ لوں۔

مہیندر رکمار کے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے کہ اندو کو بھی یہ خوش خبری سناؤں۔ یوں تو وہ نہایت متین آدمی تھے مگر اس فتح نے ایک طفلانہ جوش مسرت پیدا کر دیا تھا۔ نشہ کا سا عالم تھا۔ رانی کے چلے جانے کے ذرا دیر بعد وہ خوش خوش ہنستے ہوئے نادانستہ طور پر اکڑتے ہوئے غرور سے سر اٹھائے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ اندو رانی کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ کھڑی ہو کر بولی۔ ''آخر صاحب بہادر کو بوریا بندھنا سنبھالنا پڑا نا۔''

اندو: اب کل میں ان لیڈی صاحبہ کی ذرا مزاج پرسی کروں گی جو زمین پر قدم نہ رکھتی تھیں۔ اپنے سامنے کسی کو کچھ سمجھتی نہ تھیں۔ بلا کر دعوت کروں؟

مہیندر رکمار: کبھی نہ آئے گی اور ضرورت ہی کیا ہے؟

اندو: ضرورت کیوں نہیں ہے جھینپے گی تو۔ سر تو نیچا ہو جائے گا۔ نہ آئے گی نہ ہی۔ اماں آپ نے تو دیکھا ہے صوفیہ پہلے کتنی غریب اور ملن سار تھی، لیکن کلارک سے شادی کی بات چیت ہوتے ہی دماغ عرش معلیٰ پر چڑھ گیا۔

رانی نے متانت سے کہا۔ ''بیٹی۔ یہ تمہارا وہم ہے۔ صوفیہ مسٹر کلارک سے کبھی شادی نہ کرے گی۔ اگر میں انسان کو کچھ پہچان سکتی ہوں تو دیکھ لینا۔ میری بات صحیح ہوتی ہے یا نہیں۔''

اندو: اماں۔ کلارک سے اس کی منگنی ہو گئی ہے۔ ممکن ہے درپردہ شادی بھی ہو گئی ہو۔ دیکھتی نہیں ہو۔ دونوں کیسے گھلے ملے رہتے ہیں؟

رانی: کتنے ہی گھلے ملے رہیں۔ مگر ان کی شادی نہ ہوئی ہے اور نہ ہو گی۔ میں اپنی تنگ نظر کے سبب صوفیہ کو کتنی ہی سبک سمجھوں۔ مگر واقعی وہ ایک وفا شعار عورت

ہے۔اس میں ذرا بھی شک نہیں۔اسے خفیف کر کے تم پچھتاؤ گی۔

اندو:اگر وہ اتنی نیک ہے تو وہ آپ کے بلانے پر ضرور ہی آئے گی۔

رانی:ہاں مجھے یقین کامل ہے۔

اندو:تو بلا لیجیے۔مجھے دعوت کا انتظام کیوں کرنا پڑے۔

رانی:تم یہاں بلا کر اسے خفیف کرنا چاہتی ہو۔میں تم سے اپنے دل کی بات کہتی ہوں کہ اگر وہ عیسائن نہ ہوتی تو آج کے پانچویں برس میں اس سے ونے کی شادی کرتی اور اسے اپنی خوش نصیبی سمجھتی۔

اندو کو یہ باتیں پسند نہ آئیں۔وہ اٹھ کر اپنے کمرہ میں چلی گئی۔ذرا دیر میں مہیندر کمار بھی وہاں پہنچ گئے اور دونوں بڑھ بڑھ کر باتیں کرنے لگے۔کوئی لڑکا کھیل میں جیت کر بھی اتنا بدمست نہ ہوتا ہو گا۔

ادھر دیوان خانہ میں بھی مجلس برخاست ہو گئی اور لوگ اپنے اپنے گھر گئے۔جب تخلیہ ہو گیا تو کنور صاحب نے نایک رام کو بلا کر کہا۔"پنڈا جی۔میں تم سے ایک کام لینا چاہتا ہوں۔کرو گے؟"

نایک رام:سرکار حکم ہو تو سر دینے کو حاضر ہیں۔ایسی کوئی بات ہے بھلا!

کنور:دیکھو دنیا داری نہ کرو۔میں جو کام لینا چاہتا ہوں وہ سہل نہیں ہے۔زیادہ وقت،زیادہ عقل،زیادہ طاقت خرچ کرنی پڑے گی۔جان کا بھی خطرہ ہے۔اگر دل اتنا مضبوط ہو ہاں کرو ورنہ صاف صاف جواب دے دو۔میں کوئی جاتری نہیں ہوں جس پر تمہیں اپنی دھاک بٹھانا ضروری ہو۔میں تمہیں جانتا ہوں تم مجھے جانتے ہو۔اس لیے صاف گفتگو ہونی چاہیے۔

نایک رام:سرکار آپ سے دنیا داری کر کے بھگوان کو کیا منہ دکھاؤں گا۔آپ کا نمک تو روئیں روئیں میں پیوست ہو رہا ہے۔اگر میرے بس کی بات ہو گی تو پوری کروں گا چاہے جان ہی کیوں نہ جائے۔آپ کے حکم کی دیر ہے۔

کنور: ونے کو چھڑا کر لا سکتے ہو؟

نا یک رام: سرکار اگر جان دے کر بھی لا سکوں گا تو کوتاہی نہ کروں گا۔

کنور: تم جانتے ہو میں نے تم سے یہ سوال کیوں کیا ہے؟ میرے یہاں سینکڑوں آدمی ہیں۔ خود ڈاکٹر گنگولی جانے کو تیار ہیں۔ مہیندر کو بھیجوں تو وہ بھی چلے جائیں گے، لیکن ان لوگوں کے سامنے میں اپنی بات نہیں بگاڑنا چاہتا۔ سر پر یہ الزام لینا نہیں چاہتا کہ کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ۔ دھرم سنکٹ میں پڑا ہوا ہوں پر بیٹے کی محبت نہیں مانتی۔ ہوں تو انسان ہی۔ کاٹھ کا کلیجہ تو نہیں ہے۔ کیسے صبر کروں؟ اسے بڑے بڑے ارمانوں سے پالا ہے۔ وہی ایک زندگی کا سہارا ہے۔ تم اسے کسی طرح اپنے ساتھ لاؤ۔ اودے پور کے عملے دیوتا نہیں ہیں۔ انہیں لالچ دے کر جیل میں جا سکتے ہو۔ ونے سے مل سکتے ہو اور عملوں کی مدد سے انہیں باہر بھی لا سکتے ہو۔ اتنا کرنا تو کچھ مشکل نہیں ہے۔ مشکل ہے ونے کو آنے پر راضی کرنا۔ اسے تمہاری عقل و ہوشیاری پر چھوڑتا ہوں۔ اگر تم میری دردناک حالت سے انہیں بخوبی واقف کر سکو گے تو مجھے یقین ہے کہ وہ چلے آئیں گے۔ بولو کر سکتے ہو یہ کام؟ اس کا محنتانہ ایک بڈھے باپ کی دعا کے علاوہ اور جو کچھ تم چاہو گے وہ پیش کیا جائے گا۔

نا یک رام: مہاراج کل چلا جاؤں گا۔ بھگوان نے چاہا تو ان کو ساتھ لاؤں گا نہیں تو منہ نہ دکھاؤں گا۔

کنور: نہیں پنڈا جی! جب انہیں معلوم ہو جائے گا کہ میں کتنا پریشان ہوں تو وہ چلے آئیں گے۔ وہ اپنے باپ کی جان کو اپنے اصول پر قربان نہ کریں گے۔ ان کے لیے میں نے اپنی زندگی کی کایا پلٹ کر دی ہے۔ یہ فقیروں کا بھیس ہے۔ کیا وہ میرے لیے اتنا بھی نہ کریں گے۔ پنڈا جی سوچو! جس آدمی نے ہمیشہ مخملی بستروں پر آرام کیا ہو اسے اس کاٹھ کے تخت پر آرام مل سکتا ہے؟ ونے کی محبت ہی وہ جادو ہے جس کے بس میں ہو کر میں یہ کٹھن تپسیا کر رہا ہوں۔ جب ونے نے تیاگ

(ترک) کا برت لے لیا (عہد کرلیا) تو پھر میں کس منہ سے اس بڑھاپے کی عمر میں عیش و آرام کی زندگی بسر کرتا۔ یہ سب کانٹے رانی جانہوی کے بوئے ہوئے ہیں۔ اس کے آگے میری کچھ نہیں چلتی۔ میرا سرگ (بہشت) اسی کے کارن نرک (دوزخ) بن رہا ہے۔ اسی کے کارن میرا پیارا و نے میرے ہی ہاتھوں سے نکلا جاتا ہے۔ ایسا ہونہار بیٹا کھو کر یہ دنیا میرے لیے نرک ہو جائے گی۔ تم کل جاؤ گے؟ منیم سے جتنے روپے چاہو لے لو۔

نایک رام: آپ کے اکبال سے کسی بات کی کمی نہیں ہے۔ آپ کی دیا چاہیے۔ آپ نے اتنے پرتاپی (اقبال مند) ہو کر جو تیاگ کیا ہے وہ کوئی دوسرا کرتا تو آنکھیں نکل پڑتیں۔ سب کچھ چھوڑ دینا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے۔ یہاں تو گھر میں بھونی بھانگ نہیں۔ جاتریوں کی سیوا ٹہل نہ کریں تو بھوجن کا ٹھکانا بھی نہ ہو پر بوٹی (بھنگ) کی ایسی چاٹ پڑ گئی ہے کہ ایک دن نہ ملے تو دیوانہ ہو جاتا ہوں۔ کوئی آپ کی طرح کیا کھا کر تیاگ کرے گا۔

کنور: یہ تو مانی ہوئی بات ہے کہ تم گئے تو ونے کو لے کر ہی لوٹو گے۔ اب یہ بتاؤ کہ میں تمہیں کیا وچھنا (رخصتانہ) دوں؟ تمہاری سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟

نایک رام: سرکار کی دیا بنی رہے۔ میرے لیے یہ کچھ کم نہیں ہے۔

کنور: تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم میرا کام نہیں کرنا چاہتے۔

نایک رام: سرکار ایسی بات نہ کہیں۔ آپ مجھے پالتے ہیں۔ آپ کا حکم نہ مانوں گا تو بھگوان کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ اور پھر آپ کا کام کیسا۔ یہ تو اپنا ہی کام ہے۔

کنور: نہیں بھئی۔ میں تمہیں مفت میں اتنی تکلیف نہیں دینا چاہتا۔ یہ سب سے بڑا سلوک ہے جو تم میرے ساتھ کر رہے ہو۔ میں بھی تمہارے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہتا ہوں جسے تم سب سے بڑا سمجھتے ہو۔ تمہارے کتنے لڑکے ہیں؟

نایک رام نے سر جھکا کر کہا۔ ''دھرماتما اوتار۔ ابھی تو بیاہ ہی نہیں ہوا۔''

کنور: ارے یہ کیا بات ہے؟ آدھی عمر گزر گئی اور ابھی بن بیاہے بیٹھے ہو!

نایک رام: سرکار۔ تکدیر (تقدیر) کے سوا اور کیا کہوں۔

ان الفاظ میں اتنی رقت انگیز مایوسی بھری ہوئی تھی کہ کنور صاحب پر نایک رام کی دیرینہ اور دلی خواہش روشن ہوگئی۔ بولے۔ "تو تم گھر میں اکیلے ہی رہتے ہو؟"

نایک رام: ہاں دھرما وتار بھوت کی طرح اکیلا ہی پڑا رہتا ہوں۔ آپ کے اکبال سے دوہرے درجے کا گھر ہے۔ باگ بگیچے ہیں۔ گائیں بھینسیں ہیں۔ پر رہنے والا کوئی نہیں۔ بھوگنے والا کوئی نہیں۔ ہماری برادری میں انہی کا بیاہ ہوتا ہے جو بڑے بھاگوان ہوتے ہیں۔

کنور: (مسکرا کر) تو تمہارا بیاہ کہیں ٹھہرا دوں؟

نایک رام: سرکار۔ ایسی تکدیر کہاں؟

کنور: تقدیر میں بنا دوں گا۔ مگر یہ قید تو نہیں ہے کہ کنیا بہت اونچے کل (خاندان) کی ہو؟

نایک رام: سرکار۔ کنیاؤں کے لیے اونچا نیچا کل نہیں دیکھا جاتا۔ کنیا اور گئو تو پاک ہیں۔ براہمن کے گھر میں آ کر اور بھی پاک ہو جاتے ہیں۔ پھر جس نے دان لیا اس نے دنیا بھر کا پاپ ہجم کیا تو پھر عورت کی کیا بات ہے۔ جس کا بیاہ نہیں ہوا۔ اس کی جندگانی دو کوڑی کی ہے۔

کنور: اچھی بات ہے۔ ایشور نے چاہا تو لوٹتے ہی دولہا بنو گے۔ تم نے پہلے کبھی اس کی چرچا ہی نہیں کی۔

نایک رام: سرکار۔ یہ بات آپ سے کیا کہتا۔ اپنے میل جول والوں کے سوا اور کسی سے نہیں کہی۔ کہتے لاج آتی ہے۔ جو سنے گا وہ سمجھے گا کہ اس میں کوئی نہ کوئی عیب ضرور ہے۔ کئی بار لباریوں کی باتوں میں آ کر سینکڑوں روپے گنوائے۔ اب کسی سے نہیں کہتا۔ بھگوان کے آسرے بیٹھا ہوں۔

کنور: تو کس گاڑی سے جاؤ گے۔

نا یک رام: بجور۔ ڈاک گاڑی سے چلا جاؤں گا۔

کنور: ایشور کرے۔ جلد لوٹو۔ میری آنکھیں تمہاری طرف لگی رہیں گی۔ یہ لو خرچ کے لیے لیتے جاؤ۔

یہ کہتے ہوئے کنور صاحب نے اپنے محاسب کو بلا کر اس کے کان میں کچھ کہا۔ اس نے نا یک رام کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور اپنی گدی پر بیٹھ کر بولا..... ''بولو۔ کتنا ہمارا اور کتنا تمہارا۔''

نا یک رام: کیا یہ بھی کوئی وچھنا ہے۔

محاسب: رقم تو تمہارے ہاتھ آتی ہے۔

نا یک رام: میرے ہاتھ نہیں آ رہی ہے۔ ونے سنگھ کے پاس بھیجی جا رہی ہے۔ بچہ مصیبت میں بھی مالک سے نمک حرامی کرتے ہو۔ ان پر تو مصیبت پڑی ہے اور تمہیں اپنا گھر بھرنے کی دھن ہے۔ تم جیسے لالچیوں کو تو ایسی جگہ مارے جہاں پانی نہ ملے۔

محاسب نے شرمندہ ہو کر نوٹوں کا ایک پلندہ نا یک رام کو دے دیا۔ نا یک رام نے نوٹوں کو گن کر کمر میں باندھا اور محاسب سے کہا۔ ''میری کچھ وچھنا دلاتے ہو۔''

محاسب: کیسی وچھنا؟

نا یک رام: نکد روپیوں کی نوکری پیاری ہے کہ نہیں؟ جانتے ہو نا کہ یہاں سے نکال دیئے جاؤ گے تو کہیں بھیک نہ ملے گی۔ اگر بھلا چاہتے ہو تو پچاس روپیوں کی گڈی بائیں ہاتھ سے ادھر بڑھا دو نہیں تو جا کر کنور صاحب سے سب جڑے دیتا ہوں۔ کھڑے کھڑے نکال دیئے جاؤ گے۔ جانتے ہو کہ نہیں رانی جی کو؟ نکالے بھی جاؤ گے اور گردن بھی ناپی جائے گی۔ ایسی بے بھاؤ کی پڑیں گی کہ چندیا گنجی ہو جائے گی۔

محاسب: گرو۔ اب یاروں ہی سے یہ گیدڑ بھبکی! اتنے روپے مل گئے۔ کون کنور ونے سنگھ رسید لکھے دیتے ہیں۔

نایک رام: روپے لاتے ہو کہ نہیں۔ بولو چٹ پٹ؟

محاسب: گرو۔ تم تو..........

نایک رام: روپے لاتے ہو کہ نہیں؟ یہاں باتوں کی فرصت نہیں ہے۔ جھٹ پٹ سوچو۔ میں چلا۔ یاد رکھو کہیں بھیک بھی نہ ملے گی۔

محاسب: تو یہاں میرے پاس روپے کہاں ہیں؟ یہ تو سرکاری رقم ہے۔

نایک رام: اچھا تو عندالطلب (رقعہ) لکھ دو۔

محاسب: گرو۔ ذرا ادھر دیکھو۔ غریب آدمی ہوں۔

نایک رام: تم گریب ہو بچا۔ حرام کی کوڑی کھا کر موٹے پڑ گئے ہو۔ اس پر گریب بنتے ہو۔ لکھو چٹ پٹ۔ کنور صاحب جرا بھی مروت نہ کریں گے۔ یونہی مجھے اتنے روپے دلا دیئے ہیں۔ بس میرے کہنے بھر کی دیر ہے۔ گھن کا مکدما چل جائے گا۔ بیٹا سمجھے؟ لاؤ باپ کی پوجا۔ تم کرو جیسے گھاگ روج تھوڑے ہی پھنستے ہیں۔

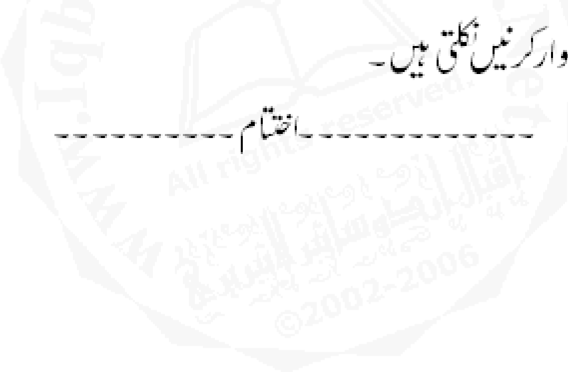
محاسب نے نایک رام کی تیوریوں سے بھانپ لیا کہ اب یہ وچھنا لیے بغیر نہ چھوڑے گا۔ چپکے سے پچیس روپے نکال کر ان کے ہاتھ دے دیئے اور بولا۔ ''پنڈت۔ اب دیا کرو۔ زیادہ نہ ستاؤ۔''

نایک رام نے روپے مٹھی میں کیے اور بولے۔ ''لو بچہ۔ اب کسی کو نہ ستانا۔ میں تمہاری ٹوہ میں رہوں گا۔''

نایک رام چلے گئے تو محاسب نے دل میں کہا... ''لے جاؤ۔ سمجھ لیں گے کہ خیرات کیا۔''

کنور بھرت سنگھ اس وقت دیوان خانہ کے دروازہ پر کھڑے تھے۔ آج ہوا کے ٹھنڈے جھونکوں میں لطف نہ تھا۔ آسمان پر چمکتے ہوئے ستارے طنزیہ نگاہوں کی

طرح دل میں کھٹکتے تھے۔ سامنے درختوں کے کنج میں سے ونے سنگھ کی خیالی صورت، تاریک و دردناک آواز کی طرح لرزاں اور دھوئیں کی طرح پریشان، یوں نکلتی ہوئی معلوم ہوئی جیسے کسی دکھ بھرے دل سے آہ کی صدا نکلتی ہے۔ کنور صاحب کئی منٹ تک کھڑے روتے رہے۔ ونے کے لیے ان کے دل سے اس طرح دعائیں نکل رہی تھیں جیسے علی الصبح گوشۂ افق سے طلوع ہوتے ہوتے آفتاب کی ہلکی ٹھنڈی اور خوشگوار کرنیں نکلتی ہیں۔



----------اختتام----------